اسلامی کتب خانے

از

الحاج محمد زبیر

سابق اسسٹنٹ لائبریرین و استاد لائبریری سائنس
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی

اسلامی کتب خانے

ان کتب خانوں کا تاریخی جائزہ جو مسلمانوں نے
اسلام کے ابتدائی دور سے عہدِ حاضر تک
مختلف ممالک میں قائم کیے

از

الحاج محمد زبیر

سابق اسسٹنٹ لائبریرین و استاد لائبریری سائنس
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ناشر

ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی

اکتوبر ۱۹۷۸ء (مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی) قیمت ۳۶ روپے

اِنتساب

اپنی رفیقۂ حیات زاہدہ خاتون کے نام

جن کی

پُرخلوص رفاقت میں میری زندگی کا

بڑا حصّہ گذرا ہے۔

فہرستِ مضامین

باب اول
اسلامی کتب خانوں کا قیام اور نظام

بابِ دوم

ممالکِ اسلامیہ کے کتب خانے

باب سوم

غیر منقسم ہندوستان کے مسلم عہد میں کتب خانوں کا قیام اور نظام

باب چہارم

عہدِ سلاطینِ دہلی اور شاہانِ مغلیہ میں کتب خانوں کی تشکیل و ترقی

(۱۲۰۶ء - ۱۸۵۷ء)

دکنی سلطنتیں اور کتب خانے

چند دیگر علاقوں کے کتب خانے

باب پنجم

برّصغیر پاک وہند کے کتب خانے

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

زیر نظر کتاب کے مصنف الحاج محمد زبیر صاحب ہندو پاک کی وہ محترم شخصیت ہیں جن کی عمر کا بہت بڑا حصہ کتب خانوں کے سدھارنے، انھیں ترقی دینے اور فنِ کتاب داری کی درس و تدریس میں بسر ہوا ہے درحقیقت کتب خانوں کو فروغ دینا ان کی زندگی کا نصب العین رہا ہے۔ ان کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں۔

”جبتک کتب خانہ مسلم یونیورسٹی (سابق لٹن لائبریری حال مولانا آزاد لائبریری) باقی ہے زبیر صاحب کا نام بھی باقی رہے گا۔ کتب خانہ ہی کی خدمت میں وہ جوان سے بوڑھے ہوئے اور اس کی خدمت کا حق بڑے خلوص سے ادا کیا مختلف عہدوں پر رہے اور ایسا کام کیا کہ بڑوں بڑوں نے سراہا“

زبیر صاحب ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۴ء تک مسلم یونیورسٹی سے منسلک رہے مختلف حیثیتوں میں لائبریری کی خدمات انجام دیں، قائم مقام لائبریرین بھی رہے لائبریری سائنس کی کلاسوں کو تعلیم دی۔ متعدد علوم و فنون کی چالیس ہزار سے زائد کتابیں کیٹلاگ کیں۔ اور یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کلاسوں کے اجرا اور فروغ میں لائبریرین کے دست راست رہے

زبیر صاحب نے ۱۹۶۴ء میں کراچی آجانے کے بعد کچھ عرصہ کراچی یونیورسٹی لائبریری اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی لائبریری میں کام کیا وہ پانچ برس نیشنل کالج میں بھی لائبریرین رہے ان فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کی تعلیم و تدریس سے بھی اپنا تعلق قائم رکھا ایک عرصہ تک کراچی لائبریری ایسوسی ایشن کی جاری کردہ ایوننگ کلاسوں کو اعزازی طور پر پڑھایا اور اب عمر کے اس آخری دور میں بھی ”پی۔ بی۔ ڈبلو۔ جی۔ کراچی“ کے ادارے ”اسکول آف لائبریرین شپ“ کی ایوننگ کلاسوں کو اعزازی طور پر تعلیم دے رہے ہیں اس طرح انھیں کتب خانوں اور فن کتاب داری کی خدمت کرتے ہوئے ۵۵ برس گذر چکے ہیں اس خدمت کی بہترین یادگار ان کے وہ سینکڑوں شاگرد ہیں جو ہندو پاک کے کتب خانوں میں مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تصنیف و تالیف | زبیر صاحب کا سب سے بڑا وصف کتابوں سے گہرا لگاؤ ہے اسی جذبۂ صادق

سے سرشار ہوکر انھوں نے اپنے فرائض منصبی اور دیگر گوناگوں مشاغل کے ہجوم میں بھی بہت سے مضامین تحریر کر دیے اور چھوٹی بڑی گیارہ کتابیں لکھ ڈالیں جنھیں اصحابِ علم وفن مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر رنگاناتھن۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ پروفیسر سید بشیر الدین، ڈاکٹر انیس خورشید نے بے حد پسند کیا اور اپنی قیمتی آراء کو قلمبند فرمایا۔ "اسلامی کتب خانوں کی سیر" پر تبصرہ کرتے ہوئے دریابادی صاحب نے یہ تحریر فرمایا "حاجی محمد زبیر صاحب اسسٹنٹ لائبریرین محض اپنے عہدہ اور منصب کے لحاظ سے نہیں ہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ذوق نظر کے لحاظ سے بھی لائبریرین ہی ہو گئے ہیں۔" اسی کتاب کے بارے میں مولانا شبیر احمد خاں غوری (رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش ہندوستان) لکھتے ہیں "اللہ حاجی محمد زبیر صاحب کو جزائے خیر دے جس طرح انھوں نے اسلافِ کرام کی کاوشوں کو زندہ کیا باری تعالیٰ ان کا نام بھی زندہ رکھے کتاب بہت عمدہ اور پر از معلومات ہے۔ اور یہ محض رسمی تعریف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک حریف فنکار کا تبصرہ ہے جو خود اس موضوع پر لکھ چکا ہے" اسلامی کتب خانے کے پہلے ایڈیشن کے متعلق صحیفہ لاہور (اپریل ۱۹۶۲ء) میں ہے "الحاج محمد زبیر صاحب کی یہ کتاب اپنی نوع کی پہلی تصنیف ہے جو منظر عام پر ظہور پذیر ہوئی اس میں تواریخی حقائق اور روایات کی مدد سے اسلامی ممالک کے قدیم کتب خانوں کے حالات مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے اسلام کے درخشاں ماضی کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا ہے، مصنف نے بڑی محنت سے تمام اسلامی ممالک کے کتب خانوں کے مالکوں اور سرپرستوں کے حالات کو یکجا کیا ہے۔ اسلامی کتب خانے ہماری ثقافتی روایات کا ایک زندہ مرقع ہے۔"

محترم زبیر صاحب کے والہانہ ذوق کی ایک زندہ مثال زیر نظر کتاب ہے جو کہنے کو تو اسلامی کتب خانے کا دوسرا ایڈیشن ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک نئی تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں اس کا حجم اور سائز بھی بڑا ہے ترمیموں اور اضافوں کے علاوہ متعدد نئے مضامین بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں پہلے ایڈیشن کے بارے میں مقتدر اربابِ علم و فن اور وقیع رسائل و جرائد نے جن اعلیٰ تاثرات کا اظہار کیا ہے اسکی روشنی میں پہلے ایڈیشن کے ترقی یافتہ ایڈیشن کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۷۸ء
ادب منزل پاکستان چوک۔ کراچی

محمد ذکی عفی عنہ
ایم اے (علیگ)

دیباچہ طبع دوم

میری حوصلہ افزائی کے لئے یہ کافی ہے کہ زیرِ نظر کتاب کے پہلے ایڈیشن کو ممتاز اصحاب علم وفن نے پسند کیا اور لائبریری سائنس کے فاضل اساتذہ نے بھی اس کی اتنی قدر فرمائی کہ کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس کے نصاب میں اسے شامل کر لیا گیا۔

اس کا طبع دوم بہت سے اضافوں اور ترمیمات کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے پہلے ایڈیشن کا دائرہ قرونِ وسطیٰ کے کتب خانوں تک تھا مگر یہ دوسرا ایڈیشن اس دور کو عبور کر کے دورِ حاضر میں داخل ہو گیا ہے اس میں کچھ ایسے کتب خانوں کا بھی تعارف کرا دیا گیا ہے جو گوشۂ گمنامی میں تھے مضامین کے علاوہ سائز اور حجم میں بھی اضافہ ہوا ہے ایک مخصوص باب بھی شامل کر دیا گیا ہے جس میں سندھ اور دیگر پاکستانی علاقوں کے کتب خانوں اور وہاں کی علمی وتعلیمی سرگرمیوں کی جھلکیاں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے لے کر حالیہ عہد تک دکھائی گئی ہیں ہندوستان کے کچھ ایسے کتب خانے بھی اس میں آگئے ہیں جو پہلے ایڈیشن میں نہیں تھے۔

جن اصحاب نے زیرِ نظر کتاب کے پہلے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہے وہ خاکسار کے اس خیال سے غالباً اتفاق کریں گے کہ طبع دوم نے نئی تصنیف کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

اس کتاب کی تیاری میں دو سو سے زائد کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا گیا ہے اکثر کے حوالے حواشی میں دے دئے ہیں غرض ہزار ہا صفحات پر بکھری ہوئی معلومات کا ایک ایک ذرہ چن کر کتب خانوں کا یہ مرقع تیار کیا گیا ہے لیکن اس پراگندہ اور منتشر مواد کو صرف یکجا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے نئے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ چودہ سو برس کے اسلامی کتب خانوں کی واضح صورت علمی دنیا کے سامنے آجائے اور یہ خشک موضوع

عام قارئین کے لئے دلچسپ اور جاذبِ نظر بھی بن جائے۔

بہر حال اس کتاب کی تالیف و تدوین میں حتی الوسع پوری تحقیق و تلاش سے کام لیا گیا ہے اس کے باوجود اگر کہیں کوئی خامی یا سُقم نظر آئے تو اسے انسانی کوشش پر محمول کیا جائے۔ جس میں سہو کا امکان اور اضافے کی گنجائش ہے نوجوان دانشوروں اور محققین سے میری یہ توقعات ہیں کہ وہ اس موضوع پر مزید کام کریں گے میں تو اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ شاید مجھے اس کا تیسرا ایڈیشن پیش کرنے کی نوبت نہ آسکے گی۔

اب مجھے ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی بدولت کتب خانوں سے استفادہ کی سہولتیں فراہم ہو گئی تھیں آج سے سولہ سال پیشتر "اسلامی کتب خانے" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا اس زمانہ میں مجھے مسلم یونیورسٹی لائبریری سے منسلک ہونے کی وجہ سے کتابیں حاصل کرنے کی بڑی آسانیاں میسر تھیں لیکن اس کتاب کے طبع دوم کے لئے یہاں کتابوں کی فراہمی میں بڑی دشواریاں پیش آئیں کراچی میں سواریوں کے حصول کی دقتوں کے باعث کتب خانوں سے استفادہ کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہو گیا۔

مختصر یہ کہ جب میں کتابوں کی تلاش و جستجو میں لیاقت نیشنل لائبریری پہنچا تو وہاں جناب حفیظ اختر (ڈائریکٹر لائبریریز حکومت پاکستان) بڑے اخلاق سے پیش آئے اس لائبریری میں میرے مطلب کی کوئی کتاب تو نہ مل سکی لیکن کتابوں اور پاکستانی کتب خانوں کے متعلق کچھ اہم باتیں ڈائریکٹر صاحب سے معلوم ہو گئیں۔

کتابوں کی فراہمی کے سلسلہ میں سید الطاف علی بریلوی اور سید مصطفےٰ علی بریلوی (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس لائبریری) ڈاکٹر معین الحق (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی لائبریری) جناب عادل عثمانی اور محمد عبدالحلیم چشتی (کراچی یونیورسٹی لائبریری) حکیم نعیم الدین زبیری مولانا فضل اللہ فاروقی اور عزیزی جمیل نقوی (ہمدرد لائبریری) گلستان خان (پی۔آئی۔ایم لائبریری) اور غلام مرتضیٰ (گورنمنٹ نیشنل کالج لائبریری) کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں ڈاکٹر انیس خورشید اور پروفیسر محمد ایوب قادری کا خاص طور پر شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تعارف اور مقدمہ تحریر فرمائے ہیں قادری صاحب

کا میں اس لئے بھی بڑا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا پورا مسودہ پڑھا۔ مفید مشورے دیئے اور اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کا موقع دیا۔ متعدد بار یہ بھی کرم کیا کہ میری مطلوبہ کتابیں میرے پاس بھجوانے کا اہتمام کر دیا۔

مجھے مخلصی الحاج محمد ذکی (ایم۔ اے علیگ) مالک ایجوکیشنل پریس کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کی خصوصی توجہ کے باعث کتابت و طباعت کے مراحل سے یہ کتاب بخیریت گذر گئی ہے۔ صوفی عبدالغنی صاحب حامد بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے کتابت کے اہم کام کو بڑی توجہ سے انجام دیا ہے۔

یہاں یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس کتاب کی تکمیل میں میرے متعلقین بھی اعانت کرتے رہے میری رفیقۂ حیات نے اس موقع پر بھی حقِ رفاقت بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ کتابت شدہ مسودہ کا اصل مسودہ سے مقابلہ کا کٹھن کام ان ہی کی امداد سے مکمل ہوا ہے مختلف لائبریریوں سے کتابیں لانے اور واپس کرنے کا کام میرے بیٹے خالد زبیر اور میرے ایک عزیز شاگرد معین الظفر زبیری نے انجام دیا ہے ان کی عدم موجودگی میں جب مجھے کسی کتب خانہ جانے کی ضرورت پیش آتی تو میرے بیٹے محمد عزیر کی بیوی یاسمین سلّمہا میرا سہارا بنی رہتیں چونکہ میری آنکھ کے آپریشن کے بعد مجھے کراچی کی پُر آشوب سڑکوں پر چلنے بالخصوص انہیں پار کرنے میں بڑا تکلف ہونے لگا ہے

آخر میں خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس خدمت کو مقبولیت بخشے۔

اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی۔

فرحت منزل۔ اے ۷/۴۵۔ ایچ،
شمالی ناظم آباد کراچی
یکم ستمبر ۱۹۷۸ء

محمد زبیر

دیباچہ طبع اول

اسلامی کتب خانوں نے علمی دنیا میں جو اپنے تابناک کارنامے چھوڑے ہیں انھیں دیکھ کر دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اُن کے رُخِ روشن سے ماضی کے پردے اُٹھا دئے جائیں تو یہ علم و ادب اور فنِ لائبریری کی بہت بڑی خدمت ہوگی اس خیال نے پہلی بار "اسلامی کتب خانوں کی سیر" کے نام سے ۱۹۵۷ء میں عملی جامہ پہنا تھا مگر اس میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے شامل نہ تھے اور بیرونِ ہند کے اسلامی کتب خانوں پر صرف اجمالی نظر ڈالی گئی تھی۔ دراصل وہ میری سعی و تحقیق کا نقش اول تھا اور زیرِ نظر کتاب اس کا نقش ثانی ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اُن سارے کتب خانوں کا ذکر موجود ہے جو قرونِ وسطیٰ کی وسیع و عریض اسلامی سلطنتوں میں پھیلے ہوئے تھے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بارہ سو برس کے کتب خانوں کی ایک واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کے علمی شغف اور ان کی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے اس کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ قرونِ وسطیٰ میں کتابی ذوق پھیلانے اور کتابوں سے متعلقہ فنون کی ترویج میں مسلمانوں نے کتنا شاندار حصہ لیا تھا۔

لیکن جب اسلامی کتب خانوں کا حال لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو معلوم ہوا کہ یہ موضوع جتنا وسیع ہے اسی قدر اس کے متعلق مواد کی کمی ہے۔ علمی و ادبی تاریخ کی کتابوں میں بھی اس کے بارے میں معلومات نہایت مختصر اور منتشر ملتی ہیں۔ مورخین نے سیاسی اور تمدنی حالات تو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں مگر کتب خانوں کی نسبت کہیں کہیں ضمنی طور پر لکھ دیا ہے اور بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ کتب خانوں کی تاریخ پر جو کتابیں یورپ اور امریکہ وغیرہ سے شائع ہوئی ہیں ان میں بھی اسلامی کتب خانوں کا ذکر بالکل سرسری طور پر کر دیا گیا ہے۔ مواد کی یہ کمیابی اتنی حوصلہ شکن اور محنت طلب ثابت ہوئی کہ اس

موضوع کے ساتھ آج تک پورا انصاف نہ ہوسکا اس پر متفرق مضامین تو لکھے گئے لیکن کتب خانوں کی مکمل تصویر کسی نے نہیں کھینچی۔ اردو میں شاید سب سے پہلے علامہ شبلی نے اسلامی کتب خانوں پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں موصوف نے کہا ہے کہ "عنوان کے لحاظ سے مضمون کو نہایت مفصل اور وسیع ہونا چاہیئے تھا لیکن جن واقعات کو قدما نے نظر انداز کر دیا ہو ان کے متعلق مشکل سے کچھ اجمالی حالات مل سکتے ہیں مفصل تو بالکل نہیں ملتے"۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں جو ان گنت کتب خانے قائم ہوئے ان سب کو قیدِ تحریر میں لانے کے لئے کتنے وسائل درکار ہوں گے۔ میرا بہت جی چاہا کہ شہر شہر پھر کر اس عہد کے علمی خزانوں کا کھوج لگاؤں یا کم از کم ہند و پاک کے خاص خاص کتب خانوں سے ہی استفادہ کر لوں مگر وسائل کی قلت اور حالات کی ناسازگاری سدِ راہ بنی رہی اور اس اہم موضوع کا پورا حق ادا نہ ہوسکا۔ یہ کتاب آج سے بہت پہلے شائع ہو جاتی اگر اس کی تکمیل میں میری مجبوریاں حائل نہ ہوتیں۔ حصولِ معاش کی جدّوجہد میں سارے دن مصروف رہنے کے بعد جو وقت بھی ملتا وہ اس کام کی نذر کرتا رہا۔ خدا بھلا کرے میری بیوی کا جنھوں نے ان خانگی ذمہ داریوں کا بھی بوجھ اٹھالیا جو مجھ سے متعلق تھیں اور مجھے اس کام میں یکسوئی کے ساتھ منہمک رہنے کا موقع دیدیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب کی تکمیل کے دوران میں دل و دماغ کو پراگندہ کر دینے والے ایسے واقعات پیش آتے رہے کہ کئی ماہ تک مسودہ کو ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آسکی بہرحال خدا کا شکر ہے کہ طرح طرح کے موانع کے باوجود میں اپنی سعی و کاوش کو کتابی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ کتب خانوں کا یہ مرقع اس طرح تیار ہوا ہے کہ ان کے متعلق جس قدر مواد مل سکا اس سے استفادہ کیا اور اس باب میں جہاں تاریخ کو خاموش پایا وہاں لوگوں کے علمی ذوق اور مدارس و تصانیف کو اساس بنا کر کتب خانوں کے مرقعے تیار کئے مثلاً اگر کسی بادشاہ کا کتب خانہ ملا ہے اور اس کے درباری علما اور امراء کے کتب خانوں کا ذکر نہیں آیا تو اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے تحت شاہی دربار

کے ہر صاحبِ علم کے پاس کتابوں کے ذخیرے ہونا ضروری سمجھا گیا اور جہاں اہل قا
اصحابِ علم وفضل اور مدارس ملے ہیں اوران کے کتب خانوں کا ذکر نہیں ملا وہاں شخصی ا
اور درس گاہی کتب خانوں کا ہونا لازمی قرار دیا گیا اس لئے کہ درس وتدریس اورتصنیف
وتالیف کی جان کتابیں ہیں اور کتابوں سے صحیح استفادہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب
انھیں کتب خانوں کی شکل میں رکھا جائے۔ چنانچہ کتب خانوں کے ساتھ مدارس اور تصنیف
کا بھی کچھ ذکر آگیا ہے۔

فرحت منزل
بدر باغ ۔ علی گڑھ
۱۸ ر فروری سنہ ۱۹۶۱ء

محمد زبیر

پیش لفظ

(طبع اول)

(از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے بادۂ تند و تیز سے سرشار ہو کر علوم و فنون کا رُخ کیا تو یونان و روما کے خزانوں کو کھنگال ڈالا جو علوم و فنون مُردہ ہو گئے تھے۔ انھیں اپنی مسیحا نفسی سے دوبارہ زندگی بخشی پھر ان کو جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ ان پر تنقید کی۔ ان کا کھرا کھوٹا معلوم کیا اور ان کے علاوہ کتنے علوم و فنون ہیں جن کی ایجاد انھوں نے کی۔ ظاہر ہے حصولِ علم کی پہلی ضرورت کتاب ہے۔ جب مسلمانوں کو علوم و فنون کے ساتھ یہ شغف اور عشق تھا تو خود کتابوں کی غور و پرداخت اور ان کی دیکھ بھال اور حفاظت و انتظام کا انھیں کس قدر اہتمام نہ ہوتا ہوگا چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ سے ہی کتب خانوں کے قائم کرنے اور ان کی دیکھ بھال کا سراغ ملتا ہے اس کے بعد جوں جوں مسلمان تہذیب و تمدن اور شائستگی و ثقافت میں ترقی کرتے رہے دوسرے لوازم زندگی کے ساتھ کتب خانہ بھی اُن کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتا رہا اور اس کے نظم و نسق میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔

ان کتب خانوں کا تذکرہ اگرچہ تاریخ و ادب کی کتابوں میں جستہ جستہ ملتا ہے لیکن اول تو جو کچھ بھی ہے وہ اس قدر کم ہے کہ اس سے اسلامی کتب خانوں کی تصویر کا مکمل خاکہ تیار نہیں ہوتا پھر وہ اس درجہ منتشر اور غیر مرتب ہے کہ اس کو یکجا کرنے کے لئے بڑی محنت و کاوش درکار ہے۔ خدا جزائے خیر عطا فرمائے جناب حاجی محمد زبیر صاحب کو کہ اس جوئے شیر لانے کی انھیں دُھن سوار ہوئی مسلم یونیورسٹی لائبریری، علیگڑھ کے اسسٹنٹ لائبریرین ہونے کی حیثیت سے کمی کس بات کی تھی۔ لائبریری سائنس سے اچھی طرح واقف۔ ذوق پختہ اور مستعد لیس جب فرصت ملی کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے چنانچہ

"اسلامی کتب خانوں کی سیر" کے نام سے ایک کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع کر چکے ہیں جو عا
طور پر بڑی مقبول پسندیدہ ہوئی لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی موصوف
مطالعہ اور تلاش وجستجو کا سلسلہ برابر جاری رہا ان کی سعی و محنت کا یہ نقش ثا
معلومات کی افراط اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے بہمہ وجود "نقاش نقش ثانی بہتر کش
اول" کا مصداق ہے۔ اس کتاب سے علمی و ادبی تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ ہو
جس پر ابھی تک پوری توجہ نہیں کی گئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں اسلامی کتب خانو
پر اتنی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بلکہ عا
شائقین علم کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سند قبول
عطا فرمائے اور لائق مصنف کو ان کے خلوص اور مجاہدانہ محنت و کوشش کی داد ملے۔

علیگڑھ
۹ جنوری ۱۹۶۱ء

سعید احمد اکبرآبادی

تعارف

از پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید

شعبہ لائبریری سائنس کراچی یونیورسٹی

زیر نظر کتاب کے مصنف الحاج محمد زبیر صاحب برصغیر کے ایک محترم اور کہنہ مشق کتابدار ہیں مولانا عبدالماجد دریابادی نے صدق جدید (۲ر اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں تحریر فرمایا تھا کہ "زبیر صاحب ذوق نظر کے لحاظ سے بھی لائبریرین ہی ہو گئے ہیں"۔ آپ تیس سال سے زائد عرصے تک مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی لٹن لائبریری سے (جو اب مولانا آزاد لائبریری کے نام سے موسوم ہے) وابستہ رہے' اس لائبریری کی نوک پلک درست کرنے میں بھی آپ کے ذوق نظر کا خاصا حصہ ہے اور لائبریری کی کم و بیش نصف لاکھ کتابیں آپ کے ہاتھوں کیٹلاگ ہوئیں ہیں ایسے محترم بزرگ اور معروف لائبریرین کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے ۔

الحاج محمد زبیر صاحب سے ویسے تو میں ۱۹۵۱ء ہی میں متعارف ہو چکا تھا یہ دہی سال ہے جب آپ کی پہلی کتاب "شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا نظام" شائع ہو چکی تھی اس کتاب پر ایک تبصرہ میرے آبائی شہر کامٹی کے ہفت روزہ اخبار الفاروق کی ۱۴ر اگست ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوا تھا' میں نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز اسی اخبار سے کیا تھا' اسی لئے کراچی آنے کے بعد بھی اسے باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا یوں اس اخبار کے ذریعہ زبیر صاحب سے اپنی زندگی میں پہلے لائبریرین مصنف کی حیثیت سے متعارف ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں کتب خانوں کے پیشے سے ابھی وابستہ نہیں ہوا تھا۔ آپ سے باقاعدہ ملاقات البتہ اس وقت ہوئی جب میں نے کراچی یونیورسٹی لائبریری میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور آپ پہلی مرتبہ علیگڑھ سے کراچی رخصت پر تشریف لائے تھے جب آپ اردو کالج کے قریب واقع یونیورسٹی لائبریری میں تشریف لائے تو میرے محترم دوست اور

رفیق کار عبداللہ خاں مرحوم اور میں کتابوں کی درجہ بندی میں ایسے منہمک تھے کہ کچھ لمحے تک آپ کی آمد کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ جب نظر اٹھی تو آنکھیں چکا چوند ہوگئیں ایک بہت ہی محترم شخصیت اپنا تعارفی کارڈ ہاتھ میں لئے ہماری درجہ بندی کے انہماک کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ کارڈ دیکھنا تھا کہ ہم لوگ تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ یہی تو الحاج محمد زبیر تھے۔ یہ ملاقات اب بھی مجھے یاد ہے۔ اس کے بعد جب آپ ریٹائر ہو کر کراچی آگئے تو آپ کو اور بھی قریب سے دیکھنے سننے اور پڑھنے کا موقعہ ملا۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ سے تعلق خاطر سوا ہوتا ہی رہا۔ ہندوستان کے کچھ اکابر فن کتابداری سے میری بھی شناسائی ہے جب بھی وہاں سے خط آتا ہے یا کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو محترم زبیر صاحب کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔ ابھی گزشتہ ماہ ہی کی بات ہے کہ میرے عزیز ترین دوست پروفیسر پی۔ این۔ کاؤلا (پروفیسر لائبریری سائنس بنارس ہندو یونیورسٹی) سے ایک مدت مدید کے بعد برسیلز میں ملاقات ہوئی۔ جب ہم لوگوں کو فرصت کے کچھ لمحات ملتے تو بس زبیر صاحب کے ذکر ہی پر تان ٹوٹتی۔ ایسی ہی ایک گفتگو میں پروفیسر کاؤلا بہت کرب سے کہنے لگے زبیر صاحب نے پہلے علیگڑھ چھوڑا پھر بشیر صاحب چلے گئے۔ ان لوگوں کے جانے سے علیگڑھ کا شبستان کتاب جیسے دھندلا گیا ہو۔ مجھ سے یہ کہتے نہ رہا گیا کہ زبیر صاحب بھی یہ سن کر متاثر ہونگے لیکن مجھے خوشی ہے کہ کراچی میں زبیر صاحب کے آنے سے کچھ بجھتے چراغوں کو روشنی مل گئی ہے۔

یوں تو آپ نے مختلف موضوعات پر دس سے زائد کتابیں لکھی ہیں لیکن "شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا نظام" اور "اسلامی کتب خانے" آپ کی دو بیش بہا کتابیں علمی دنیا میں خاصی دلچسپی کا باعث بنی رہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے لیکر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تک نے ان کتابوں کی علمی اور تحقیقی حیثیت کی تعریف کی ہے۔ زیرِ نظر کتاب "اسلامی کتب خانے" کا نظرِ ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ اس کتاب میں اسلامی کتب خانوں کی تاریخ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے کتب خانوں سے اپنی دلچسپی اور اسلامی علوم و فنون سے فطری لگاؤ کی وجہ سے اس کتاب کو مزید دستاویزی

حوالوں اور حواشی کے ساتھ مزین کر کے علم و ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

اس عمر میں بھی الحاج محمد زبیر صاحب نے جس محنت شاقہ سے پاکستان کے علاقائی کتب خانوں کے بارے میں نیا مواد اس کتاب میں پہلی بار یکجا کیا ہے اس نے اس کتاب کی افادیت کو اور بھی زیادہ کر دیا ہے۔ اور اس طرح یہ کتاب اپنے اس مواد اور ضروری اضافوں کے بعد ایک بالکل ہی نئی تصنیف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

فاضل مصنف قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے کافی چھان بین اور دیدہ ریزی کے بعد یہ معلومات افزا کتاب اہل علم و دانش اور لائبریری سائنس کے طلبا ر کے لئے پیش کر دی ہے۔ اللہ کرے کہ اُن کا سا ذوق نظر اور جذب دروں ہماری نئی نسل کے کتاب کاروں کو بھی نصیب ہو تاکہ وہ بھی حاجی صاحب موصوف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کتابوں کے چراغ کو ہمیشہ اُن کی طرح یوں ہی روشن اور فروزاں رکھ سکیں۔ آمین۔

کراچی یونیورسٹی
۲۶ ستمبر ۱۹۷۸ء

انیس خورشید

مقدمہ

از پروفیسر محمد ایوب قادری

فیڈرل گورنمنٹ اردو کالج۔ کراچی

کتب خانوں اور کتابداری کے علم سے مسلمانوں کا تعلق شروع سے رہا ہے۔ جس زمانے میں یورپ اور دنیا کے دوسرے متمدن ممالک جہالت وگمنامی کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اُس وقت مسلمانوں نے تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین کی روایات قائم کیں۔ بزرگوں کے علمی ورثے کی حفاظت کی۔ بیت الحکمت اور علمی ادارے وجود میں لائے اور اس طرح کتابداری کی روایات کو آگے بڑھایا۔ مسلمانوں کے ابتدائی کارناموں میں ابن ندیم کی الفہرست خاص طور سے قابل ذکر ہے جو اُن کے کتابداری کے ذوق کی آئینہ دار ہے۔

مسلمانوں نے جب برّصغیر میں قدم رکھا تو دیکھا کہ علم اور کتاب کا تعلق برہمنوں سے ہے۔ دوسرے لوگوں کے لئے علم کے دروازے کلیتہً بند ہیں۔ مسلمانوں نے اس دولت کو عام کیا۔ جب سلطنت دہلی کا قیام عمل میں آیا تو علمی وتصنیفی روایات خوب برگ وبار لائیں۔ علماء وفضلاء نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے سلسلہ میں قابل ذکر کارنامے انجام دیئے اور کتب خانے قائم ہوئے۔ مشائخ وصوفیہ کے تربیتی نظام میں "سیر وسیاحت" ایک اہم عنصر ہے۔ ان بزرگوں کے ذریعہ سے تصنیفی کارناموں اور کتابوں کا تعارف وتبادلہ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا تھا۔ سید جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (ف ۷۸۵ھ/۱۳۸۴ء) اور مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (ف ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء) برّصغیر کے مشہور شیوخ طریقت ہیں ان بزرگوں کے حالات میں ہمیں واضح اشارے ملتے ہیں کہ صوفیہ ومشائخ کے ذریعہ کتابیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی تھیں۔ مدارس، درس گاہوں اور مراکز علوم کے علاوہ کتابوں کے ذخائر مشائخ وصوفیہ

کی خانقاہوں میں بھی رہے ہیں۔ برصغیر کی بہت سی خانقاہیں آج بھی نادر و نایاب کتابوں کی امین ہیں، ضرورت ہے کہ خانقاہی کتب خانوں کا جائزہ لیا جائے اور اُن پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے ۱۹۶۳ء میں خاکسار نے بریلی کا سفر کیا۔ خانقاہِ نیازیہ میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ کتابوں کو دھوپ دی جا رہی تھی مخطوطات و نوادر کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ بہت سی خانقاہوں کے کتب خانے معلوم و مشہور ہیں۔ پاکستان میں خانقاہ اوچ (گیلانی) خانقاہ فاضلیہ گڑھی افغانان، خانقاہِ گیلانی (دیکہ توت شریف، پشاور)، خانقاہ سعیدیہ موسیٰ زئی وغیرہ کے ذخائر علمی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں۔

علماء و مشائخ کی طرح سلاطین و وزراء اور امراء و عمائد بھی کتابوں میں دلچسپی لیتے تھے اور ان کے مستقل کتب خانے تھے۔ فیروز شاہ تغلق، ہمایوں، عبدالرحیم خانخاناں، ٹیپو سلطان، حافظ رحمت خاں، علامہ تفضل حسین خان، نوابان اودھ اور سلاطین دہلی کے ذخائر کتب، تاریخ کا اہم موضوع ہیں۔ ان کتب خانوں کی کتابیں آج بھی یورپ کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ان ہی لولوئے آبدار کو دیکھکر علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی

جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یہاں ہم ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض علماء و امراء مستقل طور سے کتابیں نقل کر کے وقف عام کرتے تھے افادہ عام کی غرض سے بالعموم کتابیں وقف و ہبہ کی جاتی تھیں۔ اسی روایت کی بناء پر بہت سے ذاتی ذخیرے بڑے بڑے کتب خانوں کی زینت بنے ہیں دورِ آخر کے شیخ طریقت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کتابوں کے متعلق اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں۔

"احقر نے بتوفیق حق سبحانہ تعالیٰ اس کتاب خانے میں جو موقع باغ رائے پور میں واقع ہے دو مد کی کتابیں جمع کی ہیں ایک وہ جو بندے کی ملک مجازی ہیں

بندہ نے ان کتابوں کو اسی غرض سے جمع کیا تھا کہ وقف رہیں جو ان کا اہل ہو اُن سے نفع اٹھاوے۔ یہ نیت شروع ہی سے تھی کہ یہ احقر کا ترکہ نہ سمجھا جائے جس میں وراثت جاری ہو۔ اب صاف طور پر تصریح کرتا ہوں کہ یہ وقف ہیں اور میں بطور متولی ان کی حفاظت و نگرانی کرتا ہوں دوسری مد مدرسہ کی کتابوں کی ہے جو خریدی گئیں یا کسی نے مدرسہ میں دیں جن میں بڑا ذخیرہ قرآن شریف کا ہے: یہ سب وقف ہیں"

مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں۔

"اپنی مملوکہ کتب کی نسبت میں نے بتوفیقہ تعالیٰ رائے قائم کرلی ہے کہ ان کا اکثر حصہ مدرسہ عربیہ دیوبند کے لئے اور کچھ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے لئے وقف کر دوں اور حسب اجازت فقہیہ اپنی حیات تک ان سے خود منتفع ہونے کی شرط کرلوں اگر خود ہی ان مدرسوں میں بھیج دوں تو خیر ورنہ میرے بعد فوراً داخل کردی جائیں۔ جس کتاب پر جس مدرسہ کا نام لکھا ہو وہ اس کیلئے مخصوص ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے"

معارف پروری اور نشر علوم کا یہ کیسا قابل قدر جذبہ ہے۔

ملک میں جب بھی سیاسی اُتھل پُتھل اور ارضی و سماوی آفات ظہور پذیر ہوتی ہیں سب سے زیادہ نقصان کتابوں اور کتب خانوں کو ہوتا ہے۔ آتش زدگی اور سیلاب وغیرہ میں ایسے بیش بہا علمی ذخیرے ضائع ہوئے ہیں کہ جن کی تلافی ممکن نہیں۔ سیاسی انقلابات میں بھی کتب خانوں اور علمی ذخیروں کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ دلی پر سکھوں، جالوٹوں، مرہٹوں، اور ابدالیوں کی یورشیں ہوئیں تو نہ معلوم کتنے ذخیرے برباد ہوئے۔ اور رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء میں پوری ہوگئی۔ "حضرت دہلی" سے آبادی کا ایسا انخلاء ہوا کہ بقول شخصے "جھاڑو پھر گئی" غالب کے خطوط میں کتابوں اور کتب خانوں کی بربادی کا ذکر ملتا ہے۔ کتابوں کے ضیاع کا اس سے اندازہ لگایئے کہ ولیم میور نے آگرہ سے دہلی کے مارشل لا کمشنر برن کو لکھا کہ دہلی کی سڑکوں اور گلیوں میں عربی کی جو کتابیں بکھری پڑی

یں ان کو جمع کر لیا جائے کیونکہ وہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب لکھ رہا تھا اسی
طرح لکھنؤ کی بربادی کا حال ایک چشم دید گواہ مرزا نصیر الدین برلاس (ف ۱۹۰۹ء) نے
اس طرح لکھا ہے کہ انگریزوں کی فتح اور قیام امن کے بعد جب سرکاری کارگذار کی حیثیت
سے انھیں ایک مکان رہنے کو ملا تو صحن اور دالان کتابوں کے اوراق سے بھرے ہوئے تھے۔

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

۱۹۴۷ء کی بربادی تو کسی قدر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور یہ اُن شہروں
یں دیکھی جہاں فسادات کم ہوئے۔ دہلی اور مشرقی پنجاب وغیرہ کے کتب خانوں کا کیا
حال ہوا ہوگا۔ ۱۹۴۷ء میں بریلی اور بدایوں وغیرہ کے بازاروں میں نادر ذخیرے اور قلمی
کتابیں ڈھیروں کے حساب سے پڑی رہیں ان ہی دنوں ہم نے مولانا عبد الماجد بدایونی
(ف ۱۹۳۱ء) کے کتب خانے کی بربادی بھی دیکھی۔ مسلمانوں کے مقفل مکانوں پر شرنارتھی
زبردستی قبضہ کرتے تھے اور ان کے علمی ذخیروں کو بری طرح پامال و برباد کرتے تھے۔ اسی
طرح دادو، حیدرآباد سندھ اور لاہور میں بھی ہندی، سنسکرت گورمکھی اور گجراتی کی کتابیں
شرنارتھیوں کے ہاتھوں پر تباہ و برباد ہوتی دیکھیں غرض سیاسی انقلابات بھی کتابوں اور کتب خانوں
کی بربادی کے سبب رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نئی مملکت میں انفرادی، نیم سرکاری اور سرکاری سطح پر
کتب خانے قائم ہوئے ہیں اور کتب خانوں کے قیام میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے مختلف جامعات
میں لائبریری سائنس کی تعلیم کے اجراء کی وجہ سے کتب خانوں کی دیکھ بھال سائنٹفک طریقے
پر ہونے لگی ہے اور یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

اُردو زبان میں کتب خانوں کے حالات و ترقی پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں اس
موضوع پر زیادہ تر مضامین علمی رسائل مثلاً معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) العلم
(کراچی) المعارف (لاہور) اور فکر و نظر (اسلام آباد) میں شائع ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں
الزبیر (بہاول پور) کا کتب خانہ نمبر بھی قابل ذکر ہے۔ الحاج محمد زبیر صاحب علمی دنیا
میں کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور ایک علمی خاندان کے

فرد ہیں۔ مارہرہ ان کا وطن اور علی گڑھ وطن ثانی ہے ان کی تمام عمر کتابوں، اور کتب خانوں
میں گذری ہے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شہرہ آفاق لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین
رہ چکے ہیں اور جب مسلم یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا آغاز ہوا تو تدریس کے
فرائض بھی انجام دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ لائبریری سائنس، کتابوں اور کتب خانوں سے ان
کو ایک خاص تعلق ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے اور کراچی میں آنے کے بعد بھی وہ
علم کی خدمت کو اپنا وظیفۂ حیات بنائے ہوئے ہیں۔

ان کی کتاب "اسلامی کتب خانے" ۱۹۶۱ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع
ہوئی تھی۔ اس کتاب کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ لائبریری سائنس کے نصاب میں
شامل کی گئی۔ اب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ محمد زبیر صاحب نے نہ صرف
اس کتاب پر نظر ثانی کی ہے بلکہ بعض ابواب کو از سر نو لکھا ہے اور مفید اضافے کیے ہیں بلکہ کتابت
سے متعلق جو حصہ ہے وہ تو کلیتہً دوبارہ لکھا گیا ہے اس طرح اس کتاب کا نقش ثانی واقعی
پہلے کے مقابلے میں خوب سے خوب تر ہے اور اب یہ کتاب بجا طور پر ایک گرانقدر نئی تصنیف
کہلانے کی مستحق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب اوّلیت کا درجہ رکھتی
ہے اور اسلامی کتب خانوں پر برّصغیر میں اس نوع کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی اس میں
کتب خانوں اور کتابوں سے متعلق جو مواد یکجا ہو گیا ہے وہ نہایت بیش قیمت ہے یہ
کتاب آئندہ محققین کے لئے مشعل راہ ثابت ہو گی۔

۲۳ر ستمبر ۱۹۷۸ء

محمد ایوب قادری
اے/۴/۱۷/این شمالی ناظم آباد کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

اسلامی کتب خانوں کا قیام اور نظام

تہذیب و تمدّن کوئی ذی علم اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ قرونِ وسطیٰ میں اسلامی کتب خانے **کے خزانے** تہذیب و تمدن کے وہ بے بہا خزانے تھے جنکے فیض سے دنیا کا کوئی متمدّن گوشہ محروم نہ رہا لیکن ان کے ذکر سے پہلے کتب خانوں کے تاریخی پس منظر کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مسلمانوں نے اس خاکہ میں کتنے انہماک اور حوصلے سے رنگ بھرے تھے اور کتب خانوں کی دنیا کو کتنی نئی قدروں سے متعارف کرایا تھا تاریخ بتاتی ہے کہ عہد قدیم سے لے کر آج تک کتب خانے علمی و تہذیبی زندگی کے اہم عناصر مانے گئے ہیں۔ اور ہر زمانہ میں ان کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا گیا ہے۔

عہد قدیم کے دو کتبخانے اس سلسلہ میں سب سے پہلے کتب خانہ[1] اشور بانی پال اور

---

[1] اسے سلطنتِ آشوریہ کے فرماں روا آشور بانی پال (۶۶۸-۶۲۶ ق م) نے نینوا (بابل) میں قائم کیا تھا اس کی کتابیں مٹی کی تختیاں (CLAY TABLETS) تھیں جن کی تعداد دس ہزار تھی ان پر خطِ پیکانی (CUNEIFORM) میں مذہبی احکام اور شاہی فرامین وغیرہ درج تھے۔ ان کی ترتیب مضامین کے لحاظ سے کیگئی تھی اور اسکی فہرست بھی بنی ہوئی تھی۔ اس کتبخانے کی بہت سی تختیاں برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔ عراق میں بابل کے باشندوں نے کچی اینٹوں پر لکھنا شروع کیا تھا جنہیں پائدار بنانیکے لئے پکا لیا جاتا تھا۔ یاد رکھنے کہ زمانہ قدیم کے کتب خانے کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز اسی کتب خانہ کے قیام سے ہوتا ہے۔

کتب[۱] خانہ اسکندریہ کے نام آئے ہیں جو عہد قدیم کے مشہور ترین کتب خانے کہے جاتے ہیں
لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اُس زمانہ کے کتب خانے آجکل کی لائبریریوں کی طرح نہ تھے اور نہ اُ
عہد کی کتابیں موجودہ زمانہ کی کتابوں کی شکل میں تھیں ان دونوں کی نوعیت ہر زمانہ میں بدلتی
ہے۔ مثلاً کاغذ کے رواج سے پہلے قرطاس مصری[۲]، مٹی کی تختیاں، اس کے بعد کھال، جھلی، بھو
پتر کی چھال، کھجور کے پتے اور ہڈی کے ٹکڑے لکھنے کے لئے استعمال کئے گئے۔ ان اشیاء پر لکھے ہو
نوشتے جمع کرکے جہاں کھدیے جاتے وہی کتب خانے کہلائے جانے لگتے۔ پُرانی دنیا کے علمی مرکزوں، یو
مصر، روما، بابل، چین اور ہندوستان میں اسی طرز کے کتب خانے موجود تھے مگر چونکہ ان قومو
کا مزاج علمی نہ تھا اور انھوں نے علم کو خاص خاص طبقوں کی میراث بنا لیا تھا اسی لئے ان کتبخانو
سے مخصوص افراد ہی استفادہ کر سکتے تھے۔

---

[۱] یہ مصر کے بطلیموسی دور کا کتب خانہ حضرت مسیح سے تقریباً پونے تین سو سال قبل اسکندریہ میں قائم ہو
تھا اس میں پانچ یا سات لاکھ کتابیں تھیں جو اصل میں قرطاس مصری پر لکھے ہوئے نوشتے تھے جن کی فہرست
کیلی ماکس (CALLI MACHUS) نے مرتب کی تھی جو اس کتبخانہ کا ایک ممتاز کارکن تھا۔ اس کتبخا
کی بربادی کا الزام مخالفین اسلام نے حضرت عمرؓ پر لگا دیا تھا جسے علامہ شبلی نے اپنے ایک مضمون
"کتب خانۂ اسکندریہ" میں غلط ثابت کر دیا ہے۔

[۲] یہ مصر میں دریائے نیل کے کنارے اُگنے والے ایک درخت پیپرس (PAPYRUS) کے گودے
یا چھال سے تیار کیا جاتا تھا۔ ان پر لکھنے کا آغاز حضرت مسیح سے تقریباً چار ہزار برس پہلے ہو گیا تھا۔ اس
پر لکھے ہوئے نوشتے رول کی شکل میں ہوتے تھے۔ ان کے دونوں کناروں پر دو گول لکڑیاں لگا دی
جاتی تھیں جن پر انہیں نقشے کی طرح لپیٹ دیا جاتا تھا۔ اور اسے بھی یاد رکھیئے کہ پیپر، پیپرس سے مشتق ہے
اور اسی کی چھال یا گودے کو لاطینی زبان میں لبر (LIBER) کہتے ہیں اسی لفظ سے لائبریری نکلا ہے۔ اور
یہ ہی پیپرس موجودہ کاغذ کا مورث اعلیٰ کہا جاتا ہے۔

کاغذ سازی کا فن کب اور کہاں ایجاد ہوا؟ اسے مسلمانوں نے کیسے حاصل کیا؟ یہ دونوں باتیں اگلے
صفحات میں دیکھئے اور یہ کتاب بھی پڑھ لیجئے۔
THE. BOOK STORY OF
PRINTING AND BOOK MAKING BY D. C. MC MURTRIE

یورپ میں کتب خانوں کی ترقی کی ابتدا

لیکن اس باب کا تاریک رُخ یہ ہے کہ کاغذ اور چھاپے خانوں کا رواج ہو جانے کے بعد بھی یورپ میں کتب خانے سینکڑوں برس تک ٹھٹھرے پڑے رہے اور عیسائی کلیسا کی علم دشمنی نے انھیں انیسویں صدی[۱] عیسوی کے وسط تک محافظ خانوں اور عجائب خانوں کی شکل میں رکھا۔ ان کی غرض و غایت صرف اتنی تھی کہ ان میں کتابیں حفاظت کے ساتھ سجا کر رکھ دی جائیں۔ اُن کتب خانوں میں کتابیں زنجیروں سے باندھ کر رکھی جاتی تھیں تاکہ انھیں کوئی وہاں سے لیجا نہ سکے اور اُن کے مطالعہ پر سخت پابندیاں عائد تھیں پڑھنے والے کو کتاب کے ورق الٹنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ایک نگراں مقرر رہتا تھا وہی ورق الٹ دیا کرتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس وقت مسیحی دنیا میں کچھ اچھے کتب[۲] خانے موجود تھے رومن شہنشاہ قسطنطین اول نے ایک کتب خانہ قسطنطنیہ میں قائم کیا تھا جس میں ۶۹۰۰ کتابیں تھیں مسیحی خانقاہوں سے بھی کتب خانے ملحق تھے مگر افادیت کے نقطۂ نظر سے ان کا عدم اور وجود برابر تھا۔ تمدنِ[۳] عرب کے مصنف کا بیان ہے کہ عیسائی راہب اپنے

---

[۱] یورپ میں کتب خانوں کی ترقی کی ابتدا اُس ایکٹ سے کی جاتی ہے جو ۱۸۵۰ء میں برٹش پارلیمنٹ نے پاس کیا تھا اسکی رو سے جو ٹیکس لگایا گیا وہ لائبریری سیس (LIBRARY CESS) کہلاتا تھا اس ایکٹ کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے لائبریری کے لئے جائداد زمین اور فرنیچر وغیرہ تو خریدا جاسکتا تھا مگر کتابیں خریدنے کی اجازت نہ تھی۔ اس ایکٹ کا نام پبلک لائبریری اینڈ میوزیم ایکٹ تھا جسے ایڈورڈ ایورٹ (EDWARD EWART) نے برٹش پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ مگر اس سے پہلے امریکہ میں بوسٹن (BOSTON) کی بلدیہ نے شہر کے لئے ۱۸۴۸ء میں لائبریری قانون منظور کیا تھا جو بعد میں میساچوسٹس (MASSACHUSETTS) کی ریاست میں نافذ کر دیا گیا تھا یہ قوانین مغربی دنیا میں موجودہ لائبریری تحریک کے بنیادی پتھر ہیں۔

[۲] ملاحظہ ہو (HISTORY OF LIBRARIES BY ALFRED HESSEL)

[۳] تمدن عرب مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان مترجمہ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی صفحہ ۵۱۳)

وقت کو خانقاہی کتب[1] خانوں سے یونان و روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر ان کو چھیل
اور ان کے چرمی ورقوں پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ غرض اس
عہد میں یورپ اور دوسرے ملکوں کے کتب خانے جسدِ بے روح اور شمع بے نور کے مصداق
بنے ہوئے تھے۔ بقول شاعر ؎

دل مرکزِ حیات ہے اور زندگی نہیں ؛ اک شمع جل رہی ہے مگر روشنی نہیں

کتُب خانوں کی صبح صادق

لیکن اس زمانہ کی اسلامی دنیا کے کتب خانوں میں کتابیں قیدو بند میں جکڑی ہوئی نہ تھیں ان سے تمام خاص و عام بلا امتیاز استفادہ کر سکتے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ اپنی ندرت اور افادیت
کے اعتبار سے یگانۂ روزگار کتب خانے تھے انہیں مسلمانوں نے بڑے خلوص، لگن اور حوصلہ
سے افادۂ عام کی خاطر قائم کیا تھا وہ انھیں علم کا مصدر و مامن اور اسلامی تہذیب و تمدن
کا نہایت قیمتی سرمایہ سمجھتے تھے۔ اور ان کی عظمت و اہمیت دلوں پر نقش کرنے کے لئے
انھیں "بیت الحکمت"، دار العلم، خزانۃ القصور، خزانۃ الکتب" جیسے دلکش ناموں سے موسوم
کر دیا گیا تھا۔

علمی اور ثقافتی میدان میں مسلمانوں کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ انھوں نے
اُس سکوت و جمود کو جو سینکڑوں برس سے کتب خانوں کی دنیا پر چھایا ہوا تھا دور کر کے
ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کے تحت کتابوں سے مستفید ہونا کسی خاص گروہ یا طبقہ
تک محدود نہ رہا بلکہ ان کے استعمال کی سہولتیں بہم پہنچانا اور ان کے مطالعہ سے عوام کا
علمی شعور بیدار کرنا کتب خانوں کا مقصد قرار پایا۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی کتب خانوں کے قیام سے
کتب خانوں کی تاریخ کا ایک بالکل نیا دور شروع ہوا یا یوں کہیئے کہ ان کی صبح صادق
نمودار ہوئی جس کی روشنی میں وہ منزل بہ منزل آگے بڑھتے رہے اور بالآخر تہذیب و ثقافت
کے حیات بخش سرچشمے بن گئے۔

[1] (MONASTIC LIBRARIES)

اسلامی کتب خانوں کی ترقی کے اسباب

قرون وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں کتب خانوں کی ترقی کا ایک زبردست سبب یہ تھا کہ مسلمان کتابوں سے والہانہ شغف رکھتے تھے۔ ہر اسلامی ملک میں تحصیلِ علم، مطالعہ کتب، اور تصنیف و کتابت کے ذوق و شوق کا دریا موجزن تھا۔ علم و فن کی اشاعت کرنا قومی شعار بن گیا تھا اور کتابیں جمع کرنے کا سودا ہر شخص کے دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ دنیا میں مسلمانوں کی کشور کشائی اور جہانبانی کا ڈنکا بج رہا تھا اور اقلیم علم و سیاست پر اُن کا ہی سکّہ رواں تھا اور ان کی علم دوستی، معارف پروری و علمی قدردانی نے وہ فضا پیدا کردی تھی جس میں صرف کتب خانوں کی تشکیل و ترقی ہی نہیں ہوئی بلکہ تمام علوم و فنون نے حیات نو پائی۔ نئے نئے علوم رائج ہوئے مدرسے قائم ہوئے سائنسی تحقیقات کے لئے تجربہ گاہیں کھلیں، رصدخانے تعمیر ہوئے، کاغذ سازی کے کارخانے وجود میں آئے، خطاطی، نقاشی و جلد بندی کی ترویج و ترقی ہوئی۔

کتابوں کی محبت قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں کتابوں کی محبت و افادیت اور ان کی تعظیم و تکریم کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ انہیں اپنا بہترین مونس و ہمدم سمجھتے تھے چنانچہ عرب کا شاعر متنبیؔ اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے "وَخَیرُ جَلِیْسٍ فِی الزَّمَانِ کِتَابُ" (اور زمانہ میں بہترین ہمدم کتاب ہے)

ایک ممتاز عالم جاحظ نے کتاب کے بارے میں کہا ہے کہ:-

> جب تک آپ چاہیں کتاب خاموش رہتی ہے جب آپ بات چیت کرنا چاہیں تو فصاحت کے ساتھ بولنے لگتی ہے اگر آپ کسی کام میں مصروف ہیں تو مخل انداز نہیں ہوتی اور اگر آپ تنہائی محسوس کریں تو وہ آپ کی ایک شفیق ساتھی بن جاتی ہے وہ ایک ایسا دوست ہے جو آپ کو کبھی دھوکہ نہیں دیتا نہ آپ کی چاپلوسی

کرتا ہے اور ایسا ساتھی ہے جو کبھی آپ سے نہیں اُکتاتا۔"

ایک اور عالم فرماتے ہیں "کتاب مُردوں کی زبان ہے اور زندوں کی آواز ہے و
شام کے وقت آپ سے ملنے والا ایک ایسا دوست ہے جو اس وقت تک نہیں سو
جب تک آپ خود نہ سو جائیں اور ہمیشہ وہی بات کرتا ہے جس سے آپ کو خوشی
ہوتی ہے کبھی آپ کا راز فاش نہیں کرتا وہ انتہا درجہ کا وفادار ہمسایہ ہے معقول دوست
ہے۔ فرمانبردار ساتھی ہے، منکسر المزاج پروفیسر ہے ایک ماہر و مفید انیس ہے جو
نہ کبھی کسی معاملہ میں بحث کرتا ہے اور نہ اپنے مالک سے اُکتاتا ہے۔"

کتابوں سے قلبی تعلق کی مثال اسحاق بن سلیمان طبیب کے واقعہ[1] سے بہتر شاید
ہی کہیں ملے ان کی عمر سو برس کی ہوئی مگر انھوں نے شادی نہیں کی جب ایک مرتبہ
کسی نے اولاد کے متعلق دریافت کیا تو کتابوں کے اس شیدائی نے جواب دیا کہ "اپنی کتاب
حمیات کے ہوتے ہوئے اولاد نہ ہونے کا خیال بھی مجھکو نہیں آتا۔"

علمی مراکز گو کتابوں کی محبت کے یہ انداز اب نہیں رہے اور مسلمانوں کی علمی
شان و شکوہ کے جلوے عرصہ ہوا نگاہوں سے غائب ہو چکے ہیں مگر ان کے نقوش تاریخ
کے صفحات اور مدینہ، بغداد، قرطبہ کے درو دیوار پر ابھی تک ثبت اور روشن نظر آتے
ہیں۔ اسلامی دنیا میں علم کا پہلا مرکز مدینہ تھا۔ پھر کوفہ و بصرہ تھے اس کے بعد دمشق،
بغداد، قرطبہ، قاہرہ، شیراز، نیشاپور، سمرقند و بخارا، غزنی، دلی اور لاہور وغیرہ
علوم کے گہوارے بن گئے۔ اسلامی مملکت کی وسعت[2] کے ساتھ علم کا دائرہ بھی بڑھتا
رہا اور اس کے ساتھ مدرسے اور کتب خانوں کی توسیع ہوتی رہی اگرچہ مختلف حکمران
خاندانوں کے درمیان سیاسی معاملات میں یکجہتی نہ تھی بلکہ بعض اوقات اختلافات
کی شدت لڑائیوں کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی جو اقتضائے بشریت تھا لیکن علم کی

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء از ابن ابی اصیبعہ بحوالہ علمائے سلف از حبیب الرحمٰن
خاں شروانی ص ۳۸۔

[2] اسلام کی توسیع جس سرعت کے ساتھ ہوئی اس کا اندازہ لگانے کے لیے (بقیہ اگلے صفحہ)

اشاعت اور خدمت کا جذبہ سب کے دلوں میں موجزن تھا اور ہر فرماں روا علوم وفنون کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ مسلم حکمرانوں کی ان علمی رقابتوں کو مورخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے علمی ترقیوں کا ایک سبب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے رقیبانہ مقابلہ نے علوم وفنون کا مذاق اور ان کی برکات کو سمرقند و بخارا سے لے کر فاس اور قرطبہ تک پہنچا دیا تھا۔

ثقافتی سرگرمیوں کا ایک منظر اسلامی ممالک میں علم و ہنر کے چرچے کیسے پھیلے ہوئے تھے یہ ہماری زبان سے نہیں بلکہ ایک عیسائی مورخ اسکاٹ کی زبان سے سنیئے اس نے قرطبہ کی ثقافتی شان و شکوہ کا منظر اس طرح کھینچا ہے۔

"یکایک خود بخود میری چشم تصور کے سامنے اس عظیم الشان دارالخلافہ کے باشندوں کے روزانہ کاروبار اور گفتار و رفتار آگئے جو محنت سے تھکنا نہ جانتے تھے جو صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، کمالات و تکلفات، لطافت و نفاست اور حسن و اخلاق میں عیش پرست دمغرور و زوال پذیر روم سے بڑھے ہوئے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ تمام شہر میٹھی نیند سو رہا ہے اور اونچی اونچی میناروں پر علماء علم ہیئت بروج آسمانی کے نقشے لے رہے ہیں۔ اجسام فلکی اور اجرام سماوی کے مناظر و مظاہر کا مطالعہ کر رہے ہیں کواکب

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کے عہد پر نظر ڈالنی چاہیئے مسلمانوں کو جہاد کا حکم دوسری صدی ہجری میں دیا گیا تھا اس وقت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت (۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء) تک اسلام کا رقبہ حکومت ۱۰ لاکھ مربع میل میں پھیل گیا اس کے بعد بارہ برس کے اندر یعنی حضرت عمرؓ کے عہد (۱۳-۲۳ھ) تک رقبہ حکومت ۲۷ لاکھ مربع میل تک پہنچ گیا اور ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحلت کیئے ہوئے سو برس بھی نہ ہونے پاتے تھے کہ مسلمان ایشیا میں چین تک اور یورپ میں بحر اٹلانٹک تک جا پہنچے۔

کی حرکات کو دیکھ رہے ہیں، ستیاروں کے درمیانی فاصلوں کو
ناپ رہے ہیں اور کسوف وخسوف کا حساب لگا رہے ہیں۔ میری
آنکھیں ان کتب خانوں کو دیکھ رہی تھیں جن میں ہزاروں کتابیں
تھیں ان کتب خانوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک فوج کی فوج
مترجموں کی تھی جو زمانہ قدیم کے بڑے بڑے علماء فضلاء کی بہترین
تصانیف کو عربی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ مترجم ہر ایک طالب علم
کی بلالحاظ اس کی قومیت یا مذہب کے مفت خدمت کرنے کو تیار
رہتے تھے۔ ہر ایک شہر کی یہی ممتاز کیفیت ہے دنیا بھر میں کسی جگہ
قلب انسانی کے نشوونما کے لئے ایسے مواقع نہ تھے دنیا بھر میں کہیں
کسی جگہ نہ علم وادب کی ایسی خدمت ہوتی تھی نہ اتنی قدر"

اسلام اور علم یہ ہے نمونہ اس ثقافتی زندگی کا جس کا چشمہ کوہِ فاراں سے پھوٹا تھا
درحقیقت دنیا کا کوئی مذہب علم کی اتنی حمایت نہیں کر سکا جتنی کہ اسلام نے کی۔ اسلام
نے اپنے ظہور کے بعد سب سے پہلے زبانِ وحی[1] سے علم کی عظمت وفضیلت کا اعلان کر دیا
تھا جس کا یہ اثر ہوا کہ اسلام کے اولین دور میں ہی علم کے چرچے ہونے لگے آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلم مرد اور عورت پر تحصیل علم[2] واجب کر کے تعلیم عامہ کی داغ بیل
ڈالی اور آپ کے زریں[3] اقوال مثلاً اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ[4]۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ

---

[1] سب سے پہلی وحی قرآن کریم کی یہ پانچ آیتیں ہیں جو غار حرا میں شب جمعہ ۱۷ رمضان المبارک سلہ نبوت مطابق ۱۷ اگست ۶۱۰ء کو نازل ہوئی تھیں۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ [2] طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ

[3] ملاحظہ ہو علامہ ابن البر کی کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" جس میں علم کی فضیلت اور اہل علم کی عظمت کے متعلق احادیث اور اکابرین اسلام کے اقوال مندرج ہیں اس کا اردو ترجمہ "العلم والعلماء" کے نام سے ہوا ہے۔

[4] علم حاصل کرتے رہو خواہ تمہیں اس کے لئے چین جانا پڑے۔

اُطۡلُبُوا الۡعِلۡمَ مِنَ الۡمَهۡدِ اِلَى اللَّحۡدِ[۵۵] نے تحصیلِ علم کی اہمیت اور ضرورت کو واضح اور نمایاں کردیا۔ حقیقت یہ تعلیم نبوی ہی کا کرشمہ تھا کہ عرب جیسی جاہل اور پس ماندہ قوم علم دوست اور علم پرور بن گئی ان میں حصول علم کا ذوق و شغف اس قدر بڑھا اور انھوں نے طلب کا دامن اتنی دور تک پھیلایا کہ بقول عیسائی مورخ جرجی زیدان " وہ آشور، بابل، مصر، یونان، فارس اور ہندوستان کے تمام علوم کے وارث ہوگئے۔

ذوقِ مطالعہ تحصیل علم کے شوقِ بے پایاں کے ساتھ ذوقِ مطالعہ اور تصنیف و کتابت کے کچھ نمونے بھی دیکھ لینے چاہئیں تاکہ اُس ماحول کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجائے جو کتب خانوں کی ترقی کے لئے درکار ہے جہاں تک ذوقِ مطالعہ کا تعلق ہے اس کی سینکڑوں مثالیں مسلم سماج کے ہر طبقہ میں نظر آتی ہیں۔ حسن بصریؒ کی زندگی کے چالیس سال ایسے گزرے کہ سوتے جاگتے کتاب ان کے سینے پر رہتی تھی۔ بادشاہوں میں اُندلس کے اُموی خلیفہ حکم ثانی کا ذوق مطالعہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کے کتب خانہ کی چار لاکھ کتابوں میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کو اس نے پڑھا نہ ہو۔ علامہ ابن رشد نے ساری عمر کتب بینی میں صرف کردی اس کی عمر میں صرف دو راتیں ایسی گزری ہیں کہ جب وہ مطالعہ نہ کرسکا۔ ایک شادی کی اور دوسری والد کی وفات کی رات۔ منجم ابو معشر کے انہماکِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے خراسان سے مکہ جاتے ہوئے بغداد کا ایک کتب خانہ خزانۃ الحکمت دیکھنے کا قصد کیا مگر وہاں پہنچ کر مطالعہ میں اتنا محو ہوا کہ مکہ جانا بھول گیا۔ بصرہ کے ایک مشہور عالم جاحظ نے تو اپنی جان ہی ذوقِ مطالعہ کی نظر کردی وہ آخر عمر میں مفلوج ہوگیا تھا لیکن اس حالت میں بھی کتابیں اس کے چاروں طرف لگی رہتی تھیں۔ اور وہ مطالعہ میں منہمک رہتا تھا ایکدن کتابیں جاحظ پر گر پڑیں اور وہ ان کے نیچے دب کر مرگیا۔ فتح ابن خاقان کو کتابوں کے مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ اس کی آستین میں ہر وقت ایک نہ ایک کتاب رہتی تھی یہاں تک کہ وہ بیت الخلاء میں بھی کتاب کا مطالعہ کرلیا کرتا تھا۔

---

[۵۵] ماں کی گود سے لے کر قبر میں جانے تک علم حاصل کرو۔

حضرت امام زہری کے متعلق ایک نہایت دلچسپ بات حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنی کتاب علمائے سلف میں لکھی ہے کہ وہ مطالعہ میں اتنے منہمک رہتے کہ دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہتی ان کی بی بی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اس کے سوا کسی اور کی اس قدر گنجائش شوہر کے دل میں ہو چنانچہ ایک روز اس نے بگڑ کر کہا قسم ہے رب کی یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں

تصانیف کی کثرت

تصنیف وتالیف کے میدان میں مسلمانوں نے جو کارنامے سر کئے ہیں ان کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ غیر قوموں کے علوم کو بھی سربلند کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا حکمائے یونان ومصر وہند کے سرمایہ علم وحکمت کو عربی کا جامہ پہنا کر حیات جاوید بخشدی۔ جرجی زیدان[۵۱] لکھتا ہے۔

"مسلمانوں نے اس وقت کے تمام علوم وفنون، فلسفہ، طب، نجوم، ریاضی ادب، تاریخ وغیرہ وغیرہ کو جو تمام اقوام عالم میں رائج تھے اپنی زبان میں لے لیا اور ائمہ متمدنہ میں سے کسی کو نہ چھوڑا جس کی زبان سے عربی میں کتابیں نہ ترجمہ کی ہوں۔ یہ تمام علمی ذخیرہ صرف صدی ڈیڑھ صدی میں جمع کر لیا تھا اور اہل روما یورپ چار صدی تک بھی یونانی علوم کو نقل نہ کر سکے تھے یہ مسلمانوں کی عجیب خصوصیت ہے جو دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے تمدن کے تمام اسباب حیرت انگیز عجلت کے ساتھ مہیا کر لئے۔"

اہل نظر جانتے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت علم کہیں عام نہ تھا عرب میں بھی سوائے چند افراد کے[۵۲] نہ کوئی لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور نہ عربی زبان میں کوئی کتاب موجود تھی لیکن مسلمانوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں عربی کو اتنا متمول بنا دیا کہ بقول موسیو لیبان یورپ کی یونیورسٹیاں

---

[۵۱] علوم عرب ترجمہ تاریخ التمدن الاسلامی جلد سوم مصنفہ علامہ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر، مترجمہ مولانا اسلم جیراجپوری مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۰۷ء۔ اس میں مسلمانوں کی ہر قسم کی علمی ترقیات نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ [۵۲] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت قریش میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے جن میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت ابوعبیدہؓ، طلحہؓ، زیدؓ، ابوحذیفہؓ، ابوسفیانؓ، شفا بنت عبداللہ شامل ہیں۔

چھ سو برس تک عربی کتابوں کے تراجم پر زندہ رہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پندرھویں صدی تک کسی ایسے مصنف کا حوالہ نہ دیا جاتا تھا جس نے عربی کتب سے استفادہ نہ کیا ہو۔ الغرض مسلم اہل قلم نے علم وفن کے تمام شعبوں کی آبیاری کی اور بےنظیر تحریری سرمایہ فراہم کردیا صرف ایک مضمون تاریخ پر بقول جرجی زیدان اس قدر کتابیں لکھیں جو حدِ شمار سے باہر ہیں۔ موجودہ زمانہ سے پہلے دنیا کی کسی قوم نے فن تاریخ میں وہ درجہ نہیں حاصل کیا جو مسلمانوں نے پایا۔

اسلامی دنیا میں ایسے مصنفین بھی گذرے ہیں جن کی کثیر وضخیم تصنیفات وتالیفات بجائے خود مستقل کتب خانے ہیں مثلاً امام ابن تیمیہ نے ۵۰۰۔ ابن حزم نے ۴۰۰۔ ابن جوزی نے ۲۵۰، ابن الہیثم نے ۲۰۰ سے اوپر۔ ابوریحان البیرونی نے ۱۱۴ سے زائد۔ امام فخرالدین رازی نے ۸۰۔ امام غزالی نے ۷۰۔ ابن خطیب نے ۶۰ کتابیں لکھیں۔ ابن الاعرابی (محمد بن زیاد) کے متعلق تو یہ لکھا ہے کہ محض اپنی یادداشت سے اتنا بہت علم لکھایا کہ کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر ہے[۱] انھوں نے نہایت مفید تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

اسی طرح مختلف علوم وفنون پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں مثلاً امام مالک بن انس، ابن شہاب زہریؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابویوسفؒ، امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ جیسے بزرگوں کی تصانیف نے علم حدیث وفقہ کو بے حد وسعت بخشی۔ تاریخ وجغرافیہ اور سیرت کی دنیا میں ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن خلدون، ابن خلکان، ابن حجر عسقلانی، ابن اثیر، بلاذری، طبری، مقری، ادریسی، قزوینی اور یاقوت کی تصانیف کی روشنی آج تک پھیلی ہوئی ہے۔ طب، طبعیات، کیمیا، ہیئت وغیرہ میں فارابی، ابوبکر رازی، بوعلی سینا، ابن ہیثم اور ابن بیطار کے تجربات ومشاہدات اور ان کی تصانیف مشعل راہ کا کام دے رہی ہیں ان کے علاوہ ابن ماجہ، ابن طفیل اور ابن رشد کی تصانیف نے مشرق اور مغرب کے فکر ونظر میں جو انقلاب پیدا کیا وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس فہرست میں خلیل بن احمد (متوفی ۱۷۰ھ) کا نام بھی شامل کردینا مناسب معلوم

[۱] العلم والعلماء ص ۲۷۶

ہوتا ہے یہ عربی لغت و ادب کے امام اور فن عروض کے موجد تھے۔ ان کی تصنیف کتاب العین اور ان کے شاگرد سیبویہ کی "الکتاب" فن عروض اور قواعد کی سب سے پہلی کتابیں ہیں اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خلیل بن احمد نے کعبہ کا پردہ پکڑ کر یہ دعا مانگی تھی کہ اے خدا مجھے ایسا علم عطا کر جو اب تک کسی کو نصیب نہ ہوا ہو اللہ نے دعا قبول کی اور یہ علم ان کو عطا کیا جس کا نام خلیل نے عروض اس لئے رکھا کہ کعبہ کا ایک نام عروض بھی ہے۔

اس موقع پر ایک کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا اسماء الرجال پر جو کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں ان میں یہ بہترین کتاب کہی جاتی ہے اس کے انگریزی مقدمہ میں ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے۔

"کوئی قوم[1] دنیا میں ایسی نہیں گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"

قید اور تصنیف و تالیف

اسلامی تاریخ میں ایسے محبانِ علوم کے نام بھی ملتے ہیں جو دورِ ابتلاء اور ایام محن میں کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے اور جن کے قلم کی روانی قید خانوں کی چہار دیواری بھی نہیں روک سکی تھی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے قید خانوں میں درس کی مجلسیں گرم رکھیں امام ابن تیمیہؒ نے قید و بند کے دوران میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط کی پندرہ جلدیں قید خانہ میں بیٹھ کر لکھیں ہندوستان کے مفتی عنایت احمد نے عربی صرف و نحو کی کتاب اور مولانا فضل حق خیر آبادی نے قصائد جیسات ایام جلاوطنی میں بمقام انڈمن لکھے۔

ذوقِ کتابت

کتابت کا بھی کتب خانوں سے گہرا تعلق ہے اس زمانہ میں طباعت کا رواج نہ ہونے کے سبب سے اُن کی ترقی کا تمام تر انحصار کاتبوں کے دست و قلم پر تھا۔ فن کتابت پر بحث تو اگلے صفحات میں کی گئی ہے یہاں صرف اُن چند کاتبوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جنکے ذوقِ کتابت نے کتب خانوں کو مالا مال کر دیا تھا اور جو قلم کے

[1] ملاحظہ ہو "خطبات مدراس" از مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ اعظم گڑھ (۱۹۵۸ء) ص ۳۷۔

ایسے دھنی تھے کہ ہزارہا صفحات کی نقل بلا تکلف کر دیا کرتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ کے استاد احمد بن عبد الدائم نے مختلف علوم کے دو ہزار مجلدات لکھے تھے۔ حضرت یحییٰ ابن معین نے چھ لاکھ حدیثیں اور شیخ ابن جوزی نے دو ہزار جلدیں لکھیں۔ شیخ جن قلموں سے حدیث کی کتابیں لکھتے ان کے تراشے نہایت احتیاط سے اس ہدایت کے ساتھ جمع کرتے جاتے تھے کہ وفات پر ان تراشوں سے غسل میت کا پانی گرم کیا جائے لیکن یہ اتنے تھے کہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی بچ گئے۔ امام ابو حنیفہؒ کی لکھی ہوئی کتابوں کی کثرت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آپ کے قلم صاف کرنے کی خدمت آپ کے شاگرد امام محمد کے سپرد تھی وہ اپنے استاد کے قلم پر لگی ہوئی روشنائی جمع کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ اسی سے امام محمد نے تفسیر کی ایک ضخیم کتاب لکھ دی[۱]

ان باتوں کا ذکر کہاں تک کیا جائے اس کے لئے بھی ایک مستقل کتاب درکار ہے لیکن اس کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ کتابت کا رشتہ بھی پیغمبر اسلام کی ذات اقدس سے جا کر ملتا ہے اس فن کے ماہرین میں والہانہ ذوق پیدا کرنے کے محرک وہ اقوال ہیں جو اشاعت علم کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ چنانچہ جب مشہور محدث ترمذی اور نسائی کے استاد یعقوب القسوی کی بینائی کثرت کتابت کے باعث جاتی رہی اور وہ اس غم میں رات کو روتے روتے سو گئے تو انھیں خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی القسوی[۱] خود کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میری آنکھوں پر پھیرا اور اسی وقت میری بینائی بحال ہو گئی۔

یہ ہیں علمی کمالات اور ثقافتی سرگرمیوں کے وہ نمونے جو غیر مسلموں سے بھی آج تک خراج عقیدت لے رہے ہیں چنانچہ ایک ہندو[۲] فاضل نے کہا ہے کہ "اگرچہ میں خود مسلمان نہیں ہوں لیکن اسلام نے علوم و فنون کے میدان میں جو بازی جیتی ہے اس کو سوچتا

[۱] ملاحظہ ہو نکت الهمیان فی نکت العمیان از صلاح الدین الصفدی ص ۳۱۲)

[۲] ملاحظہ ہو ڈاکٹر سر پی۔ سی رائے کا خطبہ "اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم" جو اس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دوسرے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۷ فروری ۱۹۲۴ء بمقام علی گڑھ پڑھا۔ ہماری کتاب میں جہاں سر پی۔ سی رائے کا نام آیا ہے اس سے یہی خطبہ مراد ہے۔

ہوں تو میرا ایشائی دل فخر و مسرت سے پھول جاتا ہے" یہ ہی شخص اسلام کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"جب یورپ کی دنیا بربریوں کے حملوں سے زوال پذیر ہو کر ناگفتنی تاریکی کے گڑھے میں جا پڑی تھی اگر اس وقت اسلام ملک کو نہ پہنچتا اور اعلیٰ علوم کی تخم ریزی کر کے اس کی پوری پرداخت نہ کرتا اور حق و حریت کی جاں بخش آب و ہوا میں ان کی تربیت کر کے انھیں پھولنے پھلنے نہ دیتا تو میں پوچھتا ہوں کہ آج دنیا کہاں ہوتی اور تہذیب جدید کا نشان کہاں ملتا ؟"

اِسلامی کتب خانوں کی ابتداء

توسیع اور ترقی

الغرض مسلمانوں کی علمی وثقافتی سرگرمیاں کتب خانوں کے حق میں عظیم الشان
ثابت ہوئیں جیسے جیسے تحصیل علم اور تصنیف وتالیف کا ذوق عام ہوا اسی طرح
خانوں کی توسیع وترقی ہوتی رہی اور بالآخر کتابیں جمع کرنے کا شوق اتنا بڑھا
بلاد اسلامی ممالک کتب خانوں سے معمور ہوگئے۔

گو اسلامی دنیا میں احکام وسنن اور اخبار وسیر کا تحریری سرمایہ آنحضرت صلی اللہ
وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جمع ہونا شروع ہوگیا تھا لیکن باقاعدہ طور پر
میں لکھنے اور غیر عربی کتابوں کے عربی تراجم کی ابتداء عہد بنی امیہ سے ہوتی ہے اسی عہد میں
امی کتب خانوں کی بنیاد پڑی۔

لامی کتب خانوں کا بانی علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ "کتب خانہ کی اول جس نے بناء
ڈالی وہ خالد بن یزید بن معاویہ تھا"۔ خالد (متوفی ۸۵ھ)
لم طب وکیمیا وغیرہ سے اتنا لگاؤ تھا کہ اس نے ان موضوعات پر کئی رسالے لکھدیے[۲]
د کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ "اس نے ایک شخص کو اس لئے ملازم رکھا تھا کہ وہ ان
ین کی کتابیں اسکے لئے ترجمہ کیا کرتا تھا پھر وہ کتب خانہ میں رکھی جاتی تھیں"[۳]

واقعی یہ اسلامی کتب خانوں کی بڑی خوش قسمتی ہوئی کہ ان کی بنیاد پڑتے ہی عہد اموی

سائل شبلی [۲] ان رسالوں کے نام یہ ہیں کتاب الحرارت۔ کتابت الصحیفۃ الکبیر۔ کتابت الصحیفۃ القنیر
ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن۔ ڈاکٹر احمد شلبی)

کی تصنیفی اور تالیفی سرگرمیوں نے انکی جڑیں اتنی مضبوط و مستحکم کر دیں کہ وہ عہد بہ عہد ترقی کر کے بام عروج پر
جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے تاریخ سے متعلق ا
کتاب "کتاب الملوک واخبار الماضین" عبید بن شریہ سے لکھوائی۔ انھوں نے ہی ایک عیس
طبیب ابن آثال سے طب کی بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا بقول علامہ شبلیؒ "یہ پہلا اضافہ تھا
عربی زبان کے سرمایہ میں ہوا" پھر ہشام بن عبد الملک نے اپنے عہد میں ایران کی تاریخ کا فا
سے عربی میں ترجمہ کرایا۔ اسی عہد میں موسیٰ بن عقبہ، وہب بن منبہ اور دیگر بزرگو
بھی کتابیں لکھیں اور اس سلسلہ کا مقدس و اہم ترین کام یہ ہوا کہ احادیث اور سیرۃ نبویؐ
پہلی کتابیں موطا امام مالکؒ اور ابن اسحاق کی "کتاب المغازی" کی ترتیب و تدوین اسی دور
میں ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں مصنف[۱] تاریخ الامت کے یہ الفاظ پیش کر دینے کافی ہو
کہ "اسلامی علوم کا وہ چمن جو خلافت عباسیہ میں برگ و بار لایا عہد بنی امیہ میں لگایا جا چکا تھ
لیکن کتب خانوں کے ضمن میں اسے نہ بھولنا چاہیئے کہ بنی امیہ کی حکومت قائم ہو
چوبیس برس بعد عبد الملک بن مروان کے عہد میں شاہی کتب خانہ نے اتنی اہمیت اختیار کر
تھی کہ جب عبد الملک کی تحریک پر سعید بن جبیرؒ نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تو اسے شاہی کتبخا
میں رکھا گیا یہ خیال رہے کہ اس خلیفہ نے ہر فن پر کتابیں لکھوائیں جس نے کتب خانوں کی تر
کے لئے زمین ہموار کر دی اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد خلافت (۹۹ - ۱۰۱ھ)
تصنیف و تالیف کی ترقی ہونے سے کتب خانوں کی بھی ترقی ہوئی اس نیک بخت خلیفہ نے ا
اور مغازی کی طرف خاص توجہ دی۔ احادیث کے مجموعے تیار کرا کے تمام مملکت میں بھیجے۔ ا
زہری کے استاد ابو بکر بن حزم انصاری کو احادیث جمع کرنے کا حکم دیا اور عاصم بن قتا
انصاری کو مغازی اور مناقب کا درس دینے کے لئے متعین کیا اس علم دوست خلیفہ
کتابیں مشتہر کرنے میں بھی حصہ لیا۔ ماسرجویہ یہودی کی کتاب جو اس نے سریانی زبان سے تر
کی تھی شاہی کتب خانہ سے نکلوائی اور اس کی نقلیں شائع کرائیں۔ عمر بن عبد العزیزؒ کے بعد
برس بعد خلیفہ ولید بن یزید کے کتب خانے میں کتابوں کی جو کثرت بیان کی گئی ہے اس

[۱] مولانا اسلم جیراجپوری۔

ب خانوں کی رفتارِ ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سیرۃ النبی (حصہ اول) میں ہے کہ
لید بن یزید کے قتل ہو جانے کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر اس کتب خانہ
ے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات و تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر
ی گئیں" اس قتل کے چھ برس بعد عہد بنی امیہ (۱۴-۱۳۲ھ) کا خاتمہ ہو گیا اور اس
ے ساتھ اسلامی کتب خانوں کی تاریخ کا اولین دَور بھی ختم ہوا۔

امویوں کے بعد عباسیوں کا عہد (۱۳۲-۶۵۶ھ) آیا کتب خانے اپنے دوسرے دور میں
ل ہوئے انھیں اس عہد کی علوم و فنون کی ترقیوں کے باعث جو فروغ حاصل ہوا وہ
ی تاریخ کا نہایت زرّین باب ہے اسی زمانہ میں خلیفہ ہارون رشید نے نہایت وسیع پیمانے
یک کتب خانہ "بیت الحکمت" بغداد میں قائم کیا جو نہ صرف اسلامی دنیا کا پہلا عظیم ترین
ب خانہ تھا بلکہ دنیا میں اس وقت اس جیسا کوئی کتب خانہ موجود نہ تھا۔ اس لئے وہ
ب سے پہلا عظیم الشان[۵۱] پبلک کتب خانہ کہا جاتا ہے۔

د کتب خانے اب کتابیں جمع کرنے کا شوق بادشاہوں تک محدود نہ رہا بلکہ عوام
میں بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ کتب خانے اسلامی تہذیب و تمدن کا
و لاینفک بن گئے۔ بقول مصنف الہارون[۵۲] بغداد کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں ایک کتب خانہ
و اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جس میں کتب جمع کرنے کا شوق نہ ہو۔ پھر جب اندلس میں مسلم
لطنت قائم ہوئی تو وہاں بھی کتابیں جمع کرنے کا ایسا شدید شوق پھیلا کہ بقول مورخ
اٹ اندلس میں کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جہاں تشنگانِ علوم کو سیراب کرنے کے لئے کم از کم
چشمہ (کتب خانہ) نہ ہو۔ اندلس کے دار السلطنت قرطبہ میں الحکم ثانی کا کتب خانہ اس
یں ایک بے نظیر مرتبہ رکھتا تھا۔ درحقیقت بغداد اور قرطبہ کے کتب خانے مشرق اور
ب میں علم کے بڑے فیض رساں مراکز تھے جنہوں نے عوام میں علم حاصل کرنے اور کتابیں
رنے کا ایسا زبردست میلان و رجحان پیدا کر دیا تھا کہ تمام اسلامی ممالک میں عام اور

---

[۵۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم ص ۱۰۴۵۔ [۵۲] الہارون از عمر ابو النصر۔ اردو ترجمہ
شیخ محمد احمد پانی پتی۔ ص ۲۲۱۔

ذاتی کتب خانے پھیل گئے ان سب کا ذکر اگلے صفحات میں آئیگا یہاں مثال کے طور پر چید
کتب خانوں کے نام سن لیجے۔ بادشاہوں میں بخارا کے فرماں روا نوح بن منصور کے کتب
میں ہر علم و فن کی کتابیں جمع تھیں۔ حلب کے حکمراں سیف الدولہ کے ہاں فنِ ادب کی بہت س
موجود تھیں۔ شیراز میں عضدالدولہ کے کتب خانہ میں وہ ساری کتابیں تھیں جو ابتدائے ا
سے اس کے عہد تک تصنیف ہوئی تھیں۔ غزنی میں سلطان محمود غزنوی نے بہت بڑا کت
قائم کیا تھا سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے دمشق، حلب، ب
اور مصر وغیرہ میں متعدد کتب خانے قائم کئے تھے۔ ترکی سلاطین میں سلیمان اعظم کے ذاتی
میں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ محمود اوّل نے قسطنطنیہ میں چار عظیم الشان کتب خانے قائم ک
سلیم ثالث کے عہد میں مدرسہ توپخانہ کا کتب خانہ فنونِ جنگ اور ریاضی کی بہترین کتابوں سے معمو
وزراء میں یحییٰ بن خالد برمکی (وزیراعظم ہارون رشید) کے پاس جتنی کتابیں تھیں
کسی بادشاہ کے پاس بھی نہ ہوں گی۔ متوکل باللہ کے وزیر فتح بن خاقان کا کتب خانہ
اعلیٰ کتابوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عظیم الشان کہلاتا تھا۔ ایوبی خاندان کے و
کے کتب خانہ کی مالیت پچاس ہزار دینار تھی۔ وزیر ابن عمید کے کتب خانہ میں ہر علم
کی سو اونٹوں اور صاحب بن عباد کے پاس چار سو اونٹوں کا بوجھ کتابیں تھیں۔ نیشاپو
ایک امیر ابونصر سہل بن مرزبان نے اپنی تمام دولت کتابیں جمع کرنے میں صرف کر دی تھی ف
کا ایک کتب خانہ بیش بہا یونانی اور لاطینی کتابوں سے پُر تھا۔ طلیطلہ (اندلس) کی مس
عظیم الشان کتب خانہ کی شہرت ایک علمی مرکز کی حیثیت سے دور دور تک پھیلی ہوئی
قرطبہ کے قاضی فطیس کے پاس نہایت قیمتی کتب خانہ تھا ایک علم دوست مدرس محمد بن حز
قرطبہ میں ایسا نایاب کتب خانہ قائم کیا کہ اکثر اہل علم اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ بغدا
علی بن یحییٰ منجم کے شاندار کتب خانہ "خزانۃ الحکمت" میں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لئے
ممالک سے لوگ آتے تھے۔ محمد بن الحسین لبغدادی کا کتب خانہ ایک علمی عجائب خانہ تھا
حکیم بلمظفر مصری کے کتب خانہ میں ہزاروں کتابیں ہر فن کی تھیں ایک طبیب حنین بن ا
کا کتب خانہ اس زمانہ کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا امام حاتم سجستانی نے چھ

دینار کی قیمتی کتابیں، حافظ ابن فرات بغدادی نے کتابوں کے اٹھارہ صندوق اور علامہ واقدی نے چھ سو قمطر کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں یہ خیال رہے کہ ہر قمطر میں دو آدمیوں کا بوجھ تھا۔

کتابوں کی تعداد اسلامی کتب خانوں میں کتابوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ان کی تعداد کئی کروڑ تک شمار کیجا سکتی ہے۔ گذشتہ سطور میں جن کتب خانوں کے نام آئے ہیں ان کے علاوہ کچھ اور کتب خانوں کے نام درج کئے جاتے ہیں جن میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۷ لاکھ ۴۵ ہزار تھی جس کی تفصیل یہ ہے۔

بیت الحکمت بغداد۔ ۱۰ لاکھ[1]	کتب خانہ سابور بن اردشیر، بغداد۔ ۱۰ ہزار۔	کتب خانہ جامعہ ازہر قاہرہ[2] ۲ لاکھ
کتب خانہ الحکم، قرطبہ ۴ لاکھ۔	کتب خانہ جعفر احمد بن عباس (وزیر حکمران المیریا) ۴ لاکھ۔	کتب خانہ موفق الدین بن مطران (طبیب خاص سلطان صلاح الدین ایوبی) ۱۰ ہزار
خزائن القصور، قاہرہ ۱۶ لاکھ۔	کتب خانہ الملک المؤید داؤد بن یوسف (فرماں روا یمن) ایک لاکھ۔	کتب خانہ افرائیم بن رفان[3] ۱۰ ہزار۔
کتب خانہ بنو عمار طرابلس ۳۰ لاکھ	کتب خانہ محمودیہ قاہرہ ۴ ہزار	کتب خانہ امین الدولہ بن غزال[4]۔ ۲۰ ہزار
کتب خانہ مراغہ ۴ لاکھ۔		ترکی کے کتب خانوں میں[5]۔ ۹۰ ہزار
کتب خانہ ابن علقمی (وزیر مستعصم باللہ) ۱۰ ہزار۔		

علاوہ ازیں اور بہت سے کتب خانے اس کتاب میں جابجا پھیلے ہوئے ہیں ان میں وہ بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں سیکڑوں سالہ مسلم عہد میں قائم ہوئے تھے ان تمام کتب خانوں میں بھی لاکھوں کتابیں موجود تھیں ان کو متذکرہ بالا تعداد (۲۷ لاکھ ۴۵ ہزار) میں شامل کر دینے سے کل تعداد بلاشبہ کئی کروڑ[6]

---

[1] جرجی زیدان نے ۴ لاکھ اور مورخ اکبر شاہ خان نے ۶ لاکھ کے قریب لکھی ہے۔ [2] یہ تعداد ۳۸۹ھ تک تھی [3-4] جرجی زیدان نے افرائیم کے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد ۲۰ ہزار بتائی ہے اور اسی کی تحریر کے بموجب ۲۰ ہزار ہی امین الدولہ کے پاس تھیں [5] یہ ترکی کے بہت سے کتب خانوں میں سے چند کے ذخائر کی تعداد ہے۔

[6] اسلامی کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد دیکھنے کے بعد یورپ پر بھی ایک نظر ڈالئے جہاں قرون وسطیٰ میں بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی کتابیں میسر نہ تھیں۔ چند صد کتابوں کا کہیں ایک جگہ جمع ہو جانا تو تعجبات سے تھا۔ ملکہ ازابیلا کے کتب خانہ میں دو سو ایک کتابیں تھیں۔ جن میں سے آٹھ تو صرف دینیات کی تھیں۔ فرانس کے شاہی کتب خانوں کی جب بنا ڈالی گئی تو نو سو کتابوں سے زیادہ جمع نہ ہو سکیں۔ ان میں سے کتب مذہبی کی ایک پوری الماری بھی نہ تھی۔ (اقتباساً از اخبار الاندلس جلد سوم و تمدن عرب موسیو لیبان)

ہوجائیگی غور فرمائیے کہ اس زمانہ میں کتابوں کی اتنی کثیر تعداد جمع کرلینا ایک بے نظیر کارنامہ کہا جاسکتا ہے

کتابوں کی تعداد پڑھتے وقت یہ تین باتیں پیش نظر رکھئے۔ پہلی بات یہ کہ اس زمانہ میں ایک کتاب کے بہت سے نسخے رکھنے کا رواج تھا جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔ مثلاً قاہرہ کے کتب خانہ خزائن القصور میں خلیل بن احمد کی کتاب العین "کے تیس ۳۰ نسخے اور تاریخ طبری" کے بارہ سو نسخے تھے۔ ایسی ہی تعداد اور کتب خانوں میں بھی تھی۔ نسخوں کی اس کثرت کی وجہ یہ تھی کہ یہ مختلف اعتبار سے خصوصی حیثیت رکھتے تھے کوئی مصنف کی شخصیت اور اس کے ہاتھ سے لکھے ہونے کے باعث، کوئی کاتب کی فنی حیثیت اور کتابت کی قدامت، کوئی کتاب کی خوبصورت نقاشی و جلد بندی اور کوئی کتاب کے مصور ہونیکی وجہ سے ممتاز ہوتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ اُس زمانہ کے لحاظ سے ایک ہی طرح کے کتاب کے بھی بہت سے نسخے رکھنا اشد ضروری تھا کیونکہ جب کوئی کتاب گم ہو جاتی تو اسے دوبارہ حاصل کرنا جتنا دشوار ہوتا اس کا اندازہ وزیر ابن عمید کے صرف ایک فقرے سے ہو جائیگا۔ جب ایک موقع پر فوجیوں نے اس کے مکان کا سارا سامان لوٹ لیا تو اسے یہ معلوم ہوکر بڑی مسرت ہوئی کہ اس کا کتب خانہ محفوظ رہ گیا ہے اس وقت اس نے یہ فقرہ کہا تھا کہ "ہر چیز جو ضائع ہو گئی ہے۔ مل سکتی ہے لیکن کتاب نہیں مل سکتی۔"

تیسرے یہ کہ جتنی کثیر تعداد میں کتابیں اسلامی کتب خانوں میں تھیں اتنی قرون وسطیٰ میں جمع کرلینا کوئی آسان کام نہ تھا اس زمانہ میں کتابیں حاصل کرنے میں جو غیر معمولی دقتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں ان کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود مسلمانوں کے علمی و کتابی ذوق نے اپنے کتب خانوں کو دنیا بھر کے علوم کا مخزن بنا دیا تھا ان میں قرآن و حدیث کے مُطلّا و مُذہّب نسخوں کے ساتھ ساتھ تاریخ، سوانح، ادب، فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم وغیرہ کی کتابیں جمع تھیں یہاں قدیم کتابوں کے نایاب و کمیاب نسخے اور یونانی، رومی اور ہندی حکماء کی تصانیف کے عربی ترجمے موجود تھے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی کتب خانے صرف مسلمانوں ہی کی ثقافتی سرگرمیوں کے مرکز نہ تھے بلکہ غیر مسلموں کے علمی سرمایہ کے بھی امین تھے چنانچہ ان کے طفیل سے سینکڑوں قدیم کتابیں تلف ہونے سے بچ گئیں۔

کتب خانوں کے اقسام

مسلمانوں کے قومی مزاج میں علم دوستی ایسی سرایت کر گئی تھی کہ سماج کے ہر طبقہ نے کتب خانوں کے قیام میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا۔ سلاطین اور اُمراء نے انھیں اپنی سلطنت اور امارت کا لازمی جزو قرار دیا مشائخ و علماء نے ان کو اپنی ریاضت و عبادت کا حصہ بنایا اور عام شائقینِ علم نے کتابیں جمع کرنا اپنا محبوب مشغلہ سمجھا۔ اس طرح جو کتب خانے وجود میں آئے وہ سات قسم کے تھے۔ سلاطین کے کتب خانے، مسجدوں کے کتب خانے، خانقاہی کتب خانے، درس گاہی کتب خانے، عام کتب خانے، ذاتی کتب خانے، گشتی کتب خانے۔

گشتی کتب خانے

مسلمانوں سے پہلے گشتی کتب خانوں کا کوئی نشان نظر نہیں آتا ان کے اولین نقوش عہد اسلامی میں ملتے ہیں ہماری اس کتاب میں آپ کو ایسے عاشقانِ کتب ملیں گے جو کتابیں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور سفر ہو یا حضر، مصیبت ہو یا راحت کسی حال میں بھی انھیں کتابوں کی جدائی گوارا نہ تھی بعض بادشاہوں کے ساتھ تو دورانِ جنگ میں بھی ایک کتب خانہ رہتا تھا مگر کتابوں کے اس طرح گردش کرنے کا اس زمانہ میں کوئی نام نہ رکھا گیا تھا۔ یہ شکل جب اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی انیسویں صدی عیسوی میں پہنچی تو اس کا نام گشتی کتب خانے (MOBILE LIBRARIES) ہوا۔

عام کتب خانے

عام کتب خانے (پبلک لائبریریاں) مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہیں انھوں نے یہ اُس زمانہ میں قائم کئے تھے جب دنیا میں کتابوں کے استعمال پر کڑی پابندیاں عائد تھیں اور انھیں کتب خانوں میں مقید کر کے رکھا جاتا تھا قرونِ وسطیٰ میں یہ خصوصیت صرف اسلامی ممالک کو حاصل تھی کہ وہاں بڑے بڑے شہروں میں عام کتب خانے قائم ہوئے۔ اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے وجود میں آئے تھے اسلام نے مسلمانوں کو علم کی اشاعت اور اس کے حصول کی تاکید کرتے ہوئے اس حقیقت

سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ علم ہر انسان کی ملکیت ہے اور کتابیں استعمال کرنے اور پڑھنے
حق ہر شخص کو ملنا چاہیئے اس کی تعمیل میں جب مسلمانوں نے مدرسے اور کتب خانے قا
کئے تو ان کے اخراجات کے لئے جائدادیں اور وہاں پڑھنے کے لئے کتابیں بھی وقف کر دیں کی
یہ عقیدہ راسخ ہو گیا تھا کہ موقوفہ کتابوں کو جتنا پڑھا جائیگا اسی قدر واقف کو ثوا
ملیگا شروع میں یہ عمل صرف دینی کتابوں تک محدود رہا جب اسلام کے حلقہ میں طر
طرح کے علوم داخل ہو گئے تو اس عمل کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔ اس طرح کتابیں جمع کرنا ا
ان کے استعمال کی سہولتیں مہیا کرنا اسلامی تمدن میں شامل ہو گیا اور موقوفہ ذخائر
عام کتب خانوں کی شکل اختیار کر لی۔

عام کتب خانوں کے قیام کی ابتدا مسجدوں سے ہوئی جو اسلام کے ابتدائی دور میں
تعلیم گاہوں کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں اور ان میں موقوفہ کتابوں کے ذخیرے بھی
تھے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ کوفہ کے ایک ماہر لسانیات ابو عمر والشیبا
نے اپنی تصنیف کے نسخے مسجد میں رکھے تھے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم مصنفین اپ
تصانیف کے نسخے عوام کے استفادہ کے لئے اپنے محلہ یا شہر کی مسجد میں رکھ دیا کرتے تھے۔ جب
اسلامی کتب خانوں کا دائرہ وسیع ہوا تو یہ مسجدوں تک محدود نہ رہے بلکہ ان کے لئے علیٰ
عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ ہارون رشید کا بیت الحکمت پہلا عام کتب خانہ تھا جو باقاعدہ وسیع
پیمانہ پر بغداد میں قائم ہوا تھا اس کے بعد قاہرہ، شیراز، دمشق، غزنی، بخارا، اندلس او
ہندوستان میں صدہا عام کتب خانے کھل گئے صرف غرناطہ میں ستر عام کتب خانے تھے۔

فائیو لاز آف لائبریری سائنس ان کتب خانوں میں قارئین کو ہر قسم کی سہولتوں کے علاوہ قارئین کو ہر قسم کی آسانیاں میسر تھیں انکے لئے کاغذ قلم دوات بھی فراہم کئے جاتے تھے۔ دراصل وہ کتب
ان تمام خصوصیات کے حامل تھے جو ڈاکٹر رنگاناتھن نے اپنے اصول خمسہ[۵] میں آجکل کی لائبریریوں

۵ ڈاکٹر رنگاناتھن (سابق پروفیسر آف لائبریری سائنس دہلی یونیورسٹی) نے اپنی کتاب فائیو لاز آف
لائبریری سائنس (FIVE LAWS OF LIBRARY SCIENCE) میں مندرجہ ذیل پانچ اصو
پر لائبریری سائنس کی بنیاد رکھی ہے۔ (اگلے صفحہ ۲۲ پر)

کے لئے ضروری قرار دی ہیں اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی کتب خانے دَورِ حاضر کی لائبریریوں کے پیشرو تھے۔

درس گاہی کتب خانے

تعلیمی نظام میں کتب خانوں کی ہمیشہ بنیادی حیثیت رہی ہے مؤرخین کا بیان ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں میں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ اور ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ہوتا تھا مسجدوں کے علاوہ مشائخ کی خانقاہوں، علماء کے گھروں اور امراء کی ڈیوڑھیوں میں بھی مدرسے اور کتابوں کے ذخیرے ہوتے تھے

اسلام میں تعلیم و تدریس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت ہاتھوں سے پڑی۔ اسلامی یونیورسٹی کے پہلے معلم آپ ہی تھے۔ آپ نے مکی زندگی کے آلام و مصائب کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ فرمائی اور مصعب بن عمیرؓ کو معلم بنا کر مکہ سے مدینہ بھیجا تاکہ وہ وہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام کی تبلیغ کریں۔ ہجرت کے بعد جب مسجد نبوی تعمیر ہوئی تو وہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا اس کے بعد سنہ ۲ ھ میں جنگ بدر کے موقع پر جو قیدی گرفتار ہو کر آئے ان کی رہائی کا ایک فدیہ آپ نے یہ مقرر کیا کہ ہر قیدی دس

(بقیہ ۱۲ صفحہ کا) ۱؎ کتابیں برائے استعمال ہیں
1 - BOOKS ARE FOR USE

۲؎ (ہر پڑھنے والے کے لئے کتاب) یعنی لائبریری میں ہر فرد کو اس کے مطلب کی کتاب ملنی چاہیئے۔
2 - EVERY READER HIS BOOK. . . . . . .

۳؎ (ہر کتاب کے لئے پڑھنے والا) یعنی کتابیں لائبریری میں بند کر کے نہ رکھی جائیں بلکہ ان کا استعمال ہوتا رہے تاکہ ہر کتاب کو اس کا پڑھنے والا مل جائے۔
3 - EVERY BOOK ITS REDER. . . . . . .

۴؎ (پڑھنے والے کا وقت بچائے) یعنی لائبریری میں کتابوں کی ترتیب و تنظیم ایسی ہو کہ کتاب حاصل کرنے میں ریڈر کا وقت ضائع نہ ہو۔
4 - SAVE THE TIMEOF THE READER. . . . .

۵؎ (لائبریری ایک نامیاتی (بڑھنے والا) ادارہ ہے) یعنی لائبریری جامد ادارہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس میں برابر اضافے ہوتے رہیں اور وہ ترقی کرتی رہے۔
5 - LIBRARY IS A GROWING ORGANISM. . . . . . .

مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے ۔ کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابت نے انھی قیدیوں سے لکھنا سیکھا تھا ۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی اور مختلف شہروں میں معلمین کی جماعتیں بھیجی جاتی تھیں اس کے بعد بنو امیہ نے اپنی سلطنت میں درس کے بہت سے حلقے جابجا قائم کئے پھر بغداد کی عباسی مصر کی فاطمی اور اندلس کی اموی سلطنتوں میں مدارس کی اتنی کثرت ہوئی کہ صرف ایک شہر قرطبہ میں آٹھ سو مدرسے تھے اب تعلیم کا چرچہ اتنا عام ہوگیا تھا کہ بغداد میں امام احمد بن حنبل کے استاد یزید بن ہارون کے درس حدیث میں ستر ہزار اشخاص شریک ہوتے تھے اور سلیمان ابن حزب کے املائے حدیث میں حاضرین کی تعداد چالیس ہزار تک ہوجاتی تھی ۔ خلیفہ مامون بھی اس درس میں شریک ہوا کرتا تھا ۔

اس قسم کی بے نظیر مثالیں حلقۂ خواتین میں بھی ملتی ہیں ۔ فخرالنساء جب بغداد کی مسجد میں ادب پر لکچر دیتی تو بے شمار سامعین ان سے استفادہ کرتے تھے حضرت نفیسہؒ ایسی عالمہ و فاضلہ تھیں کہ امام شافعیؒ ان کے درس میں شریک ہوتے تھے کریم بنت احمد سے علامہ خطیب بغدادی صحیح بخاری کا درس لیا کرتے تھے احادیث کے راویوں میں حضرت عائشہؓ کا مرتبہ اتنا بلند و افضل تھا کہ ۔ ۲۲۱ احادیث ان سے مروی ہیں ۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بھی علم حدیث میں خصوصی مقام رکھتی تھیں ۔ ان سے ۳۷۸ ۔ احادیث مروی ہیں اور حضرت ام سلیم کی نسبت تو یہ لکھا ہے کہ حضرت انسؓ عبداللہ بن عباسؓ ۔ زید بن ثابتؓ اور عمرو بن عاصم جیسی بلند شخصیتوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں ۔ اندلس میں ام سعد ایک مشہور محدثہ تھیں ۔ خاندان موحدین کی شہزادی ولیدہ شاعری اور علم بلاغت میں خاص شہرت رکھتی تھی ۔ اشبیلیہ کی دو خواتین عصنیہ اور صفنیہ کو شعر و ادب میں بڑا امتیاز حاصل تھا

اسلامی[1] مدارس کی تاریخ میں چوتھی اور پانچویں ہجری بہت اہم ہے ۔ چوتھی صدی ہجری میں جامعہ ازہر کا قیام بمقام قاہرہ عمل میں آیا ۔ پانچویں صدی ہجری میں نیشاپور میں بڑے بڑے مدرسے کھلے اسی زمانہ میں خواجہ نظام الملک طوسی نے مدرسہ نظامیہ بغداد میں قائم

[1] علامہ شبلیؒ نے رسائل شبلی میں اسلامی مدارس کا مفصل حال لکھا ہے اور ان کی فہرست بھی دی ہے ۔

کیا اس علم دوست وزیر کا نام اسلامی مدارس کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اس نے تعلیم کی مد پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ طلبا کے لئے وظائف مقرر کئے اور یہ حکم جاری کیا کہ "تمام اسلامی ممالک میں جہاں جس جگہ کوئی ممتاز عالم ہو اس کے لئے ایک مدرسہ اور ہر مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کیا جائے چنانچہ اُس زمانہ میں سینکڑوں مدرسے اور کتب خانے قائم ہو گئے جن میں مدرسہ نظامیہ بغداد۔ مدرسہ نظامیہ نیشاپور۔ مدرسہ نظامیہ اصفہان مدرسہ نظامیہ موصل۔ مدرسہ نظامیہ بصرہ بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح محمود غزنوی۔ نورالدین زنگی۔ صلاح الدین ایوبی اور دوسرے حکمرانوں نے بھی اپنی اپنی قلمرو میں مدرسے قائم کئے اور ان کے لئے بہت سی جاگیریں وقف کیں۔ غرض چھٹی صدی ہجری تک غزنی سے لے کر قرطبہ تک مدرسے اور تعلیمی کتب خانے پھیل گئے تھے۔ مورخ ایچ جی ویلز کے الفاظ میں "اس وقت بصرہ۔ کوفہ۔ بغداد۔ قاہرہ۔ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں علم و حکمت کے مرکز تھیں اور تمام جہاں میں نور پھیلا رہی تھیں"

مساجد میں حلقہ ہائے درس درس گاہی کتب خانوں کے سلسلہ میں مساجد کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ وہ عہد نبوی اور اس کے بعد مدتوں مسلمانوں کی تعلیمی، تمدنی اور سیاسی سرگرمیوں کی اہم مرکز بنی رہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جس سرزمین پر قدم رکھتے وہاں فوراً مسجدیں تعمیر کر لیتے اور ان کے ساتھ مدرسے اور کتب خانے بھی منسلک کر دیتے تھے۔ چنانچہ تمام دنیا کی مسلم آبادیاں بے شمار مسجدوں سے معمور ہوتی چلی گئیں۔ اسے یاد رکھیئے کہ مساجد میں جو حلقہ ہائے درس قائم ہوئے ان میں حاضرین کی جو کثیر تعداد رہی اور اساتذہ نے جس خلوص و ایثار کے ساتھ اپنے فرائض ادا کئے وہ تعلیمات کی تاریخ کا نہایت روشن اور بڑا حیرالعقول باب ہے۔[1]

مختصر یہ کہ قرونِ وسطیٰ میں مسجدوں کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک شہر اسکندریہ میں بارہ ہزار اور قرطبہ میں آٹھ سو[2] مساجد تھیں اور بغداد میں ان کی کثرت کا یہ

---

[1] ڈاکٹر احمد شلبی کی ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن ص۴۹ اسی میں مساجد کے حلقہ ہائے درس کی تفصیلات دیکھئے۔ [2] مولانا اکبر شاہ خان کی تاریخ اسلام۔ ج۔ سوم۔

عالم تھا کہ تیسری صدی ہجری میں وہاں تیس[1] ہزار مسجدیں تھیں چونکہ ہر مسجد کے ساتھ مدرسہ اور کتب خانہ ہوا کرتا تھا اس لیے جہاں جتنی مسجدیں تھیں اتنے ہی مدرسے اور کتب خانے تھے۔

دراصل مساجد کا موضوع بھی بڑا وسیع ہے لیکن یہاں اختصار کیساتھ تین مساجد کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

ان تین میں قدیم ترین مسجد مصر کی جامع عمرؓ ہے جسے ۲۱ھ میں فاتح مصر عمرو بن العاصؓ نے تعمیر کرایا تھا اس میں درس و تدریس کے علاوہ مجالس علمی بھی منعقد ہوا کرتی تھیں حضرت حسن بصریؒ بھی یہاں درس دیا کرتے تھے تقریباً چالیس حلقہ ہائے درس اس میں قائم تھے۔

بغداد کی مسجد جامع منصور کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ مسجد اہل علم کا مرکز تھی۔ اور یہاں ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسہ تھا۔ جامع دمشق بھی ایک بڑا تعلیمی مرکز تھی۔ اس مسجد میں جو حلقہ ہائے درس قائم تھے ان کا ذکر اگلے صفحات میں دمشق کے تحت کر دیا گیا ہے اس مسجد کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ اسے قرون وسطیٰ کے چار عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان مساجد کی شان[2] و شوکت بیان کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں مگر اس کا کچھ اندازہ ان رقومات سے ہو جاتا جو ان کی شاندار تعمیرات پر صرف کی گئیں۔ مثال کے طور پر جامع منصور کو دیکھئے جس کی تعمیر پر کتنے کروڑ دینار صرف ہوئے تھے۔

اور یہاں یہ بھی واضح کر دینا ہے کہ اس کتاب میں قارئین کو جہاں مدارس کا ذکر ملے اور ان کے کتب خانوں کا نہ ملے وہاں بھی انھیں موجود سمجھا جائے یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مؤرخین نے اکثر مدارس کے ساتھ ان کے ملحقہ کتب خانوں کا ذکر نہیں کیا حالانکہ دونوں کی لازم و ملزوم حیثیت کو ہر عہد میں تسلیم کیا گیا ہے اور یہ حقیقت بھی مان لی گئی ہے کہ کتب خانوں کے بغیر درس و تدریس کے فرائض صحیح معنوں میں ادا نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہدینا ہے کہ مدارس اور کتب خانوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے مساجد کی تعداد کو پیش نظر رکھا جائے۔

---

[1] ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن۔ ص ۷۴۔

[2] مساجد کی شان و شوکت اور تعمیرات کی تفصیلات اور ان کی تصاویر تمدن عرب میں دیکھئے۔

کتب خانوں کا نظام

اسلامی کتب خانوں کا نظام دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ آج سے ایک ہزار برس
پہلے مسلمانوں نے اپنے کتب خانوں کے لئے جو نظام قائم کیا تھا موجودہ عہد کم و بیش اسی
نظام پر گامزن ہے کتب خانوں کے نظم و نسق کے لئے مخصوص محکمے قائم تھے جن کے اخراجات
کے واسطے باقاعدہ بجٹ بنایا جاتا تھا۔ اس کی تنظیم کے ہر شعبہ مثلاً کتابوں کی فراہمی، کتابوں کی
فہرست سازی، کتابیں مستعار دینے، کتابوں کی ترتیب و نگہداشت، کتابوں کی جلد بندی،
کتب خانہ کی عمارت کی حفاظت و آراستگی وغیرہ پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

بجٹ کا ایک نمونہ چوتھی صدی ہجری میں فاطمی خلیفہ الحاکم کے کتب خانہ کے سالانہ
اخراجات کا یہ بجٹ[1] دیکھئے جس سے کتب خانوں کے نظم و نسق
حسن اور اس کی باقاعدگی و پختگی کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

لائبریرین کی تنخواہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۸ دینار
کاتبوں کے لئے کاغذ۔ (غالباً اس میں ان کی تنخواہیں بھی شامل ہیں) ۔ ۹۰ دینار
فراش کی تنخواہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۵ دینار
کتابوں اور شکستہ اوراق کی مرمت کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ دینار
کاغذ، قلم اور سیاہی کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ دینار
پانی بھروائی کی اجرت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰ دینار
چٹائیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰ دینار
اونی قالین موسم سرما کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ دینار

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۔ ج ۔ ۲ ص ۱۰۴۷ ۔

گدّے ایام سرما کے لئے ۔ . . . . . . ۴ دینار
دروازوں کے پردوں کی مرمت کے لئے ۔ . . . . ۱ دینار

کل ۲۰۷ دینار

کتابوں کی فراہمی

کتب خانے کے کاموں میں پہلا اہم کام کتابوں کی فراہمی ہے اور اسی پر ان کی توسیع و ترقی کا دارومدار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کاغذ کی صنعت اور چھپائی کے فن کو ترقی نہ ہوئی تھی طباعت و اشاعت اور رسل و رسائل کی آسانیاں میسر نہ تھیں۔ کتابیں کمیاب اور نایاب تھیں اور ان کے حصول کے لئے بڑی جد و جہد کرنی پڑتی تھی ابن المقری نے ابن فضالہ کے ایک نسخہ کی خاطر ستر منزل یعنی ۸۴۰ میل کا سفر کیا تھا[1] اور سفر بھی کیسا جو سقر کا نمونہ تھا لیکن اپنے شوق کی دھن میں اُن لوگوں کو سفر کی صعوبتیں گراں نہ گذرتی تھیں اور ان مشکلات کے باوجود کتابیں جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو حاصل کی جاتی تھیں۔ عام طور پر کتابوں کی فراہمی کے وسائل حسب ذیل تھے۔

(۱) بادشاہوں کے پاس ہدیوں اور تحفوں میں کتابیں آتی تھیں۔
(۲) تاجروں سے کتابیں خریدی جاتی تھیں۔
(۳) نقل نویسوں سے کتابوں کی نقلیں کرائی جاتی تھیں۔
(۴) غیر زبانوں کی کتابیں حاصل کرکے ان کے ترجمے کرائے جاتے تھے۔
(۵) فتوحات کے موقع پر کتابیں بطور مال غنیمت دستیاب ہوتی تھیں۔
(۶) سفیر و سیاح اپنے ملک کی کتابیں لاتے اور تبادلہ میں کتابیں لے جاتے تھے۔
(۷) حاجیوں کے ذریعہ کتابیں منگائی جاتی تھیں۔

کتابوں کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ حج تھا اسلام نے حج کے دوران تجارت کرنے کی اجازت دیدی ہے اس لئے اس بین الاسلامی اجتماع کے موقع پر کتابوں کی تجارت کی راہیں بہت زیادہ وسیع ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ زمانۂ حج کیلئے تاجر اور دلال الکتب (کتابوں کے ایجنٹ)

---

[1] علمائے سلف ص ۱۸ یہ گذشتہ علمائے اسلام کے حالات میں وہ تاریخی کتاب ہے جو مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ندوۃ العلماء کے چوتھے سالانہ جلسے (۱۳۱۴ھ) شہر میرٹھ میں پیش کی تھی۔

[کت]ابوں کے ذخیرے مخصوص طور پر فراہم کر کے رکھتے اور شائقین کتب ان دنوں کا بیقراری [کے] ساتھ انتظار کرتے رہتے تھے خاص طور پر یہی وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں کتابیں حسب [مذ]اق وانتخاب آسانی سے میسر آجاتی تھیں۔

بہرحال کتابوں کی فراہمی کے لئے ایک باقاعدہ نظام قائم تھا اور اس سلسلہ میں [بے] انتہا روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ کتابوں کی تلاش وجستجو کے لئے بادشاہوں اور امراء کی طرف [س]ے گماشتے مقرر کئے جاتے تھے جنہیں یہ حکم تھا کہ جس قیمت پر جہاں کوئی کتاب ملے فوراً خرید [لی] جائے۔ یہ گماشتے کتابیں خریدتے، ناقابلِ حصول کتابوں کی نقلیں کراتے اور زیرِ تصنیف [کت]ابوں کے بارے میں اطلاعات دیتے رہتے تھے اس زمانہ میں کتابوں کی کوئی قیمت مقرر نہ تھی۔ [کت]اب کی نوعیت اور خریدار کے شوق پر قیمت کا انحصار تھا کتابوں کے شیدائی تاجروں [کو] منہ مانگے دام دیتے اور تحفہ کے طور پر کتابیں دینے والوں کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے [ا]س زمانہ میں کتابوں کی گرانی کا یہ حال تھا کہ خلیل ابن احمد کی کتاب العین کا ایک نسخہ چالیس [دین]ار میں بکا طبری کی تاریخ کا نسخہ سو دینار میں فروخت ہوا[^۵۲] اندلس کے خلیفہ حکم ثانی نے کتاب الاغانی [کے] مصنف ابوالفرج اصفہانی کو ایک ہزار دینار[^۵۳] عطا کئے تھے اس خلیفہ کی طرف سے یہ اعلان [کر] دیا گیا تھا کہ "جو مصنف کوئی نئی کتاب تصنیف کر کے امیر المومنین کے حضور میں پیش کریگا [و]ہ بیش قرار انعام پائے گا۔"

اسلامی ممالک میں کتابوں کا جو احترام کیا جاتا تھا اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا [ہو] سکتا ہے کہ جنگ کی خوں ریزیاں اور فتح ونصرت کی شادمانیاں بھی اس احترام پر غالب

---

[^۵۲]: کتاب الفہرست ص ۴۲
[^۵۳]: مقریزی ج ۱۔ ص ۴۰۸ } بحوالہ اولگا پنٹو ص ۶۔ اطالوی خاتون مس اولگا پنٹو نے اسلامی

[کت]ب خانوں پر ایک مضمون اطالوی زبان میں لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر کرینکو نے انگریزی میں کیا اس کے [بع]د قاضی احمد میاں جوناگڑھی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو اسلامی کتب خانے (عہد عباسیہ) کے نام سے [مطبع] المناظر پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا یہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ حوالوں میں جہاں کہیں [او]لگا پنٹو کا نام آیا ہے اس سے یہی کتاب مراد ہے ۳ ایک دینار دس شلنگ کا برابر ہے۔

نہ آتی تھیں بمسلم فتوحات کتابوں کے حق میں رحمت ثابت ہوتیں جب مالِ غنیمت میں کتابیں ملتیں تو انھیں بصد احترام کتب خانوں میں محفوظ کر دیا جاتا اور ترجمے کرا کے ان کی قدر و قیمت بڑھائی جاتی تھی اس طرح ہر علم و فن کی بہترین کتابیں اسلامی کتب خانوں میں پہنچ جاتی تھیں۔

فہرست سازی کتب خانوں میں کتابیں استعمال کرنے کی سہولت بہم پہنچانے کے لئے کتابوں کی فہرست (CATALOGUING) کی جاتی تھی۔ تقریباً ہر کتب خانہ میں کٹلاگ (فہرست کتب) مجلد رجسٹر کی شکل میں رہتے تھے مثلاً اندلس کے خلیفہ الحکم ثانی کے کتب خانہ کی فہرست ۴۴ جلدوں پر مشتمل تھی اور صاحب بن عباد کے کتب خانہ کی فہرست کی دس جلدیں تھیں کتب خانہ مدرسہ محمودیہ (قاہرہ) کی فہرستوں میں ایک حروف تہجی کے اعتبار سے اور دوسری مضمون وار مرتب کی گئی تھی۔ فہرست مرتب کرنے کیلئے اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی مقرر کئے جاتے تھے۔ بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرست سازی کا کام ماہرین علوم کے سپرد ہوتا تھا چنانچہ قاہرہ کے شاہی کتب خانہ کی ہیئت اور نجوم کی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے مصر کے ایک مشہور ہیئت داں[1] ابن البندی کو مامور کیا گیا تھا اور کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کی فہرست ابن حجر عسقلانی نے مرتب کی تھی جو چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔

فہرستوں کے علاوہ الماری کے ہر خانہ کے باہر کی طرف ایک پرچہ چسپاں رہتا تھا جس میں اس خانہ کی کتابوں کے نام وغیرہ لکھے ہوتے تھے ان میں کتابوں کے ناقص یا مکمل ہونے کی کیفیت بھی درج ہوتی تھی۔ بعض ایسے بھی کتب خانے تھے جن میں ہر کمرے کے دروازے پر اس کمرہ کی کتابوں کی فہرست لگی رہتی تھی اس طریقہ کار سے بھی قارئین کو کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی تھی۔

جہاں تک فہرستوں میں اندراجات کا تعلق ہے یہ بڑے احتیاط و توجہ سے کئے جاتے تھے۔ اور یہ بڑا خیال رکھا جاتا تھا کہ کوئی کتاب درج ہونے سے رہنے نہ پائے۔ مامون رشید کی

---

[1] تمدن عرب (ص ۴۲۴) میں ہے کہ جس وقت وزیر ابوالقاسم علی بن احمد جرجانی نے مصر کے کتب خانہ شاہی کی فہرست بنوانی شروع کی تو اس نے ابن البندی (متوفی ۴۳۵ھ) کو ہیئت کی کتابوں اور آلات کی فہرست بنانے کا حکم دیا۔

یت ڈاکٹر احمد شلبی نے لکھا ہے کہ جب اس نے ایک کتاب معلوم کرنے کے لئے اپنے کتب خانہ
فہرست طلب کی اور اس میں اس کا نام نہ ملا تو خلیفہ نے بڑی حیرت سے دریافت کیا کہ ایسی
اب درج ہونے سے کیسے رہ گئی۔

اس طرح کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ کتب خانوں کے معاملہ میں اس زمانہ کے مسلمانوں
شعور اپنی ہمعصر قوموں سے بہت بڑھا ہوا تھا اور انھیں اس کا پورا احساس تھا کہ
ب خانوں کی افادیت کا انحصار کیٹلاگ پر ہوتا ہے۔ کتاب کے تمام حسن و قبح اس کی ندرت،
یت و ضخامت، اس کے مضمون کی نوعیت غرض اس کی پوری کیفیت مشترح کیٹلاگ ہی
ذریعہ واضح کی جاسکتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں سے پہلے بھی کتب خانوں میں
ٹلاگ موجود تھے۔ دنیا کے قدیم ترین کتب خانہ اسکندریہ کا کیٹلاگ اس بات کا پکا
ت ہے کہ زمانۂ قدیم سے کیٹلاگ مرتب کرنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے لیکن قرونِ وسطیٰ
مسلمانوں نے اس فن میں جو قابل قدر اضافے کئے انھیں مورخین نے بڑا سراہا ہے۔ مورخ
ناٹ اندلس کے کتب خانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "فہرست کتب میں صرف کتابوں
کے نام نہ ہوتے تھے بلکہ مصنف کا نام، ولدیت اور تاریخ ولادت اور وفات بھی لکھی جاتی
۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اور دلچسپ باتوں کے ساتھ مصنف کی مختصر سوانح عمری بھی
ج کی جاتی تھی۔"

اب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرونِ وسطیٰ کے اسلامی کتب خانوں کے
ٹلاگ عہد حاضر کی کیٹلاگ سازی کے لئے بڑے رہنما ثابت ہوئے ان میں جو جامع و مُشترح
اجات کئے جاتے تھے اور ان کی ترتیب جس طرح فن وار اور حروف ہجی کے اعتبار سے ہوتی
اسی کی ترقی یافتہ شکل آج کل کلاسی فائڈ اور ڈکشنری کیٹلاگ کہلاتی ہے اور یہ دونوں اب
کے ہر کتب خانہ کی جان سمجھے جاتے ہیں۔

فہرست

فہرست سازی کی تاریخ میں علامہ ابن ندیم کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا
انھوں نے اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے عربی کتابوں کی ایک
یت جامع فہرست "الفہرست" کے نام سے مرتب کر کے علمی دنیا کے سامنے ببلیو گرافی کا

ایک نمونہ پیش کر دیا تھا۔ اس الفہرست کو "دنیا کا پہلا اور بڑا گراں بہا تذکرہ کہا گیا ہے"
ابن ندیم کو فہرست سازی کے علاوہ علوم وفنون میں بھی مہارت حاصل تھی وہ خوش نویس
اور وراق تھا، کتابوں کی نقل اور تصحیح بھی کیا کرتا تھا۔ مگر اس کی ناموری اور بڑائی کا
موجب یہ الفہرست[2] ہوئی ہے۔

اِستعارۂ کتب

کتب خانوں کا ذخائر سے استفادہ کرنے اور انھیں مُستعار دینے کی سہولتیں فراہم کرنے کی بھی اصل محرک تعلیم محمدی ہی
ہے، علم کو عام کرنے والوں اور تشنگانِ علوم کو سیراب کرنے والوں کو جن برکتوں اور سعادتوں
کی بشارتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہیں وہ اسلامی کتب خانوں میں روح کی طرح
کام کر رہی تھیں ان ہی کا یہ اثر تھا کہ بغداد، قاہرہ، شیراز، طرابلس، موصل، اور قرطبہ کے
کتب خانوں سے استفادہ کی عام اجازت تھی۔ اکثر ذاتی کتب خانوں کے مالک بھی اتنے فیاض
تھے کہ انھوں نے اپنے کتب خانوں سے مستفید ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کتب خانوں میں
کتابیں مطالعہ کے لئے دی جاتی تھیں اور صرف یہی نہیں بلکہ انھیں مستعار بھی دیا جاتا تھا۔
بقول اولگا پنٹو علماء اور طلباء کی سہولت کے لئے پبلک کتب خانوں سے دور دراز مقامات
تک کتابیں بھیجی جاتی تھیں اس کے لئے کبھی کبھی کوئی رقم ضمانت کے طور پر جمع کرائی جاتی تھی
مگر مشہور ومعروف اہل قلم کو اس قاعدے سے مستثنیٰ بھی کر دیا جاتا تھا چنانچہ یاقوت حموی
مصنف معجم البلدان کو مرو کے ایک کتب خانے سے دو سو کتابیں بلا ضمانت مُستعار
دی گئی تھیں۔ ایک اندلسی مورخ ابن حیان (متوفی ۴۶۹ھ) کا بیان ہے کہ "جس کتاب
کی مجھے ضرورت ہوتی تھی میں کسی کتب خانہ سے منگوا لیا کرتا تھا" اس سلسلہ میں ایک یہ
خاص بات کہی گئی ہے کہ جب کسی کتاب کو مستعار لینے کے لئے ایک سے زیادہ خواہش مند
ہوتے تو ان میں جو غریب ہوتا اسے ترجیح دی جاتی تھی۔

استعارۂ کتب کے لئے کچھ قواعد وضوابط بھی مقرر کر دیے گئے تھے مثلاً مُستعار لی

---

[1] محمد بن اسحاق بن ندیم (متوفی ۳۸۵ھ مطابق ۹۹۵ء)
[2] اس کا ترجمہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہوا ہے۔

ہوئی کتاب حفاظت سے رکھی جائے، اس پر کچھ نہ لکھا جائے، اسے کسی اور شخص کو مستعار نہ دیا جائے وہ کہیں بطور ضمانت نہ رکھی جائے، کتاب واپس کرنے میں غفلت نہ کی جائے، تقاضے پر کتاب فوراً واپس کر دی جائے۔

جو لوگ کتاب واپس نہیں کرتے تھے ان پر اخلاقی و معاشرتی دباؤ بھی ڈالے جاتے تھے عربی میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کتابیں واپس نہ کرنے والوں پر لعنت و ملامت کی گئی ہے۔ اور طنز کے قلمی نشتروں سے ان کے دلوں پر چوکے لگا کر انھیں کتاب واپس کرنے کی طرف راغب کیا گیا ہے چنانچہ دسویں صدی ہجری کا ایک شاعر ابن القارم اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

"جو شخص میری کتاب لے کر واپس نہیں کرتا وہ رذیل اور دغاباز آدمی ہے"

قارئین کیلئے سہولتیں

ان کتب خانوں میں ایک طرف کتابیں مستعار دینے کی سہولتیں اور رعایتیں دی جاتی تھیں اور دوسری طرف قارئین کے لئے کتب خانہ کے اندر مطالعۂ کتب کی سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی جاتی تھیں اور ان کے آرام و سکون کا بھی بڑا خیال رکھا جاتا تھا ان کے لئے دار المطالعوں میں عمدہ اور آرام دہ فرش بچھائے جاتے تھے اور بعض کتب خانوں میں تو اتنے اعلیٰ پیمانہ پر سہولتیں فراہم تھیں جن کی نظیر آجکل کے کتب خانوں میں بھی نہیں ملتی۔ مثلاً فاطمی خلیفہ الحاکم کے کتب خانہ (قاہرہ) میں قارئین کو قلم دوات اور کاغذ بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ علی بن یحیٰی کے کتب خانہ خزائن المقصور (بغداد) میں مختلف ممالک سے جو لوگ کتابیں مطالعہ کرنے آتے تھے ان کی مہمان نوازی بھی کیجاتی تھی۔ ابو علی بن سوار کے کتب خانہ (بصرہ) میں جو طلباء وغیرہ کتابیں مطالعہ کرنے یا نقل کرنے جاتے ان کے لئے بانیٔ کتب خانہ کی طرف سے کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ قرطبہ کے ایک مدرس ابن حزم بھی اتنے فراخدل تھے کہ ان کے کتب خانہ سے اہل علم عام طور پر استفادہ کر سکتے تھے۔

استفادۂ کتب کے لئے وسیع سہولتوں کی فراہمی بھی اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا میں کتابوں کے فیوض عام کرنے کا رجحان بہت بڑھا ہوا تھا۔

عمارات

کتب خانوں کے لئے علیحدہ عمارتیں بھی تعمیر کرائی جاتی تھیں ان میں قاہرہ، شیراز اور قرطبہ کے کتب خانوں کی عمارات نہایت وسیع اور شاندار تھیں

علامہ بشاری اور مقدسی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قاہرہ میں خلیفہ العزیز کے کتب
کی عمارت اٹھارہ کمروں پر مشتمل تھی اور ہر کمرہ میں اٹھارہ ہزار کتابیں رکھنے کی گنجائش
شیراز میں عضد الدولہ کا کتب خانہ جس شاہی محل کے حصہ میں تھا اس کی عمارت عظ
وشان میں بہشت کے نمونہ کے موافق کہی گئی ہے۔ ان عمارات میں کمروں کی تقسیم یوں
دار الکتابت۔ وہ کمرے جو کاتبوں اور نقل نویسوں کے لئے مخصوص تھے دار المطالعہ
کتابیں مطالعہ کرنے والے فرش پر مشرقی طرز سے چار زانو بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں مصرو
رہتے تھے۔ علمی مجالس کے لئے علیحدہ کمرے ہوتے تھے اور کہیں کہیں موسیقی کے لئے بھی کمرے
کتابیں گیلریوں یا کمروں[1] میں رکھی جاتی تھیں تمام کمروں میں چٹائیاں اور قالین وغیرہ
رہتے تھے اور وہ ہر طرح سے آراستہ ہوتے تھے دروازوں پر پردے ڈالے جاتے تھے
میں ہوا سے بچنے کے لئے صدر دروازہ پر ایک بھاری پردہ ہوتا تھا۔

کتب خانہ قرطبہ کی عمارت کا اندرونی منظر

مورخ اسکاٹ نے قرطبہ کے کتب خانہ کی عمارت کا جو اندرونی منظر پیش کیا ہے اس سے بھی یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان اپنے کتب خانوں کے بنانے اور سنوارنے کا اہتمام کس دل نواز انداز سے کیا کرتے تھے وہ لکھتا ہے۔

> اندلس[2] کے خلیفہ حکم ثانی کے کتب خانہ کی عمارت شان وشوکت میں قصر شاہی سے کم نہ تھی اس کا فرش نہایت قیمتی سنگ مرمر کا تھا۔ دلواریں اور چھتیں بہترین سنگ رخام کی جن پر سنگ سبز اور سرخ کی پچی کاری تھی۔ الماریاں نہایت قیمتی صاف شفاف لکڑیوں کی تھیں ان میں سے بعض لکڑیوں کو اس لئے انتخاب کیا گیا تھا کہ وہ مشکل الحصول تھیں اور بعض کو اس لئے کہ ان سے نہایت لطیف خوشبو نکلتی تھی۔ ہر ایک الماری پر سونے کے پتروں سے لکھا ہوا تھا کہ اس الماری میں کس مضمون کی کتابیں ہیں۔ جگہ جگہ دلواروں

---

[1] کتابیں رکھنے کے کمرے آجکل اسٹیک روم (STACK ROOM) کہلاتے ہیں۔
[2] اخبار الاندلس ج ۱۔ ص ۶۷۵۔

پر مختلف لوگوں کے اقوال سنہرے حروف میں لکھے ہوئے تھے تاکہ ان کو دیکھکر
لوگوں میں علم کا شوق اور بڑے بڑے علماء اور شعراء کے قدم بقدم چلنے کا خیال
پیدا ہو دار الکتابت میں ایک فوج کی فوج کاتبوں اور جلد بندوں کی مقرر تھی
بہترین کتابوں پر سونا چڑھایا جاتا تھا۔ اور ان کو نقش و نگار سے مزین کیا
جاتا تھا۔ اس صنعت میں وہ لوگ ایسی کاریگری دکھاتے تھے کہ ابتک ان کی
نقل نہ ہو سکی اور نہ ہو سکے گی۔"

کتابیں رکھنے کا طریقہ اور ان کی ترتیب

لائبریری کی عمارت میں کتابیں رکھنے کے لئے قدآدم الماریاں ہوتی تھیں جن میں کتابیں آجکل کی طرح کھڑی کرکے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اوپر تلے رکھی جاتی تھیں الماری کے باہر کے حصہ میں ایک پرچہ چسپاں کر دیا جاتا تھا جن پر کتابوں کا نام وغیرہ درج ہوتا تھا الماریاں بالعموم کھلی رہتی تھیں لیکن قیمتی کتابیں مقفل الماریوں یا صندوقوں کے اندر رکھی جاتی تھیں۔ ابن سینا نے نوح بن منصور کے کتب خانے میں صندوق رکھے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں بہت سے کمرے تھے اور ہر کمرے میں کتابوں کے صندوق رکھے تھے اور ہر فن کی کتابوں کے لئے جدا کمرے تھے۔

اس بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتب خانہ میں الماریوں کے بجائے صندوقوں میں کتابیں رکھی جاتی تھیں بہر حال اس سلسلہ میں یہ خیال رہے کہ جہاں کتابیں رکھنے کیلئے صندوق استعمال ہوتے تھے وہاں ان پر بھی کتابوں کے نام وغیرہ کا ایک پرچہ چسپاں رہتا تھا تاکہ مطلوب کتاب حاصل کرنے میں آسانی رہے۔

کتابوں کی ترتیب کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ آج کل کی طرح فن وار کی جاتی تھی گویا اس ترتیب کی افادیت کا احساس مسلمانوں کو اس وقت ہو گیا تھا جب کتابداری کا فن اپنے ارتقاء کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا۔

تجارت کتب

جب کتابی ذوق عام ہوا اور کتابوں کی مانگیں بڑھنے لگیں تو تجارت کتب کی طرف بھی لوگوں کا میلان ہوا۔ بڑے بڑے شہروں میں کتابوں کے تجارتی مراکز قائم ہوئے اور کتابوں کی دلالی کا پیشہ رائج ہو گیا۔ اسلامی تمدن

یہ پیشہ محترم سمجھا جاتا تھا کتب فروشوں کی فہرست میں ابو حاتم سجستانی اور یاقوت
حموی جیسے اہل علم کے نام بھی شامل ہیں۔ کتابیں تجارتی مراکز میں نیلام کے ذریعہ بھی فروخت
کی جاتی تھیں اور کتب فروشوں اور دلالوں کے پاس زر ضمانت رکھ کر بھی انھیں حاصل
کیا جا سکتا تھا کتب خانوں کی ترقی کے ساتھ کتابوں کی تجارت بڑھتی رہی چنانچہ
تیسری صدی ہجری میں بغداد کے اندر کتب فروشوں کی سو[1] دوکانیں تھیں اور چوتھی صدی
ہجری میں قرطبہ میں بیس ہزار سے زیادہ تاجران کتب[2] تھے۔ بغداد میں کتب فروشوں کے
بازار کو سوق الوراقین کہتے تھے۔

کاغذسازی

کتب خانوں کی توسیع میں کاغذسازی کی ترقی نے بڑی مدد دی۔
اسلام کے اولین دور میں مسلمان چمڑے پر بھی لکھتے تھے۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کے نام خط چمڑے پر ہی لکھوا کر ارسال کیا تھا۔ مدینہ منورہ کے
کتب خانہ شیخ الاسلام میں قرآن شریف کا ایک نسخہ شتر مرغ کی کھال پر اور تفسیر ابن عباس
کے اوراق ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے ہیں ان کھالوں کو اتنا پتلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ کاغذ
معلوم ہوتا ہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں قرآن کی شیرازہ بندی کرنے کے لئے
آیات جمع کی گئیں تو وہ کھجور کی چھالوں، جھلیوں، پتھر اور چمڑے کے ٹکڑوں اور ہڈیوں پر
لکھی ہوئی ملیں۔

جہاں تک کاغذ کا تعلق ہے وہ چین میں سائی لون (TS' AILUN) نے ۱۰۵ء[3] میں
ایجاد کیا تھا۔ مسلمانوں نے چینیوں ہی سے یہ فن آٹھویں صدی عیسوی میں سیکھا[4] اور پھر ان کی

---

[1] ونگا بنٹو ص ۵ [2] اخبار الاندلس جلد سوم ص ۶۹۰۔ ایس۔ پی اسکاٹ (S.P. SCOTT) کی ہسٹری
آف دی مورش ایمپائر ان یورپ HISTORY OF THE MOORISH EMPIRE IN EUROPE
کا اردو ترجمہ منشی خلیل الرحمٰن نے اخبار الاندلس کے نام سے کیا ہے۔ [3] ENCYCLOPEDIA
AMERICANA V. 21. P. 258 [4] ایک عربی امیر زیاد بن صالح نے ترکوں اور ان کے حلیف چینیوں
کی متفقہ فوج کو نہر طراز کے کنارے جولائی ۷۵۱ء میں شکست دے دی تھی اس لڑائی میں بہت سے چینی قیدی آئے
تھے جن میں سے کچھ کاغذ بنانا جانتے تھے ان سے عربوں نے یہ فن سیکھ لیا تھا۔

کے ذریعہ یورپ پہنچا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کاغذ کی قسمت مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں آگر جاگی۔ ان سے پہلے یہ فن عام نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے روئی سے کاغذ بنایا اور اس صنعت کو توسیع و ترقی دے کر یورپ تک پہنچا دیا۔

یہ خیال رہے کہ اسلامی دنیا میں کاغذ کی صنعت کی بنیاد آٹھویں صدی عیسوی میں بمقام سمرقند رکھی گئی تھی۔ اسی زمانہ میں ہارون رشید نے کاغذ سازی کا کارخانہ بغداد میں قائم کیا جسے صناعۃ الورّاقہ کہتے تھے پھر اندلس میں قرطبہ اور شاطبہ اس صنعت کے بہت بڑے مراکز بن گئے جہاں سے یورپ[1] کو بھی کاغذ جاتا تھا۔

اس صنعت کی رفتار ترقی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ سے بہت پہلے عرب کاغذ استعمال کرنے لگے تھے۔ لیڈن کے کتب[2] خانہ میں ابوعبید کی کتاب "غریب الحدیث" کا قلمی نسخہ ۲۴۳ھ (۸۵۷ء) کا لکھا ہوا وہ قدیم ترین عربی کتاب ہے جو کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔

اسلامی ممالک میں کاغذ کی ترقی سے یورپ میں کتابوں کی اشاعت پر نہایت گہرا اثر ہوا موسیولیبان[3] نے تحریر کیا ہے کہ "ازمنہ وسطی کے اہل یورپ ایک مدت تک صرف چمڑے پر لکھتے رہے اور یہ اس قدر گراں تھا کہ کتابوں کی اشاعت بخوبی نہ ہو سکتی تھی چند روز میں یہ اس قدر نایاب ہو گیا کہ یونان و روم کے رہبان بڑی بڑی قدیم تصنیفات کے حروف چھیل کر ان کے صفحوں پر اپنے مذہبی مسائل لکھنے لگے اگر عربوں نے کاغذ ایجاد نہ کیا ہوتا تو یہ رہبان کل قدیم تصنیفات کو جن کے وہ محافظ سمجھے جاتے تھے تلف کر دیتے"۔

کاغذ کے ساتھ چھاپے خانہ کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ فن طباعت بھی چینیوں کی ایجاد[4] ہے ۱۰۴۱ء میں پی سنگ نے ٹائپ[5] ایجاد کیا مگر چینیوں کے پیچیدہ رسم الخط کے باعث عام نہ ہو سکا اس کے بعد پندرھویں صدی عیسوی میں چھاپے خانہ کی ایجاد یورپ میں ہوئی اور ٹائپ بنایا گیا جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے چین میں سب سے پہلی کتاب ۸۶۸ء میں چھپی اور ہندوستان میں پہلی کتاب پرتگیزیوں نے ۱۵۵۶ء میں چھاپی تھی۔ کاغذ اور چھاپے خانہ کی یہ مختصر کیفیت پڑھنے کے بعد ایڈون[6] کی کتاب بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

---

[1] اس کی نشانی بقول مورخ اسکاٹ ایسکوریال (ESCUREAL) کے کتب خانہ (اسپین) میں ایک کتاب روئی کے کاغذ پر گیارھویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے [2] ادلگا نیٹو [3] تمدن عرب ص ۴۴۲ [4] [5] آجکل دہلی جنوری ۱۹۴۹ء [6] (STORY OF PAPER MAKING EDWIN SUTERMEISTER

کتب خانوں کا عملہ

اس عملہ میں مہتمم کے علاوہ کیٹلاگر، کاتب، نقل نویس، خوش نویس، مقابلہ نویس، مترجمین اور دیگر ملازمین بھی ہوتے تھے سابور بن اردشیر (بغداد) کے کتب خانہ میں ایک عورت بھی ملازم تھی جس کا نام توفیق تھا۔ عملہ میں سب سے اہم عہدہ مہتمم کا تھا اسے ناظم بھی کہتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں لائبریرین کے جو فرائض ہیں تقریباً وہی کام اُس زمانہ میں مہتمم کے ذمّہ تھے۔ کتب خانے کے تمام عملے کی نگرانی، کتابوں کی فراہمی، کتابوں کی ترتیب و نگہداشت اور ان کی فہرست مرتب کرنا غرض جملہ امور کا انتظام مہتمم کے سپرد تھا۔ علمی کاموں میں لوگوں کی رہنمائی کرنا بھی اسی کے فرائض میں شامل تھا ان سارے کاموں کی تکمیل کے لئے مہتمم کے ایک یا اس سے زیادہ مددگار ہوتے تھے جن کی تعداد کتب خانوں کی وسعت پر منحصر تھی چونکہ مہتمم کا عہدہ نہایت اہم تھا اس لئے اُس عہدہ پر ان ہی اشخاص کو مقرر کیا جاتا تھا جو علمی و انتظامی قابلیت رکھنے کے ساتھ صحیح کتابی ذوق بھی رکھتے تھے۔ اکثر کتب خانوں کے مہتمم بڑے صاحب علم و فضل تھے۔ بیت الحکمت بغداد کے مہتمم سہیل بن ہارون اور سعید بن ہارون جیسے بلند پایہ عالم و مصنف ہوا کرتے تھے۔ بخارا میں نوح بن منصور کے کتب خانہ کا مہتمم شہرۂ آفاق طبیب ابن سینا، فاطمی خلیفہ العزیز کے کتب خانہ (قاہرہ) کا مہتمم مشہور مصنف علی بن محمد الشبشتی، مدرسۂ محمودیہ (قاہرہ) کا مہتمم حدیث کے زبردست عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف ابن حجر عسقلانی، مدرسۂ مستنصریہ (بغداد) کے کتب خانہ کا مہتمم نامور مورخ ابن الساعی، وزیر ابن عمید کے کتب خانہ کا مہتمم ممتاز فلسفی و مورخ ابن مسکویہ تھا۔ الحکم ثانی کے متعلق اسکاٹ نے لکھا ہے کہ اس نے اپنے کتب خانۂ قرطبہ کا مہتمم اپنے لائق و فائق بھائی عبد العزیز کو مقرر کیا تھا۔

تنخواہیں اور عطیات کتب خانے کے عملہ کو تنخواہیں ان کے فرائض کے لحاظ سے دیجاتی تھیں۔ بعض کی تنخواہیں آجکل کے حساب سے دو ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار تک تھیں۔ یہاں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ملازمین کو مقررہ تنخواہوں کے علاوہ بادشاہوں اور امراء کی طرف سے عطیات بھی ملتے رہتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید اس معاملہ میں اتنا فیاض تھا کہ حنین بن اسحاق جس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرتا اس کے وزن کے برابر ہارون اسے سونا بطور عطیہ دیتا تھا۔ غرض کتب خانہ کے عملہ کی بڑی قدردانی اور حوصلہ افزائی کیجاتی تھی۔

کاتب ہر کتب خانہ سے کاتب اور نقل نویس منسلک رہتے تھے۔ بغداد، قاہرہ، شیراز اور قرطبہ وغیرہ کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں ان کی جو کثیر تعداد تھی اس کا اندازہ اس سے ہوجائیگا کہ طرابلس کے ابن عمار کے کتب خانہ میں ایک سو اسی[۱۸۰] کاتب تھے جن میں سے تیس[۳۰] رات دن لکھنے میں مشغول رہتے تھے۔ ذاتی کتب خانوں میں بھی کاتب ملازم رکھے جاتے تھے۔ مثلاً موفق الدین کے کتب خانہ میں تین کاتب تھے اور قرطبہ کے قاضی ابومطرف کے کتب خانہ میں چھ نقل نویس ملازم تھے۔ قرون وسطیٰ میں کاتب اور نقل نویس کتابوں کی ترویج و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ وہ کتابوں کی نقلیں کر کے کتب خانوں کے ذخائر میں اضافہ کرتے رہتے تھے اس کام میں صحت کا اتنا خیال رکھا جاتا تھا کہ نقل نویسوں کے تیار کئے ہوئے نسخوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مقابلہ نویس مقرر تھے جو ہر لفظ اور ہر نکتہ کا مقابلہ کر کے نقل شدہ نسخے کو اصل کے مطابق کر دیتے تھے۔

فن کتابت کی ترویج و ترقی کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے۔ سلاطین وغیرہ کی قدردانی کی بدولت اسلامی دنیا میں بے شمار کاتب اور خوش نویس پیدا ہوگئے تھے اور بڑی خاص بات یہ تھی کہ یہ فن اس زمانہ میں مخصوص افراد تک محدود نہ تھا بلکہ ہر حیثیت کے لوگ کاتبوں اور نقل نویسوں کے حلقے میں نظر آتے تھے۔ بعض قرآن اور حدیث کی کتابت بغیر کسی اجرت کے محض کار خیر سمجھکر کیا کرتے تھے۔ کچھ اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر اعزازی طور پر کرتے تھے اور کچھ لوگوں نے اسے اپنی روزی کمانے کا ذریعہ بھی بنالیا تھا۔ ابوسعید سیرافی (۳۶۸ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بیس صفحات کی اجرت دس درہم لیتے تھے یہ حوالی بغداد میں قاضی تھے۔ کتابت کے پیشہ پر زندگی بسر

کیا کرتے اور قضاۃ کی خدمات اعزازی طور پر انجام دیتے تھے۔

خوش نویسی کتابوں کی نقل کرنے اور ان کی فہرست مرتب کرنے میں خوش نویسی کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ کتابوں کے علاوہ شاہی مہریں "فرامین" مسجدوں مقبروں اور دوسری عمارتوں پر کتابت کے لئے خوش نویسی کی ضرورت ہوتی تھی چنانچہ یہ فن تمام اسلامی ممالک میں رائج ہو گیا۔ مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق نے اسے ترقی کے جن اعلیٰ مدارج پر پہنچا دیا۔ اس کا اندازہ مورخ اسکاٹ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ "خوش قلم ہونے میں مسلمانانِ اُندلس تمام اسلامی ممالک سے بڑھے ہوئے تھے۔ خط کی خوبی و صفائی، وصل اور فصل اس درجہ کی تھی کہ آج کل کے نہایت لائق کمپوزیٹر بھی وہ لطافت پیدا نہیں کر سکتے"۔

نقّاشی و مصوّری مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق نے کتابت و خوش نویسی کے فن پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان سرحدوں سے گذر کر کتابت میں حسن و زیبائش پیدا کرنے کے طریقے بھی اختیار کئے جانے لگے بقول مولانا عبدالحلیم شررؔ "اب کتابت خطاطی کے حدود سے نکل کر نقاشی کے قلمرو میں داخل ہو گئی اور اس میں مصوّرانہ نزاکتیں شامل ہو گئیں" اس طرح ایک دبستان ظہور میں آیا جس میں خوش نویسی، نقاشی اور مصوّری نے ساتھ ساتھ ترقی کے مدارج طے کئے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے تصویریں بنانے کو ممنوع قرار دیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یُصَوِّرُوْنَ وَلَا یَخْلُقُوْنَ یعنی وہ تصویریں بناتے ہیں اگرچہ خالق بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کر رہا ہے اسی لئے ایک عرصہ تک مسلمان کتابوں میں تصویریں بنانے کی طرف راغب نہ ہوئے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں خطاطی اور کتابت سے مصوّری کا کام لیا جاتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے عربی حروف کی ساخت مصوّرانہ صنعتیں ظاہر کرنے کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی۔ چنانچہ حروف کو سجا کر لکھنے کے وہ اسلوب اختیار کئے گئے جن سے کتابوں اور عمارتوں وغیرہ کی تزئین میں چار چاند لگ گئے، خوشنما پھول بوٹوں کے درمیان اللہ محمدؐ اور قرآنی آیات وغیرہ کو مختلف رنگوں میں اس طرح آراستہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق کا دنیا پر سکہ بیٹھ گیا عربی حروف کی خوبصورتی اور

دلکشی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے عیسائی صناعوں کو بھی اتنا مسحور کرلیا کہ وہ اپنی مذہبی چیزوں اور عمارتوں کی تزئین کے لئے انھیں استعمال کرنے لگے اور بقول مورخ اس کا[1] آیاتِ قرآنی کلیساؤں میں داخل ہوگئیں۔ اے۔ ایچ کرسٹی نے نویں صدی کی ایک آئرستانی صلیب کی نسبت لکھا ہے کہ اس پر خطِ کوفی میں "بسم اللہ" تحریر تھا۔

بالآخر کتابی تصویر کشی کا فن اسلامی دنیا میں بھی داخل ہوگیا۔ اس کا قدیم ترین نمونہ عربی ادب کی مشہور کتاب مقاماتِ حریری[2] کا وہ مصور نسخہ ہے جو پیرس کے ببلیو تھک نیشن نال میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد اور بہت سی مصور کتابوں اور اس فن کی ترقی کے ذکر ملتے ہیں۔ ایران کے صفوی خاندان اور ہندوستان کے مغل خاندان کے بادشاہ بھی مصوری کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے ان کے عہد میں "ایرانی مصوری" اور "مغل مصوری" کے مخصوص دبستان کھلے اور بے شمار مصور پیدا ہوئے جن کی تیار کی ہوئی کتابوں سے کتب خانوں کی زیب و زینت میں کافی اضافہ ہوا۔ اس موقع پر کمال الدین بہزاد کا نام لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تیموری خاندان کے آخری مقتدر بادشاہ سلطان حسین مرزا (متوفی ۱۵۰۶ء) کے دربار کا یہ گل سرسبد مختصر تصاویر کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ شبیہ سازی کو ایک مستقل صنف کا رتبہ اسی مصور نے دیا تھا۔ بہزاد کے فنی کمال کے بہترین نمونوں میں سعدی کی بوستان اور خمسۂ نظامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں یہ دونوں علی الترتیب مصر کے شاہی کتب خانہ اور برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔

خط کی قسمیں ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں خط کوفی رائج تھا۔ ابن مُقلہ (متوفی ۳۲۸ھ/۹۳۹ء) نے چھ عربی خط (ثلث، نسخ، محقق، ریحان، رقاع[3]، توقیع) ایجاد کئے پھر خط تعلیق ایجاد ہوا جو بیچ در بیچ تحریر کیا جاتا تھا اس کے بعد خواجہ[4] میر علی تبریزی نے نسخ اور تعلیق کو ملا کر خط نستعلیق[5] ایجاد کیا جو اپنی خوبصورتی اور نفاست

---

[1] ثقافت پاکستان مرتبہ شیخ محمد اکرام ص ۱۶۲ [2] حریری (ابو محمد قاسم بن علی) کا مولد و مدفن بصرہ ہے اس کا انتقال ۱۱۲۱ء میں ہوا [3] خواجہ میر علی تبریزی امیر تیمور (متوفی ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء) کا ہم عصر تھا [4] تذکرہ خوش نویساں از مولانا غلام محمد ہفت قلم ص ۲۰۔ ۴ (مطبوعہ بپٹسٹ مشن واقع کلکتہ ۱۹۱۰ء)۔

میں تمام خطوں پر سبقت لے گیا مگر اس کے لکھنے میں کافی وقت لگتا تھا اور بڑی محنت کرنی پڑتی تھی چنانچہ روزمرہ کے کاموں کے لئے خط شفیعا ایجاد ہوا یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں خط شکست رائج ہوا تھا۔ یہ دونوں خط دفاتر عدالتوں، اور ذاتی خط وکتابت کے لئے استعمال کئے جانے لگے فن خوشنویسی میں اکثر کاتبوں کا جذب وشوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ قلم سے بھی بے نیاز ہو گئے تھے۔ اور ناخن سے قلم کا کام لینے لگے تھے اس طرح ایک خط ایجاد ہوا جو خطِ ناخن کہلاتا ہے۔

یہ ذکر تشنہ رہیگا اگر ابن بوّاب (ابوالحسن) متوفی[1] ۴۱۳ھ (۱۰۲۳ء) اور یاقوت مستعصمی (متوفی ۶۹۸ھ-۱۲۹۸ء) کے نام نہ لئے جائیں جو عربی خوش نویسی کے اساتذہ کہے جاتے ہیں خطِ نستعلیق کے اُستادوں میں شاہ عباس صفوی کا درباری خطاط میر عماد الحسینی[2] اور اس کا شاگرد و بھانجا آقا عبدالرشید دیلمی نہایت ممتاز ہوئے۔ میر علی تبریزی کے طرز پر لکھنے والوں میں محمد بن اسحاق شہابی نے خاص نام پیدا کیا اس کے قلم کی "نفحات الأنس (مولانا جامی) ایران میں اور دیوان شہزادہ کامران خدا بخش لائبریری بانکی پور، (پٹنہ) میں موجود ہیں۔

فن کتابت وخوش نویسی کی مسلم فرماں رواؤں نے بڑی سرپرستی اور قدردانی کی اکثر بادشاہ خود بہت اچھے خوش نویس تھے۔ اس فن کے ماہرین میں مشائخ اور علماء وامراء کے نام بھی ملتے ہیں۔ محدّث ابن جوزی اور جوہری مصنف صحاح خطاطی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے وزیر ابو جعفر ابن عباس (اندلسی) بڑے پایہ کا خوشنویس تھا۔ اشبیلیہ (اُندلس) کی ایک خاتون صفیہ خطاطی میں اپنا کوئی ہمسر نہ رکھتی تھی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا ماہر طبعیات ابن الہیثم[3] فابن

---

[1] بعض نے ۴۲۳ھ بتائی ہے [2] میر عماد ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) میں قتل کر دیا گیا اس کی لکھی ہوئی جامی کی "تحفۃ الاحرار" استنبول میں ہے اس کی لکھی ہوئی تین وصلیاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہیں ملاحظہ ہو "فہرست نمائش گاہ مخطوطات ونوادر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین [3] جارج سارٹن (GEORGE SARTON) نے اپنی کتاب "تاریخ سائنس" جلد اول (INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE) میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں ابن الہیثم سب سے بڑا ماہر طبعیات تھا۔

کا مشہور ادیب ابن عبداللہ معجم البلدان کا مصنف یاقوت نہایت باکمال کاتب تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں الجوینی ایسا بے نظیر کاتب گذرا ہے کہ اسے فخر الکتاب کا لقب حاصل تھا ہندوستان کے مسلم عہد میں جو باکمال خطاط ہوئے ہیں ان کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا اس فن سے ہند کے مغل بادشاہوں کو جو ذاتی لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہجہان کو ملک خطّاطی کا پیغمبر کہا جاتا ہے۔

روشنائی ظاہر ہے کہ خوشنویسی اور اس کا حسن بہت کچھ روشنائی پر موقوف ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے مختلف قسم کی روشنائی بنائی جاتی تھی اور اسے کیمیاوی ترکیب سے نہایت چمکدار اور پائدار کر دیا جاتا تھا مسلمانوں نے روشنائی کے معاملہ میں بھی بڑا تنوع دکھایا وہ مختلف چیزوں سے روشنائی کا کام لیا کرتے تھے۔ کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ابو نصر اسماعیل بن حماد الجوہری کی مشہور لغت کا نسخہ ۴۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے اس کی کتابت شیر خرما کی روشنائی سے کی گئی ہے۔

حاشیہ نگار اور جلد ساز حاشیہ نگار کتابوں کو دلکش بنانے میں بڑا کمال رکھتے تھے وہ کتابوں کے سر ورق اور ان کے اندرونی صفحات کے حاشیے طرح طرح کے گل بوٹوں سے سجاتے' ان پر سونے کا کام کرتے اور رنگ برنگ کی میناکاری سے مزین کر کے انھیں نہایت دیدہ زیب بنا دیتے تھے۔

جلد ساز صرف پرانی اور نئی کتابوں کی مرمت اور جلدبندی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان کی تزئین بھی کرتے تھے اس مد پر بھی بے دریغ روپیہ صرف ہو جاتے تھے کتابوں کی آرائش میں موتی، ہاتھی دانت، سیپ، سونے چاندی کے اوراق اور مختلف قسم کے جواہرات کو کام میں لایا جاتا تھا۔

غرض کتابی فنون کی اسلامی ممالک میں ایسی حیرت انگیز ترقی ہوئی کہ جب کبھی اس عہد کی کوئی کتاب نظر سے گذرتی ہے تو اس کی آب و تاب دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت، نقاشی اور جلدبندی آج ہی کی گئی ہو۔ بقول شاعر ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ؛ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی۔

کتب خانوں کی بربادی

لیکن یہ لاثانی کتب خانے زمانہ کی دست بُرد سے نہ بچ سکے اور رفتہ رفتہ نیست و نابود ہو گئے۔ لیکن آج بھی اُن کی شان یہ ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر دنیا کے کتب خانوں کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی دراصل اسلامی کتب خانوں کی ترقی اور ان کا تنزل مسلمانوں کے عروج و زوال کے ساتھ وابستہ رہا۔ جن کی بربادی کے خاص اسباب سلطنتوں کے انقلابات، خانہ جنگیاں اور فاتحین کی علم دشمنی اور تعصب تھے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ کتابوں کے چار دشمن ہیں۔ آگ۔ پانی۔ کیڑے اور انسان ان میں سب سے بڑا دشمن انسان ہے اس نے کتب خانوں کے قیمتی ذخیرے جس بے دردی کے ساتھ آگ اور پانی کی نذر کر دیے اس کی المناک داستان آئندہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ بہر حال بہت سے اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے اور ان کے نوادر ادھر ادھر بکھر گئے مگر ان کے علمی احسانات کی صدائے بازگشت آج تک آ رہی ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ مشرق اور مغرب میں بغداد اور قرطبہ کے کتب خانوں اور درسگاہوں سے جو خوشہ چینی کی گئی تھی۔ اس کی بدولت موجودہ علمی و تہذیبی ترقیوں کی بنیاد پڑی ہے۔

باب دوم

ممالکِ اسلامیہ کے کتب خانے

مدینہ منوّرہ

مسلمانوں نے بغداد، مصر، اُندلس، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں جو مدرسے اور کتب خانے قائم کئے وہ اصلاً مدینہ ہی کے نورِ علم کی تجلیاں تھیں اس شہر کی آغوش میں نہ صرف اسلامی علوم نے پرورش پائی بلکہ یہاں کی سرزمین سے وہ تعلیمی اور تمدنی تحریک بھی جس نے دنیائے علم و تمدن میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ مدینہ میں مسجدِ نبوی صرف عبادت خانہ نہ تھی بلکہ ایک یونیورسٹی کا کام بھی انجام دیتی تھی۔ دنیا میں یہ پہلی عوامی درسگاہ ہے جس کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ یہاں عبادت کے ساتھ تعلیم و تدریس کا ہونا مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ بن گیا وہ جہاں گئے انھوں نے مساجد کے پہلو میں مدارس قائم کئے عبادت اور علم کے اس امتزاج نے مسلم تہذیب کو نہایت جامع، مفید اور دلآویز بنا دیا۔

معدنِ علم مدینہ کے معدنِ علم سے بڑے بڑے قاضی، مفتی، قاری، فقیہ اور محدث نکلے۔ اگر ان سب کے نام گنائے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے عہدِ نبوت میں ہی یہ شہر علم کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اُس زمانہ کے تیس ہزار صحابہ میں سے ستّر افراد مسجدِ نبوی کے صفّہ (چبوترہ) پر شب و روز طلبِ علم میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہ علم کا مرکز رہا۔ یہاں جو حلقہ ہائے درس قائم ہوئے ان میں حضرت امام مالکؒ بن انس (متوفی ۱۷۹ھ) کی مجلسِ درس ایک خاص امتیاز رکھتی تھی جس میں بقول

۵ؔ حیاتِ مالک از سید سلیمان ندوی ص ۴۴،

سید سلیمان ندوی "عام و خاص کی تمیز نہ تھی ہارون رشید نے جب درس کی شرکت کا ارادہ کیا تو کہا کہ "عام لوگوں کو الگ کر دیجئے" امام نے فرمایا کہ "شخصی منفعت کے لئے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

کتب خانہ محمودیہ کتابوں کے اعتبار سے بھی مدینہ علمی دنیا میں بڑی فضیلت رکھتا ہے اسلام کی سب سے پہلی کتاب قرآن مدینہ میں مرتب ہوئی احادیث نبوی اور علم فقہ کے مجموعے یہاں تدوین ہوئے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری یہیں لکھی۔ اور امام مالک کی موطا یہیں مرتب ہوئی۔ غرض تصنیف و تالیف اور دوسرے ذرائع سے علم کے اس مخزن میں نسلاً بعد نسلاً کتابیں جمع ہوتی رہیں اور آج بھی یہاں کے علمی خزانوں میں صدیوں پرانی کتابوں کے ایسے نادر نسخے موجود ہیں جن سے ارباب علم کی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی[2] کے الفاظ میں مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ کی "کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی سے اُچھل پڑا کہ حدیث و تفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ اب تک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا بہت سی کتابیں جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کی تمنا تھی وہ یہاں آج پوری ہوگئی۔ آج پہلا دن تھا کہ میری آنکھوں نے دلائل النبوت امام بیہقی، معرفت اصول الحدیث امام حاکم، شرح سنن ابی داؤد لابن ارسلان، شرح بخاری للکرمانی، شرح بخاری لابن بطال، تمہید شرح موطا لابن عبد البر البیان لاحکام القرآن للموزعی الیمینی، زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی، تفسیر ابن ابی حاتم اور نزہتہ المحکم شرح صحیح مسلم وغیرہ کتابیں دیکھیں۔"

کتب خانہ شیخ الاسلام مسلم سلاطین و امراء نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جو خدمتیں کیں اور جس طرح ان کا خادم[3] کہلانا اپنے لئے باعث فخر سمجھا اُسی کی یادگار

---

[1] حیات مالک از سید سلیمان ندوی ص ۳۳، [2] رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۱۸، ص ۱۰۱۔)

[3] مسلمانوں کا عروج و زوال مصنفہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے صفحہ ۳۱۰ پر ترکی سلطان سلیم کی نسبت لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کا خطبہ پڑھتے ہوئے خطیب نے سلیم کیلئے "مالک الحرمین الشریفین کے الفاظ کہہ دیئے تو سلیم فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور خطیب سے بولا "میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حرمین شریفین کا مالک ہوں۔ میرے لئے یہی فخر کچھ کم نہیں ہے کہ میں خادم الحرمین الشریفین" کہلاؤں۔

کتب خانہ مدرسہ محمودیہ ہے جسے ترکی سلطان محمود نے قائم کیا تھا۔ آج سے سو برس پہلے ایک ترکی عالم شیخ الاسلام عارف حکمت بے نے بھی مدینہ میں ایک کتب خانہ کھولا تھا جو اب تک موجود ہے اس کے ذخائر میں ایک ہزار اکسٹھ سال پرانی کتاب تفسیر ابن عباسؓ کے چند اوراق ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے ہیں جن کا سنہ کتابت ۳۱۹ھ ہے اس کے علاوہ ابوہلال عسکری کی کتاب الاوائل[1] مکتوبہ ۳۹۵ھ اور ابن ابی عون اسحاق بغدادی کی کتاب التشبیہات[2] (۶۶۴ھ) بھی کتب خانہ عارف حکمت بے کی نایاب کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

---

[1] کتاب الاوائل کے متعدد نسخے ہندوستان میں بھی ملتے ہیں۔ ٹونک کے کتب خانہ میں ایک قدیم نسخہ موجود ہے۔ اس کی جدید نقلیں علیگڑھ اور رامپور میں بھی ہیں۔ افسوس کہ اس اہم کتاب کی ترتیب و تصحیح کی طرف کسی نے ابتک توجہ نہیں کی [2] اس کتاب کی تصحیح و اشاعت کی سعادت ہندوستان کے ایک فرزند ڈاکٹر معید المعید خاں ایڈیٹر اسلامک کلچر کے حصہ میں آئی۔ انھوں نے اسے متعدد نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے جامعہ کیمبرج میں ڈاکٹریٹ کے لئے پیش کیا۔ یہ کتاب گب میموریل سیریز (لندن) کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

بغداد

سب سے پہلا عظیم الشان پبلک کتب خانہ

دنیائے اسلام میں بغداد اولین مرکز ہے جہاں پہلا عظیم الشان اسلامی کتب خانہ بیت الحکمت کے نام سے خلیفہ ہارون رشید ۱۷۰ھ - ۱۹۳ھ (۷۸۶ء - ۸۰۹ء) نے قائم کیا تھا جو کتب خانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض کتاب گھر نہیں تھا بلکہ سب سے پہلا عظیم الشان پبلک کتب خانہ تھا جس کا فیض کئی صدیوں تک جاری رہا۔

منصور بغداد کا ذکر آجانے کے بعد یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس کی بناء دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے ڈالی تھی اور ایک مسجد موسومہ "جامع منصور" تعمیر کرائی تھی جو اہل علم کا مرکز بن گئی تھی اس صاحب علم وفضل خلیفہ کے عہد (۱۳۶-۱۵۸ھ) میں بڑے علمی کام انجام پائے۔ حضرت امام مالکؒ نے احادیث کا مجموعہ "موطا" مرتب کیا اور امام ابوحنیفہؒ نے فقہ مدوّن کیا۔ یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور یوں بغداد علم وفضل کا گہوارہ بن گیا۔

ہارون الرشید ہارون رشید اپنے دادا منصور کی طرح عالم اور علم وفضل کا بڑا مربّی تھا اس نے علوم وفنون کی ترویج واشاعت اور کتابوں کی حفاظت وافادیت کے لئے بیت الحکمت قائم کیا تھا جس کے ایک حصہ میں لائبریری اور دوسرے میں ترجمہ کا شعبہ[1] تھا۔ ہارون نے بلا لحاظ مذہب وملت بڑے بڑے لائق اصحاب کو ترجمہ کے کام پر مقرر کیا تھا ایسی ہی بے تعصبی اس نے کتب خانہ کے لئے کتابوں کی فراہمی میں بھی دکھائی۔ اور اس معاملہ میں کسی ملک اور کسی زبان کی کوئی قید روا نہ رکھی۔ کتابیں جمع کرنے کے

---

[1] اس شعبہ میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان کی فہرست علامہ ابن ندیم نے "الفہرست" میں اور حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" دے دی ہے۔

لئے اُسنے مختلف ممالک میں اپنے قاصد بھیجے ہندوستان سے پنڈتوں اور طبیبوں کو بلوایا جن کے ذریعہ سنسکرت کی کتابوں تک رسائی ہوئی ایرانی تصانیف حاصل کرنے کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ "جو ملک فتح ہوتا تھا وہاں کا کتب خانہ جلایا نہیں جاتا تھا بلکہ وہ پایہ تخت میں منگوا لیا جاتا تھا اور ان کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا جاتا تھا"۔

چنانچہ بلاد روم کے انقرہ اور عموریہ کی فتح کے موقع پر جب کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ مالِ غنیمت میں ہارون کو دستیاب ہوا تو اس نے کتابوں کو حفاظت کے ساتھ بغداد بھیج دیا اور یوحنا بن ماسویہ کو ان کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔

جس طرح محنت اور توجہ سے ہارون رشید نے کتابیں جمع کی تھیں اسی طرح اس نے بقول مصنف الہارون جگہ جگہ رصد خانے لائبریریاں مدارس علمیہ اور سائنٹفک تحقیقات کے لئے تجربہ گاہیں قائم کیں جن میں دن رات مہندس اور سائنسداں کیمیا وغیرہ کے نئے نئے تجربات اور جدید تحقیقات میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

غرض عہد عباسی کا بغداد علم و فضل کا ایسا بحر بیکراں بن گیا تھا کہ "ہر طرف سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے کی غرض سے کشاں کشاں بغداد کی طرف کھچے چلے آتے تھے، اس نے علوم دنیوی اور علوم دینی دونوں قسم کے علوم کی ایک زبردست یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کرلی تھی یہاں بڑے بڑے محدثین، قرّاء، فقہا، لغت، اداب العرب اور صرف و نحو کے امام موجود تھے جنھوں نے بڑی بڑی مسجدوں میں درس کے سلسلے قائم کر رکھے تھے۔ ان مدارس میں ہزاروں لوگ علم حاصل کرتے تھے جب تک کوئی شخص بغداد آکر علم حاصل نہ کرتا تھا اور یہاں کے علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرتا تھا اس وقت تک اسے نہ شہرت نصیب ہوتی تھی اور نہ ہی اُسے علماء کے زمرے میں شمار کیا جاتا تھا"۔

مامون الرشید بغداد کی یہ علمی مرکزیت مامون (متوفی ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کے عہد میں بہت بڑھ گئی تھی۔ خلفائے عباسیہ میں مامون سب سے زیادہ صاحب علم و فضل تھا اس کے بیس سالہ عہد میں بیت الحکمت کی توسیع ہوئی، بڑے بڑے کتب خانے اور مدرسے کھلے، شماسیہ میں ایک عظیم الشان رصدگاہ قائم ہوئی فلسفہ و

ہیئت، ریاضی اور ادب کی بڑی ترقی ہوئی گو مامون کا خاص میلان فلسفہ کی طرف تھا لیکن اس نے دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ کی۔ فرّاء نحوی[1] سے کتاب الحدود بڑے اہتمام سے لکھوائی اور اس کی بہت سی نقلیں کرا کے کتب خانوں میں بھیجیں۔

کتابوں کے تراجم کے سلسلہ میں مامون کے عظیم الشان کارنامے کتب خانوں کی ترقی کا بہت بڑا سبب بنے اس نے فارسی، قبطی، یونانی اور شامی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ قیصر روم سے ارسطو[2] کی تصانیف منگائیں اور ان کے ترجمے کا کام اپنے دربار کے لائق ترین مترجم حنین بن اسحاق اور یعقوب کندی کے سپرد کیا۔ مامون نے بقول جرجی زیدان ترجمہ کرانے میں اتنی سخاوت دکھائی کہ جس قدر ترجمہ کیا جاتا اس کے ہم وزن وہ سونا دیتا اور ہر ایک کتاب پر جو ترجمہ کی جاتی تھی اپنی مہر و دستخط ثبت کر دیتا تھا۔

مامون کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے کتابیں فراہم کیں۔ مصر، شام، ایران اور ہندوستان وغیرہ سے کتابیں منگوانے کا خاص بندوبست کیا۔ حجاج بن مطر، ابن البطریق اور سلمار کو شہنشاہ بزنطین کے پاس بھیجا کہ وہ بہترین کتابیں منتخب کر کے لائیں۔

---

[1] فرّاء یحییٰ بن زیاد (متوفی ۲۰۷ھ) نحو و لغت اور فنون ادب کا امام تھا کہا جاتا ہے کہ اگر فرّاء نہ ہوتا تو لغت عرب بھی نہ ہوتی۔ فرّاء کے کتاب الحدود لکھنے کا جو حال علامہ شبلی نے المامون میں لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے "اس کے لئے ایوانِ شاہی کا ایک کمرہ خالی کیا گیا اور خدام و ملازم مقرر کئے گئے کہ فرّاء کو کسی ضرورت کے لئے کچھ کہنا نہ پڑے صرف نماز کے وقت آدمی اطلاع کرتا تھا کہ وقت ہو گیا بہت سے کاتب اور ناقلین اس کام کے لئے متعین ہوئے کہ جو کچھ فرّاء بتاتا جائے لکھتے جائیں دو برس کی محنت میں ایک نہایت بسیط کتاب تیار ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ جو شائقین فن اس کے لکھنے کے لئے ہر روز فرّاء کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ میں نے ان کا شمار کرنا چاہا تو نہ کر سکا قاضیوں کو گنا تو اسّی تھے"۔

[2] علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ مامون نے ارسطو کو خواب میں دیکھا اور اس سے سوال و جواب کئے اس خواب نے مامون کو فلسفہ کا ایسا دلدادہ بنا دیا کہ اس نے قیصر روم کو ارسطو کی کتابیں بھیجنے کے لئے لکھا۔ چنانچہ یہ کتابیں پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد بھیج دی گئیں۔

اس زمانہ میں کتابوں کی فراہمی میں جو دقتیں اور پریشانیاں ہوتی تھیں ان کا کچھ اندازہ اس سے ہو جائیگا کہ حنین، جالینوس کتاب "البرہان" کی تلاش میں فلسطین، مصر، اور شام میں پھرتا رہا مگر پوری کتاب کہیں دستیاب نہ ہو سکی، اس کے کچھ اجزاء بہ مشکل مل سکے اس طرح نایاب کتابیں جمع ہوتی رہتی تھیں اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹ بغداد آتے رہتے تھے بقول حالی

؎ حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر ÷ چلے آتے تھے مصر و یونان کے دفتر

بیتُ الحکمت

اس جانفشانی سے جو علمی سرمایہ مہیّا ہوا وہ سب بیتُ الحکمت کی زینت بنا۔ اسی میں عربی، فارسی، ہندی، سُریانی قبطی زبانوں کی دس لاکھ کتابیں تھیں۔ قدیم علوم کا بھی بڑا سرمایہ یہاں محفوظ تھا۔ قدیم نوادر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کا ایک رقعہ تھا جو چمڑے پر لکھا ہوا تھا بطلیموس کی تصنیف "مجسطی" تھی جس کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا تھا اور نوشیرواں کے وزیر کی ایک بے مثل تصنیف[1] تھی جو ایران سے منگائی گئی تھی۔ بیت الحکمت میں ملازمین کی کثیر تعداد تھی ان میں مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، یہودی، پارسی اور ہندو بھی شامل تھے۔ یہاں کے مہتمم کاتب، اور مترجم اُس زمانہ کے بہترین اصحابِ علم اور ماہرینِ فن تھے مثلاً سہیل بن ہارون، سعید بن ہارون، یعقوب کندی، یوحنا بن ماسویہ، ابوسہیل فضل بن نوبخت، علاّن الشعوبی، حجاج بن مطر، ابن البطریق اور سلما، کتابوں کی جلدبندی کے لئے اُس عہد کا مشہور جلدساز ابن ابی الحریش ملازم تھا۔ عملہ کے مشاہرے بڑی فیاضی کے ساتھ مقرر کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ بعض ملازمین کی تنخواہیں آج کل کے حساب سے دو ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار تک تھیں[2]۔

---

[1] اس تصنیف کا پتہ مامون کو بقول مصنف المامون ہندوستان کے ایک حکیم دوبان نے بتایا تھا جسے ہندوستان کے ایک راجہ نے مامون کی خدمت میں بھیجا تھا اس حکیم کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ ایوانِ کسریٰ میں ایک صندوق مدفون ہے جس میں نوشیرواں کے وزیر کی ایک نہایت بے مثل تصنیف چھپا کر رکھی گئی ہے چنانچہ یہ صندوق منگایا گیا اس میں دیبا کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا تقریباً سو ورق کا ایک رسالہ ملا۔ مامون نے اس کا ترجمہ سنا تو نہایت متاثر ہوا۔ (المامون از علامہ شبلی ص ۱۶۸)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیت الحکمت کے قیم (مہتمم) کی حیثیت سے محمد بن موسیٰ خوارزمی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ وہ علم جبر (الجبرا) کا موجد تھا اس نے پہلے پہل اس علم کو علم حسا[ب] سے نکال کر علیحدہ صورت میں وضع کیا اور مامون کی فرمائش پر کتاب الجبر والمقابلہ لکھی جو ا[س] فن پر اسلام میں پہلی کتاب ہے۔

کتب خانے

بغداد میں کتب خانوں کی کثرت ہارون رشید اور اس کا فرزند مامون رشید کتب خانوں کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کی علم دوستی اور کتابی ذوق کے اثر سے کتابیں جمع کرنے کا شوق ایک تحریک کی شکل میں پھیل گیا اور کتب خانوں کی جو کثرت ہوئی اس کا ذکر ان الفاظ میں پہلے ہو چکا ہے کہ بغداد میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں ایک کتب خانہ نہ ہو اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے کتابیں جمع کرنے کا شوق نہ ہو۔ ان کتب خانوں میں سے پہلے دو خلفاء کے کتب خانے دیکھئے جن کی مورخین نے بڑی تعریف کی ہے۔

کتب خانہ ناصر الدین باللہ اس خلیفہ کے دور حکومت (۵۷۵-۶۲۲ھ) کی علمی سرگرمیوں کی ایک بڑی نشانی خود اس کا اپنا کتب خانہ تھا جو نہایت وسیع اور بڑا عمدہ تھا خلیفہ نے اس کتب خانہ میں سے ہزاروں کتابیں مدرسہ نظامیہ بغداد کو مرحمت کر دیں تاکہ ان سے طلباء استفادہ کر سکیں۔

کتب خانہ مستعصم باللہ خاندان عباسی کے اس آخری خلیفہ نے اپنے عہد (۶۴۰-۶۵۶ھ) میں دو کتب خانے قائم کئے۔ ایک تو اپنے عہد کے شروع ہی میں یعنی ۶۴۱ھ میں قائم کر دیا تھا اور اس کے لئے دو اعلیٰ درجہ کے کاتب مقرر کئے تھے۔ ڈاکٹر احمد شلبی لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ کے شعرا اس کتب خانہ کے عجائبات سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھے"۔

---

[1] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ برہان دہلی جلد ۴۵ - صفحہ ۳۷۔

کتب خانہ ابن علقمی یہ خلیفہ مستعصم باللہ کے وزیر موید الدین محمد ابن علقمی نے قائم کیا تھا جس میں دس ہزار کتابیں تھیں۔ حافظ ابن کثیر[۱] کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی عمارت نہایت خوبصورت ہے اور اس میں نہایت مفید اور نفیس کتابیں جمع ہیں۔ ابن علقمی کا سیاسی کردار تو بلند نہ تھا کہا جاتا ہے کہ اسی کے اشارے پر ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ممتاز عالم تھا اور اشاعتِ علم کی خاطر اس نے اپنے کتب خانہ کے دروازے شائقین علم کے لئے کھول دیے تھے لکھا ہے کہ اس نے افادۂ عام کے خیال سے یہ بیش بہا ذخیرہ اپنے محل سے دار الوزارت میں منتقل کر دیا تھا یہ کتب خانہ بھی اب موجود نہیں ہے مگر اس کی کچھ کتابیں استنبول اور قاہرہ کے کتب خانوں میں محفوظ بتائی جاتی ہیں ابن علقمی کے کتب خانہ کا ایک قیمتی مخطوطہ "کتاب[۲] الموشح" (مصنفہ ابو عبید اللہ محمد بن عمران بن موسیٰ المرزبانی متوفی ۳۸۴ھ) استنبول کے کتب خانہ سلیمانیہ میں ہے۔ یہ خوبصورت نسخہ محمد بن علی النقّاش کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کے سرورق پر ابن علقمی کے دستخط موجود ہیں۔

کتب خانہ یحییٰ بن خالد برمکی اس وسیع اور شاندار کتب خانہ میں عربی، یونانی، قبطی، ہندی اور فارسی کتابیں جمع تھیں۔ ابو عثمان بن عمر یحییٰ الخطّاط کا بیان[۳] ہے کہ "جس قدر کتابیں یحییٰ کے کتب خانہ میں تھیں کسی بادشاہ کے پاس اس قدر نہ ہونگی ہر کتاب کے تین تین نسخے موجود تھے۔ نامی خوشنویسوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں تھیں اور اس وقت کی یہ مشہور بات ہے کہ اگر کوئی نایاب کتاب فروخت ہوتی تو اول یحییٰ کو دکھلائی جاتی تھی کیونکہ بجائے ایک کے ہزار درہم دینے والا صرف یحییٰ برمکی تھا خلیفہ ہارون رشید کی لائبریری میں اکثر مشہور کتابیں جو باعث زیب و زینت تھیں۔ وہ یحییٰ کے کتب خانہ کی تھیں" یحییٰ ہارون رشید کا محبوب وزیر تھا اس کے بعد اس کا بیٹا جعفر برمکی وزارت کے

---

[۱] رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۸۴ ص ۱۷۱ [۲] ملاحظہ ہو "کتب خانہ ابن علقمی کا ایک مخطوطہ" از ڈاکٹر مختار الدین احمد مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ جون ۱۹۶۰ء۔

[۳] البرامکہ مولفہ عبد الرزاق کانپوری۔ ص ۱۳۴۔

عہدہ پر سرفراز ہوا۔ یہ دونوں انتہائی فہیم، سخی اور بلند پایہ سیاست داں تھے مگران کا انجام یہ ہوا کہ ہارون نے یحیٰی کو قید میں ڈال دیا جہاں وہ ۱۹۰ھ میں مرگیا اور جعفر کو ۱۸۷ھ میں قتل کرادیا اس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس سال کی تھی اگر جعفر کو اجل مہلت دیتی تو وہ اپنے باپ کے کتب خانہ کو ایسا فروغ دیتا کہ اس کی بھی وہی شہرت ہوتی جو جعفر کے علم وفضل اور جود وسخا کی آج تک ہے۔

کتب خانہ فتح بن خاقان خلیفہ متوکل باللہ کے اس وزیر کے عظیم الشان کتب خانے کے متعلق علامہ ابن ندیم نے یہ کہا ہے کہ "کسی شخص نے کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ خوبصورتی وخوش حالی اس سے بہتر مجموعہ کتب نہیں دیکھا تھا اس شاندار کتب خانہ کو علی بن یحیٰی منجم نے ترتیب دیا تھا۔ ابن خاقان (متوفی ۲۴۷ھ) کتابوں کا ایسا دلدادہ تھا کہ ہمیشہ کتاب اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب بھی موقع ملتا اس کا مطالعہ کرلیتا حتیٰ کہ بیت الخلاء میں بھی کتاب پڑھ لیا کرتا تھا۔

کتب خانہ زیات خلیفہ واثق باللہ کا وزیر محمد بن عبد الملک زیات بھی کتابوں کا بڑا شائق تھا مگر اس کے کتب خانہ کا کسی نے ذکر نہیں کیا علامہ شبلیؒ نے صرف یہ لکھا ہے کہ وہ کتابوں کی کتابت اور ان کے ترجمہ وغیرہ پر دس ہزار روپیہ ماہوار خرچ کیا کرتا تھا جس شخص کو علم اور کتابوں سے اتنا لگاؤ ہو اس کے پاس کتب خانہ کا ہونا ضروری سمجھنا بے جا نہ ہوگا۔

خزانۂ سابور آلِ بویہ کے وزیر ابو نصر سابور بن اردشیر (متوفی ۴۱۶ھ) نے بغداد کے محلہ کرخ میں جو کتب خانہ موسومہ "خزانۂ سابور" قائم کیا تھا۔ اسے دنیا کے بہترین کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے اس میں دس[1] ہزار کتابیں تھیں جن میں سے اکثر مصنفین اور مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی تھیں اس کتب خانہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مشہور فلسفی ابو العلاء المعری اس کی خاطر سفر کرکے بغداد آیا کرتے تھے اس کے مہتمم بھی بڑے پایہ کے علماء رہے ہیں مگر اس نفیس کتب خانہ کی عمر زیادہ نہیں ہوئی

[1] جرجی زیدان نے دس ہزار اور ولگا پنٹو نے کتابوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔

طغرل بیگ سلجوقی کے فوجیوں نے ۴۴۷ھ میں اسے تباہ و برباد کر ڈالا۔

کتب خانہ شریف الرضی

شریف الرضی (متوفی ۴۰۶ھ) نے بغداد میں ایک علمی مرکز "دار العلم شریف الرضی" کے نام سے قائم کیا تھا اس کا کتب خانہ نہایت عمدہ تھا اس سے طلباء کی کثیر تعداد استفادہ کرتی تھی۔ ڈاکٹر احمد شلبی اور دیگر اہل علم نے شریف الرضی کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اس دار العلم کے طلباء کے تمام اخراجات وہ ہی برداشت کرتا تھا۔

خزانۃ الحکمت

اس عظیم الشان کتب خانہ کو علی بن یحییٰ المنجم (متوفی ۲۷۵ھ) نے نواحی بغداد میں اپنے عالیشان محل میں قائم کیا تھا جو تمام بلادِ اسلامیہ میں نہایت مشہور تھا۔ یاقوت کا بیان[1] ہے کہ "تمام ممالک سے لوگ مختلف علوم کی کتابیں مطالعہ کرنے کے لئے یہاں آتے تھے۔ یہاں تمام کتابیں طالب علموں کی خواہش کے مطابق دیکھنے کو ملتی تھیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ علی بن یحییٰ کے خرچ سے ان کی مہمان نوازی بھی کی جاتی تھی" یہی وہ کتب خانہ ہے جس کی بے بہا کتابوں نے منجم ابو معشر کو اتنا مسحور کر لیا تھا کہ وہ مکہ جانا بھول گیا تھا۔ اس نے خراسان سے مکہ جاتے ہوئے بغداد میں قیام کیا اور اس کتب خانہ میں پہنچ کر مطالعہ میں اتنا محو ہوا کہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ ابو معشر (متوفی ۲۷۲ھ) بلخ کا رہنے والا تھا۔ اس نے علم نجوم میں بڑا کمال حاصل کیا اور اس موضوع پر تقریباً چالیس کتابیں لکھیں۔

کتب خانہ محمد بن الحسین بغدادی

یہ ایک علمی عجائب خانہ تھا جس میں نایاب کتابیں، نادر مخطوطات پرانی دستاویزات اور تحریریں جمع تھیں۔ اس علمی خزانے میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ علامہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ "میں[2] نے بڑی مشکلوں سے محمد بن الحسین تک رسائی حاصل کی اور جب اس کو میری طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا تو ایک دن اس نے ایک بڑا تھیلا نکالا جس میں قدیم عرب کے اشعار و قصائد اور بہت سی پرانی دستاویزات اور تحریریں

---

[1] اودگانیٹو۔ ص ۸ [2] رسائل شبلی ص ۳۹۔

تھیں۔ یہ قصائد اور تحریریں چمڑوں پر اور خراسانی مصری چینی تہامی کاغذ پر تھیں۔ میں نے ان کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کہنگی کی وجہ سے ان کی ہیئیت بدل گئی تھی اور جا بجا سے حرف اڑ گئے تھے۔ ان میں جو مجموعے اور اجزاء تھے اُن پر اکثر علماء کے دستخط تھے سندیں تھیں۔ ان میں ایک قرآن مجید خالد بن ابی الہیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جو حضرت علیؓ کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کے ہاتھ کی متعدد تحریریں تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو خطوط سلاطین و سرداران قبائل کے نام لکھوائے تھے بجنسہٖ محفوظ تھے۔ نحو و لغت میں اصمعی، ابن الاعرابی، سیبویہ، فرّاء، کسائی وغیرہ کی ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اور رسالے تھے۔ اسی طرح حدیث میں سفیان بن عیینہ، ثوری، اوزاعی وغیرہ کے ہاتھ کی تحریریں تھیں۔ علاّمہ ابن ندیم کا بیان ہے کہ اسی کتب خانہ کی بدولت مجھکو اس بات کا علم ہوا کہ فنِ نحو ابوالاسود دولی کی ایجاد ہے۔"

کتب خانہ اسحاق موصلی یہ موسیقی اور لغت کی اعلیٰ کتابوں سے معمور تھا۔ لکھا ہے کہ ابوالعباس ثعلب نے بغداد کے اس کتب خانہ میں ایکہزار رسالے فنِ لغت میں دیکھے جو اسحاق کے مطالعہ میں آچکے تھے۔ اسحاق کا شمار موسیقی کے مسلم الثبوت استادوں میں ہوتا ہے اس کے سوا وہ فن حدیث اور لغت میں بھی ماہر تھا ۲۳۵ھ میں انتقال کیا۔

کتب خانہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ خانقاہی کتب خانوں میں اسے وہی امتیاز حاصل تھا جو صوفیائے کرام کی صف میں شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانیؒ (متوفی ۵۶۱ھ - ۱۱۶۶ء) کو حاصل تھا۔ اولگا نیٹو نے بھی اسے ایک اہم کتب خانہ تحریر کیا ہے۔ حضرت جیلانیؒ سلسلہ قادریہ کے بانی اور عربی کے زبردست عالم تھے ان کی بکثرت تصانیف نے کتب خانوں کے لئے ایک مستقل سرمایہ فراہم کر دیا ہے ان میں "غنیۃ الطالبین" (فقہ) اور "بہجۃ الاسرار" (تصوف) بہت مشہور ہیں۔

یہاں اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ مشائخ کے روحانی اور علمی مشاغل نے کتب خانوں کی ترقی

لہ علمائے سلف از حبیب الرحمن خاں شیروانی ص ۳۳۔

پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ دراصل ان بزرگوں کا نصب العین عوام کو اسلام اور اس کی روحانی قدروں کی طرف راغب کرتا رہا ہے اس کام کے لئے علم کی روشنی اور کتابوں کی مدد درکار ہے چنانچہ مشائخ نے تصوف و معرفت کے موضوع پر کتابیں لکھکر علم و ادب میں قابل قدر اضافے کئے اور اشاعت علم کی خاطر اپنی خانقاہوں میں کتابیں جمع کیں۔

اگر مشائخ کے خانقاہی کتب خانوں کا مقابلہ قرون وسطیٰ کی مسیحی خانقاہوں کی لائبریریوں سے کیا جائے تو دونوں میں آسمان و زمین کا فرق نظر آئے گا۔ کتب خانوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قوم کے میلان اور مذاق معلوم کرنے کا وہ بہترین ذریعہ ہیں۔ مشائخ نے اخلاقی اور علمی قدروں کو پھیلانا اپنا نصب العین بنا لیا تھا برخلاف اس کے مسیحی رہنماؤں کی پالیسی اشاعت علم کے خلاف تھی۔ یہ ہی فرق ان دونوں کے کتب خانوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ مشائخ کے خانقاہی کتب خانوں سے استفادہ کیا جاسکتا تھا اور مسیحی خانقاہوں کے کتب خانوں میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کتابیں بند پڑی رہتی تھیں۔

کتب خانہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کے درس گاہی کتب خانوں میں یہ سب سے بڑا کتب خانہ تھا اس لئے کہ جس مدرسہ سے یہ منسلک تھا۔ اسے بھی مدارس نظامیہ میں سب سے بڑا مدرسہ کہا جاتا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ یہ مدرسہ گویا یونیورسٹی تھی اور نیشاپور، ہرات، موصل، بصرہ اور دیگر شہروں کے مدارسِ نظامیہ اس کی شاخیں تھیں۔ اس مدرسہ کی بنیاد خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۷ھ میں ڈالی تھی اور اس کے اخراجات کے لئے پندرہ ہزار دینار سالانہ مقرر کئے تھے۔ ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین ابوالمعالی اور امام غزالی یہاں کے معلمین[۱] رہے۔ شیخ سعدیؒ اسی مدرسہ کے ایک مایۂ ناز سپوت تھے۔

اس کتب خانہ میں خواجہ نظام الملک نے ہزاروں نادر و بیش قیمت کتابیں جمع کردی

---

[۱] بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے شیوخ و علماء کی فہرست محمد عبدالرزاق کی کتاب نظام الملک طوسی ص ۴۵۷ تا ۴۶۶ پر ہے۔

تھیں لکھا ہے کہ "جب کوئی عالم خواجہ کو تحفہ دیتا تو وہ صرف کتابیں ہوا کرتی تھیں اور وہ نادر کتابیں کتب خانہ میں داخل کر دیتا تھا" کتب خانہ کے مہتمم علامہ ابو ذکریا تبریزی تھے جن کو بیش بہا تنخواہ ملتی تھی اس کے بعد یعقوب بن سلیمان اسفرائنی مہتمم مقرر ہوئے۔ خلیفہ ناصر الدین اللہ کی ذات سے بھی اس کتب خانہ کو بڑا فائدہ پہنچا اُس نے شاہی کتب خانہ کی ہزاروں کتابیں اس مدرسہ کے کتب خانہ کو عنایت کر دیں۔ خواجہ نظام الملک کو اپنے مدرسہ کے کتب خانہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ جب وہ بغداد آتا تو اس کتب خانہ میں آکر کتب بینی ضرور کرتا تھا خواجہ کا سب سے بڑا کارنامہ تو مدرسوں کا قیام ہے لیکن اس نے کتابیں بھی لکھیں "سیاست نامہ یا سیر الملوک" اس کی بہت مشہور تصنیف ہے یہ ایک عرصہ تک لندن میں سول سروس کے امتحان میں شامل رہی۔ اس علم دوست وزیر کو حسن بن صباح کے ایک فدائی نے ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں قتل کر دیا۔

تیس۳۰ درسگاہی کتب خانے

اس موقع پر یہ بھی لائق ذکر ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں ابن جبیر[۱] بغداد آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ بغداد میں تیس مدرسے ہیں ہر مدرسے کی عمارت خوبصورتی میں نادر محلات سے بہتر ہے ان میں سب سے بڑا اور مشہور مدرسہ نظامیہ ہے چنانچہ ان مدارس کے کتب خانوں کی تعداد بلاشبہ تیس۳۰ ہوگی

کتب خانہ مدرسہ مستنصریہ

اس مدرسہ کو خلیفہ مستنصر باللہ عباسی نے قائم کیا تھا۔ علامہ شبلیؒ کے بیان کے مطابق اس کی بنیاد ۶۲۵ھ (۱۲۲۷ء) میں دریائے دجلہ کے کنارے رکھی گئی جب عمارت تیار ہوگئی تو اس کی رسم افتتاح بڑی شان و شوکت سے منائی گئی بڑے بڑے فقہا اور علماء درس و تدریس کے لئے مقرر ہوئے اور نہایت عمدہ کتابیں ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر خلیفہ کے کتب خانہ سے اس مدرسہ کے کتب خانہ میں آئیں ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی اس کتب خانے کے متعلق مقریزی اور ابن الفرات کے جو بیانات ملتے ہیں ان کے مطابق یہاں مختلف علوم کی نادر و نایاب کتابیں تھیں ان میں کتاب الیاسہ "یعنی آئین منگول کا نسخہ بھی تھا جس میں چنگیز خان کے وہ فرامین تھے

[۱] اردو ترجمہ سفرنامہ ابن جبیر۔ ص ۲۰۵ (مترجم احمد علی خاں شوق)

تھا اس نے اپنی رعایا کے لئے جاری کئے تھے اور مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "تاریخ بغداد" کی چودہ جلدیں تھیں ایسے شاندار کتب خانہ کے مہتمم بھی بلند پایہ ہستیاں تھیں جن کے نام یہ ہیں۔ الشمسی بن علی الکتبی اور ابن الساعی۔

اس کتب خانہ سے مدرسہ کا ہر طالب علم بہ آسانی استفادہ کرسکتا تھا۔ قارئین کو قلم دوات اور کاغذ بھی مدرسہ کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا۔ طالب علموں کے لئے چراغ بھی موجود تھے پینے کا پانی ٹھنڈا رکھنے کے لئے تہ خانوں کا بھی انتظام تھا اور مدرسہ کے تین سو طلباء میں سے ہر ایک کو ایک طلائی دینار ماہانہ دیا جاتا تھا۔[۹]

ایک عظیم کتب خانہ یہ کتب خانہ اس لحاظ سے عظیم کہلانے کا مستحق ہے کہ جس درسگاہ سے یہ ملحق تھا اس کی بناء ایک عظیم مورخ ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) نے بغداد میں ڈالی تھی وہ ایک مشہور محدث بھی تھے۔ انھوں نے ڈھائی سو سے اوپر کتابیں لکھیں چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس عظیم کام کے لئے ابن جوزی نے بہترین کتابیں اس کتب خانہ میں جمع کرلی ہوں گی۔ ان کی تصانیف میں یہ دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔ "المنتظم فی تاریخ الملوک والامم اور تلبیس ابلیس" ان کی علمی اور مذہبی خدمات کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کے وعظ اور درس کے حلقوں میں اکثر اوقات دس ہزار سے زیادہ لوگ جمع ہوجاتے تھے اور "یہ ان کی تاثیر وعظ ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک لاکھ سے زائد آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیس ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے"[۱۰]

کتب خانوں کی بربادی غرض بغداد میں کتب خانوں اور مدرسوں کی کثرت عباسی دور میں شروع سے آخر تک رہی۔ ایک فاضل مضمون نگار[۱۱] نے ڈاکٹر ڈریپر کے حوالے سے لکھا ہے کہ عہد عباسیہ میں صرف بغداد میں بہتر[۷۲] کتب خانے تھے جن میں کتابوں کی تعداد چار کروڑ سے کم نہیں تھی۔ اسی سلسلہ میں اولگا نیٹو نے قلقشندی

---

[۹] ڈاکٹر احمد شلبی کی ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن۔ ص ۹۸۔

[۱۱] محمد حفیظ اللہ پھلواروی مرحوم (کتب خانہ نمبر رسالہ الزبیر، بہاولپور) ص ۲۳۳۔

کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد[1] میں چھتیس ۳۶ کتب خانے تھے۔
لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بغداد کے کتب خانوں میں کتابیں اتنی کثیر تعداد میں تھیں کہ جب ہلاکو نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تخت و تاراج کرتے وقت ان کتابوں کو دریائے دجلہ میں ڈالا تو ان سے دریا پر ایک پل بندھ گیا اور اس کا پانی سات دن تک سیاہ رہا۔ شیخ سعدیؒ نے بغداد کی اس تباہی پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں

---

[1] اولگا نپٹو۔ ص ۱۸۔

قاہرہ

مصر میں درس گاہوں اور کتب خانوں کے قیام کا آغاز مصر کی اسلامی سلطنت میں شمولیت کے بعد ہی ہو گیا تھا فاتح مصر عمرو بن عاص نے ۲۱ھ میں یہاں ایک مسجد موسومہ "جامع عمر" تعمیر کرائی تھی جو ایک اعلیٰ درجہ کی درس گاہ کا بھی کام دیتی تھی۔

خزائن القصور اس کے بعد جب علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ خلفائے فاطمی کے عہد (۲۹۷ - ۵۶۷ھ) میں پہنچا تو علم کی اشاعت اور کتابیں جمع کرنے کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ خلیفہ عزیز باللہ (متوفی ۳۶۵ھ ۹۷۵ء) نے ایک کتب خانہ خزائن القصور کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کتب خانے کو قرون وسطیٰ کے اسلامی کتب خانوں میں بے نظیر کہا جاتا ہے اس سے شائقین کتب کو استفادہ کرنے کی اجازت تھی۔

یہ کتب خانہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں چالیس کمرے تھے جن میں فقہ، نحو، لغت، حدیث، تاریخ، ہیئت اور کیمیا وغیرہ کی سولہ لاکھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں اس تعداد میں کتابوں کے سارے مکررات بھی شامل ہیں۔ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ ان مکررات کو نکالنے کے بعد بھی کتابوں کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ ان میں چھ ہزار کتابیں صرف ریاضی اور ہیئت کی تھیں۔ یہاں خلیل بن احمد کی کتاب العین کے تیس نسخے تھے جن میں سے ایک خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ تاریخ طبری کے بارہ سو نسخے اور قرآن مجید کے دو ہزار چار سو نسخے مشہور و معروف خطاطوں کے لکھے ہوئے تھے۔ کتب خانہ کی بیشتر کتابوں کا خط نہایت پاکیزہ اور ان کی جلدیں سونے چاندی کے نقش و نگار سے مزین تھیں۔ کتابوں کے علاوہ یہاں زمین کے دو کرے بھی محفوظ تھے۔ ایک چاندی کا تھا جس پر تین ہزار دینار صرف ہوئے تھے۔ دوسرا پیتل کا جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنایا ہوا تھا۔ ان سب کی ترتیب و تنظیم خلیفہ کے وزیر یعقوب ابن کلس نے کی تھی جو خود بھی کتابوں کا بہت بڑا شائق تھا۔ کتب خانہ

کا مہتمم علی بن محمد الشابشتی تھا جس نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔

دارالعلم حاکم بامراللہ (بن عزیز باللہ) نے قاہرہ میں ایک کتب خانہ دارالعلم کے نام سے ۳۹۵ھ (۱۰۰۴ء) میں قائم کیا تھا جس میں ایک لاکھ کتابیں تھیں۔ علامہ شبلی نے اسے "ایک بڑا عظیم الشان عام کتب خانہ" قرار دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "اسے بڑے شان و شوکت سے کھولا گیا اور بہت سے قرا، منجمین، اطبا، ادبا رسم افتتاح میں حاضر ہوئے۔ عمارت کو بڑے ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا اور تمام دروازوں اور گذرگاہوں پر پُرتکلف پردے لٹکائے گئے تھے۔ کتابوں کے مطالعہ اور نقل اور کتابت کی عام اجازت تھی اور اس غرض سے کاغذ، دوات، قلم وغیرہ خود کتب خانہ کی طرف سے ہمیشہ مہیا رہتا تھا اس کتب خانہ کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ یہاں علمی و ادبی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں اور درس و تدریس کے لئے حفاظ، فقہا، ریاضی داں، ہیئت داں بھی مقرر تھے ایک بار خود خلیفہ حاکم نے یہاں مناظرہ کرایا اور اس کے اختتام پر انعام اور خلعت عطا کئے۔

کتب خانہ جامعہ ازہر قاہرہ کی درس گاہوں میں جامعہ ازہر اور اس کا کتب خانہ نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں اس عظیم جامعہ کی ابتداء ۳۵۹ھ[1] (۹۷۰ء) میں ایک مسجد کی صورت میں ہوئی تھی پھر ۳۷۸ھ میں اس نے ایک درس گاہ کی حیثیت اختیار کر لی اور اس کتب خانہ کی اتنی ترقی ہوئی کہ اس میں دو لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں۔ اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ جامعہ ازہر کے کتب خانہ کی ایک امتیازی اور انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہا اور ایک ہزار انیس برس سے مسلسل علمی فیض پہنچا رہا ہے اور اس وقت تک پہنچاتا رہے گا جب تک مصر کا وجود قائم رہے گا۔

طلال الکتب اس کے علاوہ فاطمی عہد کے بھی اور سب کتب خانے اور مدرسے نیست و نابود ہو گئے۔ چھٹی صدی ہجری میں کردوں نے بڑی بیدردی

---

[1] اسی سال قاہرہ تعمیر ہوا تھا۔

[2] تاریخ الامت از مولانا محمد اسلم جیراج پوری جلد ۶۔ ص ۱۰۴۔

ساتھ فاطمین کی یہ علمی دولت تباہ کر ڈالی ان وحشیوں نے کتابوں کی جلدوں کے چمڑوں اپنے جوتے بنوائے اور اوراق جلا دیے۔ ہزاروں کتابیں دریائے نیل میں پھینک دیں سینکڑوں میدانوں میں کس مپرسی کے عالم میں پڑی رہیں جن پر جرجی زیدان کے الفاظ میں ہواؤں نے کھاکر خاک ڈال دی اور وہ ایک عرصہ تک "طلال الکتب" (کتابوں کے ٹیلے) کے نام سے مشہور رہیں

اس تباہی و بربادی کے باوجود فاطمی عہد کی بہت سی کتابیں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح مصر (۵۶۷ھ ۱۱۷۱ء) تک باقی تھیں ان میں کا ایک حصہ سلطان نے اپنے وزیر الفاضل عبدالرحیم کو دے دیا تھا۔

کتب خانہ مدرسہ فاضلیہ

اولگا پنٹو نے سلطان کے اس عطیہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ الفاضل نے یہ کتابیں اپنے مدرسہ میں داخل کر دی تھیں یہ مدرسہ اس نے ۵۸۰ھ میں قائم کیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ کتابیں تھیں جن سے طلبا آزادی کے ساتھ استفادہ کیا کرتے تھے۔

کتب خانہ مدرسہ فخریہ

یہ مدرسہ اور اس کا کتب خانہ قاہرہ میں ایسی خصوصی اہمیت رکھتے تھے کہ قرون وسطیٰ کا ایک نامور مورخ و مصنف ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ھ-۱۲۸۲ء) یہاں سات سال تک مدرس رہا اس کی تصنیف وفیات الاعیان وابناء ابنا، تاریخ و سیر کے لئے مستند ماخذ شمار ہوتی ہے۔ یہ اہم کتاب چونکہ قاہرہ میں لکھی گئی اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابن خلکان نے اپنی تصنیف کے سلسلہ میں اس کتب خانہ سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

مدارس

علاوہ بریں قاہرہ میں اور بہت سے درس گاہی کتب خانے تھے۔ کیونکہ فاطمی دور کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی (متوفی ۵۸۹ھ) کے عہد میں بھی مصر کے سارے علاقوں قاہرہ اور اسکندریہ وغیرہ میں مدارس قائم ہو گئے تھے جن کی بہت ... رسائل شبلی میں موجود ہے۔

ص ۱۲۶

کتب خانہ مجموعہ

قاہرہ میں جو کتب خانے مختلف ... تھا نماز کے مصلوں میں بیش بہا ... بیت میں چھ ہزار طلائی چراغ آویزاں تھے۔

ان کی قدر و قیمت اس لئے بڑھ گئی تھی کہ ان میں بہت سے نامور علماء اور مصنفین کے ہاتھ کی لکھی
ہوئی تھیں۔ قاضی برہان الدین ابن جماعہ کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ بھی اسی میں شامل
ہوگیا۔ نویں صدی ہجری تک کتب خانہ محمودیہ[۵] محفوظ رہا۔ اس کے بعد برباد و منتشر ہونا شروع
ہوگیا ترکی سلطان سلیم عثمانی کی فتح مصر کے بعد اس کی بہت سی کتابیں قسطنطنیہ منتقل کر دی
گئیں۔ اس کا اور کچھ حصہ ضائع بھی ہوگیا بچی کچھی کتابوں میں سے اٹھاون کتابیں کتب خانہ
خدیو مصر میں اور چھ کتابیں کتب خانہ خدابخش پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ فقہ شافعی کی مشہور کتاب
"الحاوی الکبیر" کی تیسری جلد جو کبھی کتب خانہ محمودیہ میں تھی اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے کتب خانہ میں ہے۔

اس کتب خانے کے ناظموں میں سراج الدین اور فخر الدین الطاغی کے بعد ابن حجر عسقلانی
جیسے عظیم مصنف کا نام آیا ہے ابن حجر نے کتب خانہ کی دو فہرستیں بنائی تھیں ایک کی ترتیب
حروف تہجی کے اعتبار سے تھی اور دوسرے فن کے حساب سے مرتب کی گئی تھی۔ اگرچہ
کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کے لئے وقف تھا اور واقف کی شرائط کی رو سے اس کی کتابیں
کتب خانہ سے باہر نہیں جا سکتی تھیں اس کے باوجود ہر اہل علم اس سے استفادہ کر سکتا تھا

اس عظیم الشان کتب خانہ کا بانی ایک مصری مدبر اور سیاستداں جمال الدین محمود
بن علی الاستادار الظاہری تھا جو اپنے قائم کئے ہوئے مدرسہ محمودیہ کے ایک گوشے میں آرام
کی نیند سو رہا ہے محمود نے اپنی طباعی اور ذہانت سے سلطان ملک ظاہر برقوق کے عہد میں
اتنا اعزاز پایا کہ سلطان کا مشیر خاص بن گیا۔ آخر عمر میں اس نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں سلطان
برقوق کے حکم سے ہی اسے قید کر دیا گیا اور زندگی کے آخری لمحوں (۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء) تک
وہ قاہرہ میں قید رہا اسی طرح راحت اور مصیبت کے دن لوگوں کے درمیان گردش کرتے
رہتے ہیں تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

---

[۴] ڈاکٹر مختار الدین احمد کا مضمون "محمود بن علی الاستادار الظاہری" (مجلہ علوم اسلامیہ ...) میں محمود الاستادار کی زندگی کے متعلق بہت قیمتی معلومات جمع ...

[۵] اسی سال قاہرہ تعمیر ہوا تھا۔

[۶] تاریخ الامت از مولانا محمد اسلم جیراج پوری جلد ... بحوالہ ... بنی ...

دمشق

دمشق اسلامی سلطنت میں شامل ہونے کے بعد سینکڑوں برس علم و ادب کا مرکز
ر علماء و فضلاء کا منبع رہا یہ شہر حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہوا تھا فتوحاتِ شام میں یہ اتنی
ی فتح تھی کہ جب اس کی اطلاع رومی شہنشاہ ہرقل کو ملی تو وہ چلا اٹھا "الوداع
ے شام الوداع"۔[۱]

دمشق بنی امیہ کے عہد میں اسلامی سلطنت کا پایہ تخت رہا اس زمانہ میں تصنیف
لیف اور اشاعتِ علم کی طرف خصوصی توجہ کرنے کے باعث جو کتب خانے قائم ہوئے
کا ذکر پچھلے اوراق میں "اسلامی کتب خانوں کی ابتداء، توسیع اور ترقی" کے تحت کر دیا گیا ہے

تب خانہ مع دمشق

یہ کتب خانہ نہایت وسیع اور شاندار تھا کیونکہ یہ مسجد بھی بڑی عظیم الشان
تھی اور تعلیم کا اہم مرکز تھی یہاں عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (متوفی
۱۲۱ھ) اور خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) بھی درس دیا کرتے تھے ان
ہزاروں سامعین شریک ہوتے تھے اموی عہد کے بعد بھی جامع دمشق کی علمی مرکزیت
وں قائم رہی۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابنِ بطوطہ[۲] نے یہاں درس کے بہت سے حلقے دیکھے
اور کتب خانہ میں قرآن کے اس نسخہ کی بھی زیارت کی تھی جو حضرت عثمانؓ نے شام کو بھیجا تھا
مسجد کے غربی منارہ کے اندر امام غزالی نے ایک عرصہ تک مراقبہ و مجاہدہ کیا تھا۔

یہ مسجد موسومہ "جامع دمشق" اموی خلیفہ ولید اول (متوفی ۹۶ھ) نے زرِ کثیر صرف کر کے
خوبصورت اور عظیم الشان[۳] بنوائی تھی کہ بقول یاقوت حموی "اگر انسان سو سال زندہ رہے

---

۱ تمدن عرب ص ۱۴۰ ۲ عجائب الاسفار (سفرنامہ ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ) جلد ۱ ص ۱۲۶

۳ مورخین لکھتے ہیں کہ مسجد کی دیواروں میں بیش قیمت سنگِ مرمر لگا تھا نماز کے مصلوں میں بیش بہا
ر جڑے ہوئے تھے اور چھت میں چھ سو طلائی چراغ آویزاں تھے۔

اور ہر روز اس کی بناوٹ وسجاوٹ کو غور سے دیکھے تو یقیناً وہ روز ایسی چیزیں دیکھے گا
تمام دنوں میں نہیں دیکھی تھیں۔"

کتب خانہ مدرسہ نوریہ

اس کتب خانہ کی شان کا پتہ خود "نوریہ" کی شان وشوکت دے رہا
سلطان نورالدین زنگی (متوفی ۵۶۹ھ) نے اپنے پایہ تخت دمشق
جو مدارس قائم کئے ان میں یہ سب سے بڑا مدرسہ تھا۔

علامہ ابن جبیر نے اسے دنیا کے بہترین کالجوں میں شمار کیا ہے۔ وہ نورالدین کی رحلت
کے نو برس بعد جب دمشق آیا تو یہاں اس نے بیس مدارس دیکھے تھے وہ لکھتا ہے[۱] کہ دمشق
مدرسوں میں سب سے خوش قطع اور نفیس عمارت نورالدین زنگی کے مدرسہ کی ہے اسی مدرسہ
اس کی قبر ہے۔ یہ عمارت قصر کی طرح نہایت خوش منظر اور بارونق ہے۔

کتب خانہ مدرسہ فوریہ

دمشق کے مدرسوں میں "فوریہ" اور اس کے کتب خانہ کا مرتبہ اتنا
تھا کہ یہاں کے اساتذہ میں ایک نہایت مشہور مورخ ابن عساکر
(۵۷۱ھ - ۱۱۷۶ء) بھی شامل تھے ان کے سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے
"الانساب" کے مصنف السمعانی ان کے رفقاء میں سے تھے جنہوں نے ۵۶۲ھ میں وفات
ان کی سب سے بڑی کتاب "تاریخ مدینۃ الدمشق" ہے جو اسّی جلدوں پر مشتمل ہے۔

تین سو بیس ۳۲۰ درس گاہی کتب خانے

درس گاہوں کے قیام سے درس گاہی کتب خانوں کی تعداد کا
لگائیے اور یہ خیال رکھئے کہ دمشق میں بھی ہر مسلم حکمراں کے عہد
میں مدارس قائم ہوئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی (متوفی ۵۸۹
نے بھی یہاں مدارس قائم کر لئے تھے اس شہر میں ایک نہایت مشہور اور عظیم الشان مدرسہ
"عزیزیہ" تھا جو ملک العزیز (بن سلطان صلاح الدین) نے قائم کیا تھا۔

غرض ہر زمانہ میں یوں ہی مدرسوں کی تعداد بڑھتی رہی ۹۲۷ھ (۱۵۲۰ء) میں یہاں
تین سو بیس مدرسے تھے اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس زمانہ میں یہاں ۳۲۰ درس گاہی کتب خانے
موجود تھے جن کی تصدیق کتاب المدارس[۲] من المدارس کے اس اندراج سے ہوتی ہے کہ۔

---

[۱] سفرنامہ ابن جبیر (اردو ترجمہ) ص ۲۶۴ - [۲] رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۰ - ص ۶۰ -

"ان مدرسوں میں علومِ دینیہ کے ساتھ طبیعیات، ریاضیات، علم ہیئت اور ادب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی ان کے علاوہ چار مدرسہ ایسے تھے جن میں خاص فنِ طب کی تعلیم دیجاتی تھی اور ایک مدرسہ فن انجنیری کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا یہ وہ مدارس ہیں جن میں طلباء کو اعلیٰ تعلیم دیجاتی تھی ورنہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ابتدائی مدرسے ان میں سے ہر ایک مدرسہ کی ماتحتی میں قائم تھے اور ان مدارس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ہر ایک کے پاس اس کا ذاتی کتب خانہ موجود تھا جس سے طلباء ہر وقت مستفید ہوتے رہتے تھے۔"[1]

---

[1] رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۸ - ص ۶۱ -
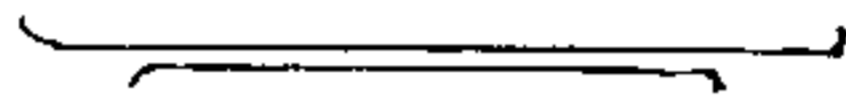
طرابلس

ابن عمار کا عظیم الشان کتب خانہ

ابن عمار کا یہ کتب خانہ اتنا عظیم الشان تھا کہ اس میں تین[۱] لاکھ کتابیں جمع تھیں۔ یہاں پچاس ہزار نسخے قرآن مجید کے اور بیس[۲] ہزار جلدیں تفاسیر کی تھیں اس کتب خانہ میں کتابت کے کام پر ۱۸۰ کاتب[۳] مامور تھے جن میں ۳۰ شب و روز کام میں مشغول رہتے تھے۔ شام کا شہر طرابلس بنو عمار کے عہد (پانچویں صدی ہجری) میں علم و فضل کا گھر بن گیا تھا جہاں دور دراز ممالک سے اہل علم آیا کرتے تھے۔ ابن عمار نے یہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا اس نے اپنے گماشتے بھیج کر بڑے بڑے شہروں سے کتابیں فراہم کیں اور کتب خانہ کو اتنی ترقی دی کہ وہ اس زمانہ کے عجائبات میں شمار ہونے لگا۔

یہ عظیم الشان کتب خانہ ۵۰۳ھ (۱۱۰۹ء) میں صلیبی جنگ کے موقع پر عیسائی فوجوں نے جلا کر برباد کر دیا۔ طرابلس کے ایک بزرگ نے بیان کیا ہے کہ "میں فخر الملک ابن عمار والی طرابلس کے ساتھ قلعہ شیزر میں تھا جب کہ اسے فرنگیوں کے ہاتھ سے فتح ہو جانے کی اطلاع ملی تو اس پر غشی طاری ہو گئی اور جب افاقہ ہوا تو اس کے آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس نے مجھ سے کہا بخدا مجھے کسی چیز کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس دار العلم (کتب خانہ) کی تباہی کا۔"

حلب

ملک شام کے شہر حلب میں بھی کتب خانے اور مدرسے بکثرت تھے مگر ان کے قیام سے سینکڑوں برس پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اپنا مسکن بنا لیا تھا آپ کے پاس بہت سی بکریاں تھیں جن کا دودھ آپ لوگوں کو مفت پلایا کرتے تھے۔ اہل عرب دودھ پینے کو حلب کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس کا نام حلب ہوا۔ یہ شہر مختلف حکمرا

(۱-۲-۳) اولگا پنٹوص ۳۱-۳۲-۳۲۔

خاندانوں کے قبضہ میں رہا جن میں خاندان بنو حمدان کا فرماں روا سیف الدولہ (متوفی ۳۵۶ھ - ۹۶۷ء)
اس لئے قابل ذکر ہے کہ اس نے یہاں ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ قائم کیا تھا۔

کتب خانہ سیف الدولہ یہ ادبی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا تھا علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ فنِ ادب کا ذخیرہ جس قدر اس کتب خانہ میں ہوا اور کہیں نہیں ہوگا کتب خانہ کی مہتمم و افسر محمد بن ہاشم اور اس کے بھائی رہے جو فنِ شاعری میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

کتب خانہ قاضی اکرم حلب میں ایوبی خاندان کی علمی سرگرمیوں کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ یہ کتب خانہ تھا جس کے ذخیرہ کی قیمت پچاس[۱] ہزار دینار بتائی جاتی ہے۔ ابوالحسن علی بن القفطی مشہور بہ قاضی اکرمؒ "تاریخ الحکماء" کا مصنف تھا۔ وہ خاندان ایوبیہ کا وزیر بھی رہا تھا۔

درس گاہی کتب خانے حلب میں درس گاہوں کے کتب خانے بھی کافی تھے جن کے تعداد کا پتہ ان درس گاہوں سے معلوم ہوگا جو یہاں ہر عہد میں قائم ہوتے رہے۔ حلب کے ایک فرماں روا الملک الظاہر (فرزند سلطان صلاح الدین ایوبی) کے زمانہ میں اس شہر کی علمی مرکزیت بہت بڑھ گئی تھی اس نے مدارس کے لئے جاگیریں عطا کرکے ان کے قیام کی راہیں اور کشادہ کر دیں خود بھی دو مدرسے قائم کرائے۔
حلب میں یوسف بہاؤ الدین کا مدرسہ "بہائیہ" اتنا مشہور و معروف تھا کہ اس کے بورڈنگ ہاؤس میں مورخ ابن خلکان ایک مدت تک رہے تھے ایک مدرسہ "زجاجیہ" تھا جس کی صدر معلمہ فاطمہ بنت قریمزان تھی۔ یہاں کے مدارس میں "عصرونیہ اور نوریہ" بھی قابل ذکر ہیں۔ علامہ ابن جبیر نے یہاں کے مدرسوں کا ذکر کرتے ہوئے "مدرسہ خلیفہ" کے متعلق لکھا[۲] ہے کہ اس کی عمارت جامع مسجد حلب کے مانند خوب صورت اور شاندار تھی بلکہ اسے گلستان کا نمونہ کہنا چاہیئے۔ مدرسہ میں ہر طرف انگور کی شاداب بیلیں لگی ہوئی تھیں جن کے تر و تازہ خوشے کھڑکیوں میں اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ طالب علم اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے انھیں توڑ سکتے تھے۔

---

[۱] اولگا نیٹو۔ ص ۹۔ [۲] سفرنامہ ابن جبیر۔

ایک نایاب کتاب حلب کی اس علمی فضا میں بڑی نایاب کتابیں جمع ہو گئی تھیں ان میں "مجمل اللغۃ لابن فارس" بھی شامل تھی جس کا تعارف ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے ایک مضمون[۱] میں کرایا ہے ان کی تحقیق کے مطابق اس نادر نسخہ کی کتابت ابن میمون البغدادی نے ۴۷۶ھ میں بمقام بغداد کی تھی وہاں سے یہ نسخہ عز الاسلام ابو علی الحسن عادلی کے پاس حلب پہنچا پھر شیزر کے مشہور شاعر اسامہ بن منقذ کے بیٹے مرہف کو ملا اس کے بعد یمن کے مشہور رسولی فرماں روا الملک المؤید داود بن یوسف (متوفی ۷۲۱ھ ۱۳۲۲ء) کے پاس آیا اس بادشاہ نے ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جسمیں ایک لاکھ کتابیں تھیں

شام میں مدارس اور کتب خانے شام کے تمام شہروں میں حلب کی طرح بہتر سے بہتر مدرسے اور کتب خانے موجود تھے جن کی مجموعی تعداد ۸۰ بتائی جاتی ہے لیکن وہاں کی غیر معمولی علمی ترقیاں تو اس سے بھی زیادہ درس گاہوں کی عکاسی کر رہی ہیں۔ بہر حال اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ شام سات سو برس تک رومیوں کے قبضہ میں رہا اس طویل مدت میں اسے وہ علمی و تمدنی ترقیاں نصیب نہ ہوسکیں جو اسلامی مملکت میں شامل ہونے کے بعد اسے حاصل ہوئی تھیں۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ اپنی زرخیزی و شادابی کے لحاظ سے بھی جنت کا ایک نمونہ بن گیا اس کا اعتراف ایک غیر مسلم مورخ نے "تمدن عرب" میں یوں کیا ہے کہ بنی امیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں شام کا تمدن ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا تھا۔

علوم کی اشاعت میں اہلِ شام کا حصہ علامہ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ "اہل شام کا اشاعت علوم میں بہت زیادہ حصہ ہے انہی لوگوں نے قدیمی علوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا اور دنیا کی تمام قوموں میں پھیلایا کیونکہ یہ لوگ ذکاوت اور ذہانت میں بے مثل ہیں اور ملک کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے ان کی طبیعتیں ہمیشہ پُر نشاط رہتی ہیں"۔ اس پُر فضا ماحول کا کتب خانوں کی ترقی پر بھی نہایت خوشگوار اثر ہوا اور مزید کتب خانے قائم ہونیکے امکانات پیدا ہو گئے۔

---

[۱] "مجمل اللغۃ لابن فارس کا ایک قیمتی نسخہ" ملاحظہ ہو مجلۂ علوم اسلامیہ جلد ۱ ص ۱۱۷ (شائع کردہ ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کوفہ اور بصرہ

بصرہ اسلام سے پہلے کا ایک قدیم شہر ہے اور کوفہ فاتح عراق سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمرؓ کے حکم سے آباد کیا تھا یہ دونوں اسلام کے ابتدائی دور میں علم کے بڑے مرکز بن گئے تھے۔ بیشتر ائمہ حدیث و فقہ اور صرف و نحواں ہی مقامات سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان اکابر کے کتب خانوں کا مورخین نے صریح طور پر ذکر نہیں کیا تاہم ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کوفہ و بصرہ کے ساتھ دمشق، حلب، ہرات، بخارا، نیشاپور اور شیراز کو بھی یاد رکھنا چاہیئے جہاں کے ارباب علم اسلامی کتب خانوں کے اولین معمار تھے اشاعت علم کے سلسلہ میں اُن بزرگوں کی مساعی جمیلہ کتابیں جمع کرنے اور ان کے مطالعہ کو عام کرنے کی اہم محرک ہیں۔

کوفہ کے نامور علماء

کوفہ حضرت علیؓ کے عہد (۳۵ھ - ۴۰ھ) اسلامی سلطنت کا پایہ تخت ہو جانے کی وجہ سے علم و فضل کا گہوارہ بن گیا تھا خود حضرت علیؓ کی شخصیت ایک درس گاہ اور ایک کتب خانہ سے بڑھ کر تھی۔ آپ ہی کی رہنمائی میں ابوالاسود دؤلی نے فن نحو کی بنیاد رکھی تھی۔ انھیں حضرت علیؓ ہی نے کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور اسے یاد رکھیئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ[1] (متوفی ۱۵۰ھ) ان کے شاگرد رشید امام ابویوسف[2] (متوفی ۱۸۲ھ) اور جامع علم و تقوی سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کوفہ کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے یہاں سعید بن جبیر (متوفی ۹۵ھ) اتنے زبردست عالم تھے کہ جب اہل کوفہ حضرت عباسؓ سے کوئی مسئلہ پوچھتے تو وہ یہ فرماتے "مجھ سے پوچھتے ہو حالانکہ تم میں ابن جبیر

---

[1] آپ کا نام نعمان، کنیت ابوحنیفہ اور والد کا نام ثابت ہے آپ کے دادا زوطی ابن ماہ مشرف بہ اسلام ہو کر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ آپ نے علم فقہ میں وہ مرتبہ پایا کہ بقول امام شافعیؒ "فقہ میں سب لوگ امام ابوحنیفہ کے دست نگر ہیں"۔ آپ کے مفصل حالات "سیرۃ النعمان" از علامہ شبلی میں پڑھیئے [2] اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

موجود ہیں۔" فلسفہ اور لغت کے عالم ابن قتیبہ ۲۱۳ھ میں یہیں پیدا ہوئے ان دونوں موضوعات پر ان کی مشہور کتابیں "ادب الکاتب اور معانی الشعر" بارہ حصوں میں ہیں انھوں نے اور بھی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ لغت اور ادب کے فاضل ابو عمر ابن العلاء نے ۱۵۴ء میں اسی شہر میں وفات پائی۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کے اتنے اقوال جمع کئے تھے کہ ان کے مجموعوں سے ان کا مکان چھت تک بھر گیا تھا اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جو کچھ میں نے جمع کیا ہے وہ کلامِ عرب کا ایک ادنیٰ حصہ ہے اگر ان کے اقوال ملتے تو علم و شعر کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آجاتا۔

بصرہ کے فضلاء بصرے میں قتادہ بن دعامہ (متوفی ۱۱۸ھ) بقول امام احمد بن حنبل سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے یہاں کے مشائخ میں امام حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) علم و فضل اور زہد و عبادت میں اپنی نظیر تھے۔ علامہ اصمعی بصری (متوفی ۲۱۳ھ) لغت و ادب کے امام تھے اور حافظہ کا یہ عالم تھا کہ صرف رجز کے بارہ ہزار اشعار یاد تھے، عربی علم و ادب کی نہایت مشہور کتاب "مقاماتِ حریری" کا مصنف ابو محمد قاسم حریری (متوفی ۵۱۶ھ - ۱۱۲۱ء) بھی بصرہ کا باشندہ تھا۔ بصری علماء میں جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) نے کتابیں جمع کرنے میں اپنی کثیر دولت صرف کر دی وہ اتنا بڑا عالم و ادیب اور مصنف تھا کہ اس کی تصانیف پر بصرہ والے فخر کیا کرتے تھے اس کی دو کتابیں البیان و التبیین اور کتاب الحیوان کی تو اب بھی بڑی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ اسی شہر میں ایک بہت بڑا مورخ ابن سعد (ابو عبد اللہ محمد بن سعد) ۱۶۸ھ میں پیدا ہوا تھا وہ ساری عمر علم کی خدمت کرتا رہا۔ اسی کا شاگرد مشہور مورخ بلاذری (مصنف فتوح البلدان) تھا ابن سعد کی کتاب کا نام طبقات ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے اور طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے۔

تین ہزار کتب خانے یہ چند نام بطور نمونہ دیے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوفہ و بصرہ کے عالی مرتبت اصحابِ علوم کے پاس کتنے عمدہ کتب خانے

بقیہ صفحہ ۱۰۷ عباسی خلفاء مہدی اور ہارون رشید کے زمانہ میں قاضی تھے۔ اسلام میں سب سے پہلے آپ کو "قاضی القضاۃ" کہا گیا۔ ان کی تصانیف میں کتاب الخراج بہت مشہور ہے۔

ہوں گے گو بصرے کے علماء و فضلاء کے کتب خانوں کا ذکر بھی تاریخ میں نہیں مل سکا لیکن ان کی تعداد تین ہزار اس قول کے مطابق کہی جا سکتی ہے کہ "جس قدر علماء اسی قدر کتب خانے" یہ تعداد اس بیان سے متعین کی گئی ہے کہ "امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان جانے لگے تو تین ہزار آدمی شہر سے ان کی مشایعت کو ایسے نکلے جو یا نحوی تھے یا لغوی، عروضی تھے یا محدث یا اخباری[۱]۔

کتب خانہ ابن سوار اب اس موقعہ پر ایک عالم ابو علی بن سوار کا ذکر کر دینا ہے جو کتابیں جمع کرنے کا ایسا شوق رکھتے تھے کہ انھوں نے دو کتب خانے قائم کئے۔ ایک بصرہ میں اور دوسرا رام ہرمز میں۔ ان دونوں کی مورخین نے تعریف کرتے ہوئے ابن سوار کی فیاضی کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان سے استفادہ کرنے جو طلبا آتے ان کے لئے اس کی طرف سے کھانا بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ ان دونوں کتب خانوں میں بصرہ کا بڑا تھا جسے "علم دوست حضرات کا کلب اور مقامی و غیر ملکی حضرات کا سنگم" کہا جاتا ہے لیکن ابن سوار کے ان دونوں نفیس کتب خانوں کا یہ حشر ہوا کہ انھیں ۴۸۳ھ (۱۰۹۰ء) میں بدوین کے حملۂ بصرہ کے وقت جلا دیا گیا۔

کتب خانہ مدرسۂ نظامیہ خواجہ نظام الملک طوسی کے قائم کردہ مدارس کے سلسلہ کا مدرسہ نظامیہ بصرہ میں بھی تھا جس کے کتب خانہ سے اساتذہ اور طلباء استفادہ کرتے تھے۔

بطلیموس ثانی اب بصرہ کا ذکر بصرہ ہی کے ایک باشندے ابن ہیثم (متوفی ۴۳۰ھ ۱۰۳۸ء) کے نام پر ختم کیا جاتا ہے جو اپنے زمانہ کا بے مثل سائنسداں تھا اس کا پورا نام ہے ابو علی محمد بن الحسن بن الہیثم، علوم ریاضی و طبیعیات کا ماہر بطلیموس ثانی، دوسو کتابوں کا مصنف، اس کی کتاب "المناظر" بڑی اہم سمجھی جاتی ہے یہ سائنس داں یورپ میں الہیزن (ALHAZEN) کے نام سے مشہور ہے اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بصرہ کو ابن ہیثم پر اسی طرح ناز ہے جس طرح کہ خاک اسکندریہ کو بطلیموس پر اور انگلستان کو گلبرٹ اور نیوٹن پر۔

[۱] علمائے سلف از مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی ص ۵۶۔

نجف

عراق کا شہر نجف، حضرت علیؓ[1] کا مدفن ہونے کی وجہ سے اسلامی

کتب خانہ حیدری دنیا میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے جب یہاں حیدری کتب خانہ قائم ہوا تو اس شہر کو علمی دنیا میں بھی ایک اہم مقام حاصل ہوگیا اس کے قیام کی صحیح تاریخ تو معلوم نہ ہوسکی تاہم اس کے قیام کا سن چوتھی ہجری قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جن نامور اصحاب کا تعلق اس کتب خانہ سے رہا ہے ان میں ایک تاجدار عضد الدولہ (متوفی ۳۷۲ھ) کا نام بھی شامل ہے۔ حیدری کتب خانہ کے ایک علیمی شاہد[2] کا بیان ہے کہ حضرت علی کی درگاہ کے صحن کے ایک وسیع کمرے میں یہ کتب خانہ ہے جسے دیکھنے کے لئے بھی اجازت لینی پڑتی ہے اس کی کتابیں بیش قیمت ہیں لیکن بے ترتیب ہیں اور کتابوں کی کوئی باقاعدہ فہرست نہیں ہے لیکن کتب خانہ کا وہ حصہ سب سے بیش قیمت کہا گیا ہے جہاں مُصحف رکھے ہوئے ہیں وہ نہایت حسین خط میں لکھے ہوئے ہیں ان پر نہایت خوشنما گلکاری کی گئی ہے اور جلدیں نہایت عمدہ ہیں یہاں فارسی وعربی کے بڑے ہی نادر و بیش قیمت مسودات بھی ہیں ان میں اکثر مصنفین کے ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں مثلاً "معجم الادباء" کی پہلی جلد جسے خود مصنف یاقوت حموی نے لکھا ہے اور ابوحیان اندلسی کی "التقریب" جو اسی نے لکھی ہے یہاں شیعی تصانیف بھی کثیر تعداد میں ہیں۔

نہج البلاغہ کا ایک قدیم ترین نسخہ اس کتب خانہ میں نہج البلاغہ کا وہ نسخہ بھی ہے جسے حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے راقم الحروف نے بھی اس کتاب کا وہ خطی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی "مولانا آزاد لائبریری" میں دیکھا ہے جو شیر خرما کی روشنائی سے لکھا گیا ہے اور جسے لکھے ہوئے آٹھ سو انسٹھ سال (۸۵۹) سال گذر چکے

---

[1] آپ کو ۴۰ھ میں ایک خارجی ابن ملجم نے کوفہ کی مسجد میں تلوار سے زخمی کر دیا زخموں کی تاب نہ لاکر آپ شہید ہوگئے اس وقت آپ کی عمر ۶۳ سال تھی۔ [2] ڈاکٹر احمد شلبی نے کتب خانہ حیدری دیکھنے کے بعد اس کی جو کیفیت ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن میں تحریر کی ہے اس کا اقتباس یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔

ہیں اس کا سالِ کتابت ۳۸۵ھ ہے اس سے قدیم تر نسخہ دنیا میں شاید ہی کہیں اور ہو۔

حضرت علیؓ کا ایک قول علم اور تقویٰ کے میدانوں میں حضرت علیؓ کو جو اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے اس کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔ آپ کا ایک قول ہی اس لائق ہے کہ اسے ہر کتب خانے اور ہر درس گاہ میں جلی حروف میں لکھ دینا چاہیئے۔ اَلْعِلْمُ یُنَادِیْ بِاَعْلٰی صَوْتِہٖ اَنَا سُلْطَانُ الْعَالَمِ علم اونچی آواز سے اعلان کرتا ہے کہ دنیا کا بادشاہ میں ہوں۔

موصل

اس شہر نے اسحاق موصلی کی بدولت بڑی شہرت پائی وہ علم موسیقی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کے شاگردوں میں ایک مشہور جغرافیہ داں ابن خرداذبہ (ابوالقاسم عبید اللہ بن عبداللہ) کا نام بھی آیا ہے۔ موسیقی سے گہری دلچسپی رکھنے کی وجہ سے اس نے یہ علم بھی حاصل کیا تھا اور لائق ذکر یہ ہے کہ اسحاق کتابوں کا بڑا شیدائی تھا اس کے پاس فنِ موسیقی کی کتابوں کے علاوہ فنِ لغت کے بھی ایک ہزار رسالے تھے جن کا ذکر پچھلے اوراق میں اس کے کتب خانے کے ساتھ آچکا ہے۔ اس ماہر موسیقی کی کتابوں سے شیفتگی کی کیفیت مصنّف الفہرست ناہیر نے کتاب الغنی کے حوالہ سے یہ بیان کی ہے کہ "جب کبھی وہ سفر کو جایا کرتا تھا تو اپنے ساتھ کتابوں سے بھرے ہوئے اٹھارہ صندوق لے جایا کرتا تھا اس پر یہ کہتا تھا کہ اگر میں اپنے بوجھ کو ہلکا کرنے کا خواہش مند نہ ہوتا تو ان سے دو چند لایا کرتا۔"

کتب خانے جہاں تک کتب خانوں کا تعلق ہے موصل میں علماء و فضلاء کے ذاتی کتب خانوں کے علاوہ درس گاہی کتب خانے بھی تھے جن کا ثبوت ان درس گاہوں سے ملتا ہے جو مختلف زمانوں میں یہاں قائم ہوئیں۔ مثلاً خواجہ نظام الملک طوسی کا "مدرسہ نظامیہ" سیف الدین غازی برادر سلطان نورالدین زنگی (متوفی ۵۴۴ھ) کے مدرسے "سیفیہ اور عتیقیہ" عزالدین نبیرہ نورالدین (متوفی ۵۸۹ھ) کا مدرسہ "عزتیہ" نہایت عالی شان اور مشہور تھے۔ غرض جیسا جو مدرسہ تھا ویسا ہی اس کا کتب خانہ تھا۔

لیکن جعفر بن محمد بن حمدان موصلی (متوفی ۳۲۳ھ-۹۳۴ء) نے جو کتب خانہ اپنے تعلیمی ادارے کے ساتھ موصل میں قائم کیا تھا اس کی مورخین نے تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ نہایت عمدہ کتب خانہ تھا جس میں ہر شخص داخل ہو سکتا تھا اور غریب طلباء کی مدد بھی کی جاتی تھی۔

موصل میں بھی مدارس کے علاوہ علماء نے اپنے طور پر درس کی مسندیں بچھا رکھی تھیں مثلاً یہاں کے ایک مشہور عالم ابن جنی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فنِ نحو کا درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس شہر کے جن کتب خانوں کا ذکر ہو چکا ہے ان کے علاوہ اور بھی کتب خانے ہونا خارج از امکان نہیں ہے۔

غزنی

کتب خانہ محمود غزنوی سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۱ء) کے عہد میں غزنی کا کتب خانہ دنیا کے نفیس کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا اس بادشاہ کی معارف پروری اور علمی قدردانی کی بڑی تعریف کی جاتی ہے مورخ ایشوری پرشاد نے اسے بہت بڑا فاتح اور مصنفین کا فیاض سرپرست کہا ہے اس کی قدردانی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ علم وادب کے مختلف شعبوں میں کمال رکھنے والے بیہقی[1]، عتبی[2] عنصری[3]، البیرونی[4] اور شاہنامہ کا مصنف فردوسی وغیرہ اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے محمود کے عہد میں غزنی کی کیا حالت تھی یہ بھی ایشوری پرشاد کی زبان سے سنئے۔

"محمود نے غزنی میں ایک یونیورسٹی قائم کی ایک کتب خانہ فراہم کیا اور ایک عجائب خانہ کھولا جس میں جنگ کے ہدایا و تحائف جمع کئے یہ اسی کی دریا دلی کا نتیجہ تھا کہ غزنی میں ایسی خوب صورت عمارتیں بنائی گئیں جن کی وجہ سے یہ شہر مشرق کے بہترین شہروں میں شمار ہونے لگا"

کتب خانہ غزنہ لیکن محمود غزنوی سے کوئی دو سو سال قبل غزنی میں یہ قیمتی کتب خانہ[5] تھا جس میں دوسری اہم کتابوں کے علاوہ عیسائیوں کی مقدس کتاب جینیر کے بھی ۲۷ مجلدات محفوظ تھے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں کنزبری کا

---

[1] ابوالفضل بیہقی کی تصنیف تاریخ بیہقی غزنوی خاندان کی تاریخ اور فارسی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔
[2] ابونصر عتبی نے تاریخ الیمینی لکھی جس میں سلطان محمود اور اس کے باپ سبکتگین کے حالات درج ہیں۔ [3] ابوالقاسم عنصری۔ بہترین شاعر اور اپنے زمانہ کے تمام علوم وفنون میں کامل تھا [4] ابوریحان البیرونی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "علم وفضل میں ان کا ہم پلہ کوئی نہ تھا" [5] ملاحظہ ہو "نخستین کتب خانہ غزنہ در عصر اسلامی" (رسالہ سروش کراچی جلد ۳ شمارہ ۲۱)

پادری فلیکس الیی لنس الکوئین کتاب جیشیر کی تلاش میں نکلا اور سفر کی صعوبتیں اٹھاتا ہو
انگلستان سے غزنی پہنچا جو اس وقت اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔

سفر الکوئین اس سفر کی پوری کیفیت "گزارش سفر الکوئین[۵] بہ کتب خانہ غزنہ" میں بیا
کی گئی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق یہ کتب خانہ ایک پبلک
لائبریری کی حیثیت رکھتا تھا جس کی نگرانی اور حفاظت کے لئے ناظم یا کتاب دار مقرر تھا
کتب خانہ کا ایک کیٹلاگ (فہرست کتب) بھی تھا جس میں کتابیں اپنے عنوانات کے تحت
درج کیجاتی تھیں یہاں کتاب جیشر جلیسی قدیم اور اہم کتابیں مقفل الماریوں میں رکھی ہوئی
تھیں جس کی چابیاں احتیاط کے خیال سے ناظم کتب خانہ کے بجائے شہر کے حاکم اعلیٰ کے پاس
رہتی تھیں اور ان کے مطالعہ کی اجازت اسی سے حاصل کرنی پڑتی تھی۔ پادری الکوئین کو کتا
جیشیر کے مطالعہ اور ترجمہ کی اجازت لینے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا بالآخر اس کا
جذبۂ شوق کام آہی گیا اور اسے ترجمہ کرنے کی اجازت مل گئی جس کو اس نے دو سال میں مکمل کر دیا اس علم
دوست پادری کے بیانات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزنی کا یہ کتب خانہ ایک قدیم ترین اسلامی کتب خانہ تھا۔

ہرات

ہرات کے آثار قدیمہ یہاں کے کتب خانوں اور مدرسوں کی نشاندہی کر رہے ہیں یہ
شہر بڑے بڑے مشائخ، علماء اور بادشاہوں کا ابدی مسکن ہے جن کی بدولت یہ علم و فضل
کا گہوارہ بن گیا تھا یہاں خواجہ عبداللہ[۲] انصاری، خواجہ ابو الولید[۳] احمد اور مولانا نورالدین جامی
جیسے بزرگوں کے مزارات دیکھ کر علمی روح بیدار ہو جاتی ہے۔

---

[۵] رسالہ سروش کراچی جلد ۳ شمارہ ۲۲ [۲] صوفیاء اور محدثین میں خواجہ عبداللہ انصاری (متوفی ۴۸۱ھ-۱۰۸۸ء) نہایت
ممتاز ہیں آپ ہرات میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں "منازل السائرین (عربی) اور
زاد العارفین" (فارسی) بہت مشہور ہیں [۳] خواجہ ابو الولید (متوفی ۲۳۲ھ-۸۴۶ء) اپنے زمانہ کے بڑے صاحب
علم بزرگ تھے ظاہری و باطنی علوم امام احمد بن حنبلؒ سے حاصل کئے وہ نہایت امیر آدمی تھے مگر اپنی تمام دولت
تحصیل علم میں صرف کر دی تھی۔

ہرات کی قسمت کا یہ الٹ پھیر تو دیکھئے کہ امیر تیمور (متوفی ۸۰۷ھ - ۱۴۰۵ء) نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھار کھی تھی لیکن اس کے بیٹے اور پوتوں کے زمانہ میں علمی بہاریں ہرات میں پھر لوٹ آئیں اور وہ علم اور کتابوں کا گہوارہ بن گیا۔

دو بڑے کتب خانے یہ دونوں تیمور کے بیٹے شاہ رخ اور اس کے پوتے بالسینغر کے کتب خانے تھے۔ شاہ رخ (متوفی ۸۵۰ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے ہرات میں ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ کتب خانہ بالسینغر کے بڑے ہونے کا اندازہ اس تحریر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے کتب خانہ میں چالیس خطاط ہر وقت مخطوطات کی نقل کرنے میں مشغول رہتے تھے

شاہ رُخ کا بیٹا الغ بیگ بھی اہل علم کا قدر داں تھا اور علم ہیئت سے اتنی دلچسپی رکھتا تھا کہ اس نے سمرقند میں ایک عظیم رصد گاہ بنوائی تھی۔ یہ دونوں بھائی یعنی بالسینغر اور الغ بیگ کتابیں جمع کرنے کے بھی بے حد شائق تھے اور اس معاملہ میں بقول براؤن (مصنف ہسٹری آف پرشین لٹریچر) سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی اور اطالوی شائقین کتب سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔

کتب خانہ مدرسہ گوہر شاد بیگم یہ مدرسہ اور کتب خانہ شاہ رُخ کی ملکہ گوہر شاد بیگم نے قائم کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت قابل خاتون تھی اور علمی کاموں میں بھی دلچسپی لیتی تھی اسی مدرسہ کے پاس شاد بیگم کی آخری آرامگاہ ہے

کتب خانہ مدرسہ حسین مرزا اس کتب خانہ کی عظمت و شان کا شاہد یہ مدرسہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں تمام ایران اور توران میں اس کی سی شان و شوکت کا کوئی مدرسہ موجود نہ تھا اس کے بانی سلطان حسین مرزا بایقرا کی قبر اسی مدرسہ کے قریب ہے۔

یہ سلطان ہرات کے تخت شاہی پر ۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) میں بیٹھا اور ۳۷ برس تک حکومت کرتا رہا اس دوران اس نے ہرات اور اپنی مملکت کے دیگر علاقوں میں بڑی کثرت سے مدرسے اور کتب خانے قائم کئے ہوں گے کیونکہ وہ خود بھی کتابیں جمع کرنے اور کتابیں لکھنے کا شوق رکھتا تھا اس کی ایک تصنیف کا نام ”مجالس العشق“ ہے۔ سلطان کے دربار سے

جوار باب کمال منسلک تھے ان میں اس عہد کا ایک نامور خوشنویس میر علی الحسینی بھی تھا جس کی لکھی ہوئی کتابیں اب بھی مختلف کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں ان میں کی ایک کتاب ملا عارفی کی "مثنوی گوئے چوگان" مختلف کتب خانوں میں رہی پھر گردشِ زمانہ نے اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں پہنچا دیا اور یہ اب وہیں ہے۔[1]

ہرات کی علمی شخصیتوں میں میر علی شیر نوائی (متوفی ۹۰۶ھ - ۱۵۰۱ع) کا مرتبہ بہت بلند تھا وہ سلطان حسین مرزا بایقرا کا وزیر رہا اس نے یہاں حکمرانی کی۔ مگر بہرحال میں علم و ادب سے اپنا تعلق قائم رکھا وہ اہل علم کا قدرداں اور کتابیں جمع کرنے کا شوقین تھا۔

دو نایاب کتب خانے میر علی کے علمی کاموں کی یادگار "کتب خانہ جامع علی شیر اور کتب خانہ مدرسہ اخلاصیہ" ہیں۔ ان دونوں علمی مراکز کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہاں بڑے بڑے فضلاء، مذہبی مسائل اور عقلی علوم کی تفتیش اور تحقیق میں مصروف رہتے تھے لہٰذا اسی کام کے لحاظ سے ان کتب خانوں میں بڑے قیمتی اور نایاب ذخائر موجود تھے۔

کتب خانہ میر علی شیر نوائی خود میر علی شیر کا کتب خانہ بھی تاریخ کی نہایت اعلیٰ کتابوں سے معمور تھا جن سے استفادہ کرنے کی اجازت اس نے اہل علم کو دے رکھی تھی۔ ان ہی کتابوں کے مطالعہ کے بعد "خواند میر" کو تواریخ اسلام کا ایک خلاصہ مرتب کرنے کا خیال ہوا چنانچہ اس نے ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ع) میں "خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخیار" لکھی۔ وہ ۸۸۰ھ میں بمقام ہرات پیدا ہوا تھا کئی اعلیٰ کتابوں[2] کا مصنف تھا اس نے یہ کتاب اپنے مربی میر علی شیر نوائی کی فرمائش پر لکھی تھی اس کے کتب خانہ سے استفادہ کے سلسلہ میں وہ خلاصۃ الاخبار کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔

---

[1] اس کا ایک قلمی نسخہ "جواہر میوزیم" اٹاوہ (بھارت) میں رہنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں پہنچ گیا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے قدیم مکتوبہ نسخہ اور کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔

[2] خواندمیر کی ایک اہم تصنیف حبیب السیر کا ایک قلمی نسخہ مطلا و مذہب اور نہایت عمدہ لکھا ہوا مشہدِ مقدس (ایران) کے کتب خانہ میں ہے۔

"تا در سال نہصد و چار از ہجرت نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم ہر کتابے کہ مشتمل بر فن تاریخ و اخبار در کتب خانۂ معمورۂ آں بزرگوار موجود بود تسلیم ایں بے بضاعت نمودند و بمطالعۂ آنہا ترغیب و تحریص فرمودند"

کتب خانہ مدرسۂ نظامیہ ہرات میں بھی بہت سے مدارس تھے ان میں مدرسۂ نظامیہ اور اس کا کتب خانہ نہایت عمدہ تھا۔ یہ ہی وہ مدرسہ ہے جس سے مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) نے فیض حاصل کیا تھا لکھا ہے[۱] کہ جامی اپنے والد نظام الدین دشتی، کے ساتھ ہرات میں وارد ہو کر مدرسہ نظامیہ میں سکونت پذیر ہوئے اور فضلائے زمانہ مثلاً جنید اصولی اور مولانا خواجہ علی سمرقندی وغیرہ سے تحصیل علوم کی اور بلند پایہ علامہ بن گئے جامی لڑکپن میں ذہین اور محنتی جوانی میں عالم باعمل اور پیری میں مولانا اور پیر تھے" پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں شرح ملا جامی بہارستان، نفحات الانس، مثنوی یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور لوائح جامی بہت مشہور ہیں

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ جامع مسجد ہرات کا یہ مدرسہ موسومہ "جامعہ عثمانیہ" ایسا ہی عالیشان تھا جیسی کہ مسجد تھی۔ اس مسجد کے متعلق لکھا ہے[۲] کہ اس میں چار عظیم الشان ایوان ۶ دروازے ۴۷۰ گنبد ۱۸۰ رواق اور ۴۸۰ ستون تھے اس سے ملحق ایک مدرسہ اور کتب خانہ تھا۔ اسے سلطان غیاث الدین غوری نے ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء میں نئے سرے سے تعمیر کرایا تھا اور اسی وقت یہ مدرسہ بھی بنوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امام فخرالدین رازی کے درس و تدریس کی غرض سے بنوائی گئی تھی اور آپ ہی کی وجہ سے اس مسجد نے ایک جامعہ کی شکل اختیار کر لی تھی یہاں امام صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے دنیا کے مختلف گوشوں سے جو طالبان علم آیا کرتے تھے ان سے جامعہ اور اس کے کتب خانہ کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے بالآخر فلسفہ و حکمت کا جید عالم اور ان گنت کتابوں کا مصنف امام رازی[۳] ۶۰۶ھ (۱۲۰۹ء) میں یہ کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا ؎

---

[۱] [۲] رسالہ برہان دہلی جلد ۶ ص ۲۵۹، ۲۶۰ [۳] آپ نے قرآن کریم کی تفسیر "مفاتیح الغیب" بھی لکھی جو تیس حصوں میں ہے اور تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔

ہرگز دلِ من ز علم محروم نہ شد ؛ کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال درس گفتم شب و روز ؛ معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

بلخ

چند نامور فضلا، بلخ اسلام سے پہلے اپنے آتشکدۂ نوبہار کی وجہ سے مشہور تھا جس کے متولی برامکہ تھے۔ جب یہ شہر اسلامی سلطنت میں شامل ہوا تو اس وقت اس کا آتشکدہ سرد ہو گیا اور علم کی شمعیں روشن ہو گئیں مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے جن میں مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ صدیوں تک باقی رہا اس مدرسے میں رشید الدین وطواط[1] بلخی نے کچھ عرصہ تعلیم پائی تھی۔ اس نے "حدائق السحر فی دقائق الشعر" لکھی جو فارسی میں صنائع شعری پر قدیم ترین کتاب کہی جاتی ہے اس نے ایک دیوان بھی چھوڑا جس میں پندرہ ہزار اشعار ہیں۔ رشید کے علاوہ بلخ میں اور بھی ممتاز شاعر اور ابو معشر منجم جیسے اہل کمال پیدا ہوئے۔ حوالی بلخ میں ایک مقام قبادیان حکیم ناصر خسرو کا مولد ہے اس نے ۴۸۱ھ میں وفات پائی اور بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں زاد المسافرین، سفرنامہ، روشنائی نامہ، سعادت نامہ مشہور ہیں بلخ کے ایک قصبہ فاریاب میں ظہیر فاریابی پیدا ہوا جو چھٹی صدی ہجری کا مشہور شاعر ہے مقامات حمیدی کا مصنف حمید الدین ابوبکر بن محمود (متوفی ۵۵۹ھ) بلخ کا قاضی تھا مگر یہ سرزمین مولانا جلال الدین رومی جیسے فخر روزگار صوفی شاعر اور عالم پر ہمیشہ ناز کرے گی جن کی تصانیف آج تک مشرق و مغرب کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں مولانا ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے سلطان علاؤ الدین کیقباد کی دعوت پر اس کے پایۂ تخت قونیہ گئے اور وہیں ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء میں انتقال ہوا مولانا کی تصانیف میں ایک ضخیم مجموعہ غزلیات ہے جو دیوان شمس تبریز کے نام سے جمع کیا گیا ہے۔ نثر میں ان کے ملفوظات (فیہ ما فیہ) شائع ہو چکے ہیں لیکن مولانا کا شاہکار مثنوی معنوی ہے اس کی جس قدر شرحیں

[1] رشید الدین بلخ میں پیدا ہوا لیکن سمرقندی بھی کہلایا۔ کوتاہ قد اور لاغر جسم ہونے کی وجہ سے "وطواط" لقب ہوا۔ وطواط ابابیل کو کہتے ہیں۔ اس کا انتقال ۵۷۸ھ میں ہوا۔

مختلف زبانوں میں لکھی گئیں اتنی غالبًا کسی دوسری فارسی کتاب کی نہیں لکھی گئیں مثنوی معنوی فارسی زبان میں صوفیانہ شاعری کی بے بہا کتاب ہے جن میں اشعار کی تعداد ۲۶ ہزار سے زائد ہے اور جو سوز عشق، عرفانی افکار اور صوفیانہ نکات سے لبریز ہیں۔

چلتے پھرتے کتب خانے

ایسے مقتدر اصحاب علم و فضل کے پاس کتابوں کے ذخیرے ہونا لازمی سمجھئے سچ تو یہ ہے کہ ان میں کا ہر فرد ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھا کتب خانوں کی یہ قسم اب مفقود ہے لیکن قرون وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں عام تھی اس زمانہ کا ایک مشہور مقولہ یہ بھی تھا کہ "علم سینہ بہ از سفینہ" غالبًا اسی وجہ سے اکثر ممتاز ترین علما کے ذکر میں بھی مورخین نے ان کے کتب خانوں کے نام نہیں لئے کیونکہ وہ عالم اور کتب خانے کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس زمانہ کے اصحاب علوم و فنون کے سینے اتنے کشادہ اور حافظے ایسے قوی تھے کہ سینکڑوں صفحات کی کتابیں ان میں سما کر محفوظ ہو جاتی تھیں انکے سینے کتب خانے بن جاتے تھے اور یہ قول صادق آجاتا تھا کہ "جس قدر علماً اسی قدر کتب خانے"۔

یہ خیال رہے کہ اس زمانہ میں تعلیم املا کے طرز پر ہوتی تھی محض کتاب خوانی نہ تھی جو لفظ استاد کے منہ سے نکلتا طلباء اسے اتنے غور و توجہ سے سنتے کہ وہ ان کے دماغ پر ثبت ہو جاتا اور اساتذہ بھی اتنی محنت اور توجہ سے پڑھاتے کہ ان کے حلقہ ہائے درس کے ہزار ہا طلباء[1] میں سے کوئی بھی محروم نہ رہنے پاتا۔ طلباء کی یہ جماعت جب مدارس سے نکل کر میدان عمل میں آتی تو چلتے پھرتے کتب خانے ثابت ہوتی وہ لوگ جس کتاب کا مطالعہ کرتے اس کے مضامین ان کے لوح دماغ پر اس طرح نقش ہو جاتے جیسے ماؤکر و فلم کی ریل پر کتابیں اتر آتی ہیں اور بوقت ضرورت وہ انھیں ایسے سنا دیتے تھے جیسے کہ کتاب پڑھی جاتی ہے گویا دماغ کے علمی

---

[1] علمائے سلف میں ہے کہ جب شیخ فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو حاضرین تخمیناً تیس ہزار تھے ابو الفضل بغدادی ہیں کہ جب میں نے فریابی سے حدیث سنی ہے تو تقریبًا دس ہزار آدمی انکے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لیکر بیٹھتے تھے۔ یہ واقعہ نمونتاً لکھدیا ہے اس طرح کے حلقہ ہائے درس اس زمانہ کے تمام اسلامی ممالک میں موجود تھے۔

خـزانہ سے علم کا لین دین اس طرح ہوتا تھا جیسے کتب خانہ میں کتابوں کی داد وستد کا کام
ہے۔ اور بڑی خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے علم کو دوسروں تک پہنچانے میں کوئی تکلف نہ کرتے
حضر ہو یا سفر، گھر ہو یا میدان، دن ہو یا رات، ہر وقت اور ہر جگہ ان کا علمی فیض جاری رہ
تھا۔ درحقیقت وہ علما آج کے عام کتب خانوں اور درس گاہوں سے بھی زیادہ فیض بخش[1]
تھے۔ ہر ضرورت مند کو اپنے سینوں سے سفینے نکال کر دیتے رہتے تھے۔ یہ تھے وہ چلتے پھر
کتب خانے جن کی طرف اس کتاب میں جا بجا اشارہ کیا گیا ہے کہ علما اور اصحاب علم کی تعد
سے کتب خانوں کی تعداد کا اندازہ لگانا چاہیئے۔

اب علمائے سلف کے حافظہ سے متعلق چند واقعات[2] پیش کر دینا مناسب ہوگا تاکہ
معلوم ہو جائے کہ انکے سینوں اور دماغوں کو کتب خانے سمجھ لینا اور انہیں درس گاہوں کی
حیثیت دیدینا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا۔ امام بخاری کے حافظہ کی قوت کی یہ کیفیت تھی کہ
انھیں چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں ان کے شاگرد ابو عیسی (امام ترمذی) جو حدیث سنتے
لکھتے وہ انھیں یاد ہو جاتی تھی انھوں نے ایک شیخ کی روایت کردہ احادیث کے دو اجز
لکھے تھے جب امام صاحب کو یہ احادیث اُن شیخ کو سنانے کا موقع ملا تو اس وقت ان کے
پاس یہ اجزا موجود نہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنے حافظہ سے کام لے کر وہ تمام احادیث ایس
صحت کے ساتھ لفظ بہ لفظ سنا دیں کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہوئی اس قسم کے اور بہت سے وا
ہیں مثلاً ایک اہل علم قرطبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر انھوں نے اپنی کتابوں کی
اشارہ کر کے کہا کہ "ان کتابوں میں سے جس کو چاہو اٹھا لو میں حفظ سنا دوں گا" چنانچہ امت

[1] رسالہ صحیفہ، لاہور (اکتوبر ۱۹۶۲ء) میں ہے کہ ایک نامور ترکی عالم اور مدرس شیخ جمال الدین اقسرائی
حلقہ درس میں حکما کا جم غفیر رہتا تھا انھوں نے اپنے شاگردوں کو تین طبقوں میں رکھا تھا۔ ایک طبق
تھا کہ جب شیخ گھر سے مدرسہ کی جانب روانہ ہوتے تو ان کے ساتھ جاتا تھا اس طبقہ کو مشائیوں کہتے
یعنی پیدل چل کر سبق لینے والے۔ دوسرا وہ تھا جو مدرسہ کے باہر رواق (مسقف دالان) میں سبق حا
کرتا یہ رواقیون کہلاتا تھا یعنی رواق میں تعلیم حاصل کرنے والے۔ تیسرا وہ تھا جو مدرسہ کے اندر
سے تعلیم پاتے تھے [2] یہ علمائے سلف (مولانا حبیب الرحمٰن شروانی) سے ماخوذ ہیں۔ ص ۴۱، ۴۲، ۴۴

ایک کتاب اٹھالی گئی اور وہ ساری کتاب انھوں نے سنا ڈالی۔ امام ابوسعید کو صحیح مسلم حافظ ابوالحسن اصفہانی کو صحیح بخاری و صحیح مسلم اور امام تقی الدین بعلبکی کو الجمع بین الصحیحین صحیح مسلم اور اکثر مسند امام احمد بر زبان تھی۔ امام آخر الذکر ایک جلسہ میں ستر حدیثیں حفظ کر لیتے تھے ایک بار ایک دن سے کم میں انھوں نے مقاماتِ حریری کے تین مقالے ازبر کر لئے۔

دراصل یہ سب شوق علم کی کرامتیں تھیں اس زمانہ میں یہ شوق عشق کے حدود میں داخل ہو گیا تھا آیئے اس عشقِ بے پایاں کے دو نمونے بھی دیکھ لیجئے۔ امام طبرانی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کا علمی خزانہ اس قدر مالا مال کیوں کر ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ "جانِ عزیز تیس برس میری کمر نے بوریئے کے سوا کسی بستر کا لطف نہیں اٹھایا" اور جب علامہ ابن العلاء سے کسی نے پوچھا کہ علم کب تک حاصل کرنا چاہیئے تو انھوں نے جواب دیا۔ "جب تک حیات مہربان رہے" اسے پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سامنے آجاتی ہے کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ یعنی ماں کی آغوش سے لے کر گوشۂ قبر تک علم حاصل کرتے رہو۔

مرو

یہ شہر جو کبھی اہل علم اور کتابوں کے ذخائر سے معمور تھا اب روسی ترکستان کا ایک معمولی شہر ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس کا مرتبہ یہ تھا کہ ابوسعید ابوالخیر[1] (متوفی ۴۴۰ھ۔ ۱۰۴۹ء) فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہاں ابوعبداللہ الحضری کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جو اس زمانہ کے مشہور رفقیہ اور علم طریقت کے عالم تھے۔ فلسفہ اور علم ہیئت کے ایک مشہور عالم ابن فوطی (متوفی ۷۲۳ھ۔ ۱۳۲۳ء) کا آبائی وطن مرو ہی تھا وہ علم ہیئت پر عبور رکھنے کی وجہ سے علم ہیئت کے عظیم الشان کتب خانہ مراغہ کے مہتمم مقرر ہو گئے تھے۔ بغداد کے مدرسۂ مستنصریہ کے کتب خانے کے بھی مہتمم رہے۔ ابن فوطی تراسی (۸۳) کتابوں کے مصنف تھے ان میں سے مختصر اخبار الخلفاء العباسیین دس جلدوں میں تھی۔

دس کتب خانے

اس علمی بستی میں اتنے اعلیٰ درجہ کے کتب خانے تھے جن سے یاقوت حموی نے اپنی کتاب "معجم البلدان" مرتب کرتے وقت استفادہ کیا تھا یہاں کے دس کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے[2] جن میں یہ تین خاص اہمیت کے حامل تھے "کتب خانہ عزیزیہ جسے چھٹی صدی ہجری میں عزیز الدین حاجب نے قائم کیا تھا کتب خانہ مدرسہ نظامیہ اور کتب خانہ الدمریہ"۔

مرو کے کتب خانوں کی یہ خصوصیت تھی کہ ان سے اہل علم بہ آسانی استفادہ کر سکتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یاقوت حموی کو الدمریہ کے کتب خانہ سے تقریباً دو سو کتابیں بلا ضمانت مستعار مل گئی تھیں۔ یاقوت (متوفی ۶۲۷ھ۔ ۱۲۲۹ء) نے جغرافیہ داں کی حیثیت سے بڑا نام پایا جغرافیہ پر عربی میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں یاقوت کی معجم البلدان نہایت جامع اور مستند کتاب تھی اس کے علاوہ اس نے اور بھی کتابیں لکھیں جن میں معجم الادباء ایک اہم ادبی ڈکشنری کہی جاتی ہے۔

[1] آپ کے حالات اور کرامات وغیرہ پر ایک کتاب "اسرار التوحید" مولفہ محمد ابن منور ہے [2] اولگا پنٹو ص ۲۰

بخارا

اسلام کے ابتدائی دور کی علمی بستیوں میں بخارا کو بڑی فضیلت حاصل تھی اس زمانہ سے یہاں جو کتب خانے اور مدرسے قائم ہوئے ان کا اندازہ علمائے بخارا کے مزارات کی زیارت کرنے کے بعد ہو سکتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ تمام علمائے بخارا کے مزارات پر ان کے اور ان کی تصنیفات کے نام لکھے ہوئے ہیں اسی شہر میں امام بخاریؒ (محمد بن اسمٰعیل) ۱۹۴ھ (۸۱۰ء) میں پیدا ہوئے تھے وہ اتنے جلیل القدر محدّث تھے کہ ان سے حدیث کا درس لینے کے لئے دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں سے طلبا بخارا آیا کرتے تھے۔ ان کی تصانیف میں بخاری شریف نے بڑی اہمیت و مقبولیت پائی۔ اس کا فیض نوے ہزار آدمیوں نے بلا واسطہ امام بخاری سے حاصل کیا بخاری کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اسے قرآن کریم کے بعد صحیح ترین مانا گیا ہے۔

کتب خانہ نوح بن منصور

بخارا سامانیوں کا پایہ تخت اور بڑے بڑے علماء و مصنفین کا مرکز تھا یہاں نوح بن منصور (متوفی ۳۸۷ھ۔ ۹۷۷ء) نے اکیس برس نہایت شان و شوکت سے حکومت کی اور کتابیں جمع کرنے میں غیر معمولی انہماک دکھایا اس نے ایک عظیم کتب خانہ قائم کیا تھا اسے علامہ ابن خلکان نے عدیم المثال بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اسمیں ہر علم و فن کی کتابیں تھیں اور ان میں بہت سی ایسی تھیں جنکا پتہ اس کتب خانہ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا تھا اس قیمتی کتب خانہ سے یگانۂ روزگار طبیب بوعلی سینا نے بھی استفادہ کیا تھا وہ اس کے مہتمم بھی رہے تھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ " میں نے ایسی کتابیں دیکھیں جن کے نام بھی بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں ہیں اس سے قبل یا بعد میں نے کتابوں کا ایسا ذخیرہ نہیں دیکھا تھا" نوح بن منصور کے کتب خانہ کی عمارت حسب بیان بوعلی سینا بہت سے کمروں پر مشتمل تھی ہر فن کیلئے جدا کمرہ تھا اور ہر کمرہ میں صندوقوں کے اندر کتابیں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔

سامانی حکمراں فارسی اور عربی ادبیات کی سرپرستی کے لئے مشہور ہیں ان کے عہد میں فارسی کی خاص طور پر ترقی ہوئی متعدد کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے جن میں تفسیر طبری اور تاریخ طبری کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کا مترجم سامانیوں کا وزیر ابو علی

محمد بلعمی ہے اس دور کے فارسی شعراء میں ایک عظیم شاعر رودکی (متوفی ۳۲۹ھ/۹...
سلطنتِ سامانیہ کا ملک الشعراء تھا وہ مادر زاد نابینا ہونے کے باوجود اتنی اع...
صلاحیتوں کا مالک تھا کہ اس نے ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ایک دیوان مرتب کر دیا تھا لیک...
سامانی سلطنت کا نام جسکی بدولت آج بھی تاریخ میں روشن ہے وہ نوح بن منصور کالاثانی کتب خانہ ہی ہے

سمرقند

کتب خانوں کی توسیع و ترقی کے سلسلہ میں سمرقند کو خاص اہمیت حاصل ہے جیسا کہ پہلے
آچکا ہے یہاں دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں کاغذ کی صنعت کی بنیاد رکھی گئی
جس نے عالم اسلامی میں تحریری سرمایہ کی ترقی اور کتب خانوں کی توسیع کیلئے دروازے کھولدیے اور سمرقند
کا نام تمام دیار و امصار میں کاغذ کیلئے مشہور ہوگیا۔ یہ شہر بھی مدتوں علم و فضل کا گہوارہ رہا۔ سامانی
اور خوارزم شاہیوں کے عہد میں اس نے علم و ادب میں خاص شہرت حاصل کی اس شہر میں بہت سے ار...
علم پیدا ہوئے۔ مثلاً چہار مقالہ کا مصنف نظامی عروضی اور تذکرۃ الشعراء کا مصنف دولت شا...
جنہوں نے یہ کتابیں علی الترتیب ۵۵۰ھ (۱۱۵۵ء) اور ۸۹۲ھ (۱۴۸۶ء) میں لکھی تھیں۔

علم ہیئت کے خصوصی کتب خانے سمرقند علم ہیئت کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ اس کا نام ہیئت کے بڑے بڑے مر...
بغداد، دمشق، قرطبہ، طلیطلہ اور فاس کے ساتھ آتا ہے تیمور نے سمرقند...
ایک رصدگاہ تعمیر کی تھی اور اسے اپنی عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت بنایا تھا اس کے پوتے الغ بیگ
نے یہاں ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں ایک رصدگاہ بنوائی اور چار علماء صلاح الدین موسی المعروف بہ قاضی
زادہ رومی، ملا علاؤالدین علی قوشجی، غیاث الدین جمشید اور معین الدین کاشانی کی مدد سے "زیج الغ بیگ"
تیار کی اور ایسے آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے۔ الغ بیگ بڑا ذی علم تھا اور علم ہیئت
نہایت گہرا شغف رکھتا تھا وہ ایک عرصہ دراز تک سمرقند پر حکومت کرتا رہا۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس کے
عہد میں یہ شہر اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا تھا مگر اس دور کے کتب خانوں کا وہ ذکر نہیں
حالانکہ مراغہ کا کتب خانہ بتاتا ہے کہ اس زمانہ میں رصدگاہوں کے ساتھ بھی کتب خانے ہوا کرتے
تھے جن کا شمار علم ہیئت کے خصوصی کتب خانوں میں ہوتا تھا۔

مراغہ

علم ہیئت کا عظیم الشان کتب خانہ

جب ہلاکو خاں (متوفی ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی تحریک پر ایک رصدگاہ مراغہ میں تعمیر کی تو اس کے ساتھ کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں چار لاکھ کتابیں تھیں
[illegible]یں بغداد، شام وغیرہ کے تباہ شدہ کتب خانوں کی بچی کھچی کتابوں کے ذخائر بھی شامل
اس رصدگاہ کی تعمیر میں اصل ہاتھ خواجہ نصیر الدین طوسی کا ہے جس نے اپنی فہم و فراست سے
[illegible]لے کر ایک نہایت موثر اور دلچسپ مثال ہلاکو کے سامنے اس خوبی سے پیش کی کہ وہ رصدگاہ
[illegible]ے پر راضی ہوگیا۔ اس عظیم رصدگاہ کی یادگار مراغہ آج بھی ایران کے نقشہ پر موجود ہے۔

اس رصدگاہ کے ساتھ ہلاکو کی شخصیت کے عجیب و غریب رخ بھی دیکھیے کہ ایک طرف
[illegible] نے عباسی سلطنت اور اس کے کتب خانوں کو تباہ کیا، بغداد وغیرہ کے باشندوں کا

علوم عرب (جرجی زیدان) ص ۲۲۷۔ ؎ نصیر الدین نے جس طرح ہلاکو کو رصدگاہ بنوانے پر
[illegible] کیا تھا اس کے متعلق صاحب فوات الوفیات کا بیان ہے کہ جب ہلاکو رصدگاہ بنوانے پر کسی
[illegible] آمادہ نہ ہوا تو طوسی نے عرض کیا کہ کسی کو چھت پر ایک طشت دے کر بھیجئے اور
[illegible]یہ ہدایت کر دیجیے کہ جب آپ صحن میں اپنے درباریوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اس وقت وہ
[illegible]ت زور سے نیچے پھینک دے۔ جب ایسا کیا گیا تو طشت کے اچانک گرنے سے سارے
[illegible]یں ہل چل مچ گئی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے لیکن ہلاکو اور طوسی اپنی جگہ
[illegible]ان سے بیٹھے رہے اس پر طوسی نے کہا یہ سچ ہے کہ نجوم سے آئندہ پیش آنے والے واقعات تو نہیں
[illegible]لتے مگر واقعات کا پہلے سے علم ہو جانے کے باعث مصیبت کے وقت سراسیمگی پیدا نہیں ہوتی
[illegible]ہ سکون و اطمینان قائم رہتا ہے جو طشت گرتے وقت ہم دونوں کو حاصل تھا یہ بات ہلاکو
[illegible]ہن میں آگئی اور اس نے رصدگاہ بنوانے کی منظوری دیدی۔

خون بہایا اور دوسری طرف اہل علم کی بھی خوب قدردانی اور سرپرستی کی اس نے خواجہ نصیر الدین
طوسی اور علاؤالدین عطا ملک جوینی جیسے ذی علم حضرات کو اپنا وزیر و مشیر بنایا۔ مراغہ کے کتب خانہ
کا مہتمم مشہور مورخ و مصنف ابن فوطی کو مقرر کیا۔ ہلاکو کے پڑپوتے یعنی ارغون خان کے بیٹے سلطان
محمد الجائتو (متوفی ۷۱۶ھ جسے محمد خدابندہ بھی کہتے تھے) نے بھی ایک لائق اہل قلم رشید الدین
فضل اللہ ہمدانی کو عہدۂ وزارت پر مامور کیا تھا۔

چند مصنفین اور ان کی تصانیف چنانچہ اس دور کی فتنہ سامانی اور قتل و غارت گری کے باوجود
فارسی میں تصنیف و تالیف کا بہت کام ہوا اور کتب خانوں کی
ترقی کے لئے ایسا اعلیٰ مواد فراہم ہو گیا جو آج تک کام آرہا ہے
نصیر الدین طوسی نے کئی کتابیں لکھیں اور ابن مسکویہ کی "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" کا
فارسی میں "اخلاق ناصری" کے نام سے ترجمہ کیا جو موجودہ تعلیمی نصاب میں بھی شامل ہے اور
اچھے کتب خانہ میں ملجاتی ہے۔ علاؤالدین عطا ملک جوینی کی یادگار "تاریخ جہاں کشا" کی تین
جلدیں ہیں رشید الدین ہمدانی نے "جامع التواریخ" لکھی اس کی ایک کتاب "اسئولہ واجوبہ رشیدیہ"
کا قلمی نسخہ (مکتوبہ ۷۰۹ھ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مولانا آزاد لائبریری میں ہے یہ کہا جاتا ہے کہ
اس سے قدیم نسخہ اور کسی کتب خانہ میں نہیں ہے[1]۔ اسی عہد کا ایک مصنف قطب الدین محمود بن
مسعود شیرازی ہے جس کی "شرح قانون ابن سینا" "شرح حکمت الاشراق" اور "درج التاج" اہم
کتابیں شمار کی جاتی ہیں قطب الدین کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی مجالس
درس سے استفادہ کیا تھا اور مراغہ کی رصدگاہ کے کام میں اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔

نیشاپور

صاحبانِ کمال اس شہر کی خاک سے امام غزالی کے استاد ابوالمعالی جوینی امام الحرمین[2]
(متوفی ۴۷۸ھ) فرید الدین عطار[3] (متوفی ۶۲۷ھ) اور عمر خیام[4] جیسے صاحبان کمال اٹھے۔ امام

[1] مطبوعہ کٹلاگ موسومہ تذکرہ جواہر زواہر، ص ۸۷۔ [2] نام عبدالملک لقب امام الحرمین مکہ اور مدینہ
میں چار سال تک درس دینے کی وجہ سے یہ لقب ہوا [3] عطار صوفیائے کرام میں سے ہیں۔ ان (اگلے صفحہ...

اور بہت سی نامور ہستیوں نے اعلیٰ تعلیم اسی شہر میں حاصل کی تھی جو اس زمانہ میں اعلیٰ درجہ کے مدرسوں اور کتب خانوں سے معمور تھا
نیشاپور میں امام موفق جیسے جید عالم کی درس گاہ تھی جس میں عمر خیام، نظام الملک طوسی
اور حسن بن صباح نے تعلیم پائی تھی۔ امام موفق کے یہ تینوں شاگرد بڑے مرتبہ پر پہنچے۔ خواجہ
نظام الملک طوسی نامور وزیر، مدارس نظامیہ اور ان کے کتب خانوں کا بانی ہوا عمر خیام نے
بہ حیثیت ایک زبردست شاعر اور ماہر نجوم کے بڑی شہرت پائی لیکن حسن بن صباح وہ گمراہ
عالم ہوا جس کی تخریبی سرگرمیاں امت اسلامیہ کیلئے ایک مصیبت بن گئی تھیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بیہقی نام کے تین بلند پایہ محدث، مصنف اور مورخ نیشاپور
میں ہی اعلیٰ التعلیم سے بہرہ مند ہوئے تھے۔ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف بیہقی' ابوبکر احمد بن الحسین
متوفی ۴۵۸ھ۔ ۱۰۶۶ء) نے اپنی عمر کا آخری حصہ نیشاپور میں یوں گذارا کہ تدریس حدیث اور
ہی کتابوں کی نقل کرنے میں مصروف رہتا تھا بیہقی، ابوالفضل (متوفی ۴۷۰ھ۔ ۱۰۷۷ء)
نے مورخ کی حیثیت سے بلند مقام پایا۔ جامع التواریخ بھی تیس جلدوں میں لکھی۔ اور
جلد کے علیحدہ علیحدہ نام رکھ کر کسی نہ کسی غزنوی بادشاہ کے نام منسوب کر دی۔ بیہقی،
ید الدین (متوفی ۵۶۵ھ۔ ۱۱۷۰ء) مختلف مضامین پر ستر سے زائد کتابیں لکھکر ممتاز مصنفین کے صف میں داخل ہوا
اگر ان سب اہل علم کے ذکر کے ساتھ مورخین علم کے اہم مرکز نیشاپور کے تمام کتب خانوں
حال بھی لکھدیتے تو اس موضوع پر کام کرنے والوں کو بڑا اچھا مواد مل جاتا۔ بہرحال ناظرین
بلند پایہ علمی شخصیتوں کا حال پڑھنے کے بعد خود ہی یہاں کے کتب خانوں کو چشم تصور کے سامنے لا سکتے ہیں۔

کتب خانہ ابوعبد الرحمن سُلمی اس کتب خانے کے نادر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بانی شیخ ابوعبد الرحمن
سُلمی (۳۲۵ - ۴۱۲ھ) نیشاپور کے علماء و فضلاء میں نہایت
ہی مقام رکھتے تھے دولت مند گھرانے کے اس فرد نے اپنی دولت و ثروت کا بڑا حصہ علم کی ترویج

بقیہ صفحہ ۹۰ کا) کی معرفت اور تصوف میں بہت سی کتابیں ہیں مثلاً نظم میں مصیبت نامہ' الہٰی نامہ اسرار
مختار نامہ اور منطق الطیر مشہور ہیں۔ غزلیات اور قصائد کا ایک دیوان بھی ہے ۴ عمر خیام نیشاپور میں
۱۰۴۸ء میں پیدا ہوا اور یہیں ۵۲۶ھ میں وفات پائی اس کی مفصل سوانح حیات ملاحظہ ہو "خیام" از سید سلیمان ندوی

اور کتابوں کی اشاعت میں صرف کر دیا تھا "حالات ومقالاتِ صوفیہ"[1] میں ہے کہ

"ابوعبدالرحمٰن نے اہلِ علم کے استفادہ کے لئے قیمتی قیمتی کتابیں خرید کر نیشاپور میں دارالمطالعہ یالائبریری قائم کی نیشاپور کے علماء ومشائخ اپنی ضرورت کی کتابیں اس کتب خانہ سے مستعار لے کر اپنی علمی ضرورت پوری کرتے تھے"

شیخ ابوعبدالرحمٰن علومِ ظاہری اور باطنی میں کامل تھے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "عالم ہی نہ تھے بلکہ عالم گر بھی تھے صرف خود ہی صوفی نہ تھے بلکہ صوفی گر بھی تھے" ان اوصاف کا شہرہ سن طالبانِ علم دور دراز سے تعلیم حاصل کرنے ان کے پاس آتے اور ان کی درس گاہ سے محدث اور مفکر بن کر نکلتے تھے اُس زمانہ میں ان کی درس گاہ علم کا مرکز ومحور بنی ہوئی تھی انھوں نے لائبریری کے علاوہ ایک درس گاہ (مدرسہ سُلمی) بھی نیشاپور میں قائم کی تھی جس کے مصارف وہ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ اس مردِ مومن نے ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی جو اصلاحِ باطن کی تربیت گاہ تھی۔

مختصر یہ کہ شیخ ابوعبدالرحمٰن کی دینی اور علمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے چالیس سال سلسلۂ درس وتدریس جاری رکھا اس کے ساتھ ساتھ وہ پچپن ۵۵ برس تصنیف وتالیف میں مشغول رہے یہ عظیم الشان سرگرمیاں ظاہر کرتی ہیں کہ شیخ کے کتب خانہ میں نادر اور قیمتی کتابوں کی کافی تعداد تھی ان میں بیشتر کتابیں دینی علوم کی تھیں۔

تصانیف جہانتک تصانیف کا تعلق ہے انھوں نے تفسیر، حدیث، تصوف اور اخلاق وغیرہ پر اٹھائیس ۲۸ کتابیں لکھیں جو اتنی جامع اور مستند قرار پائیں کہ ان سے بڑی ممتاز ہستیوں نے فائدہ اٹھایا حالاتِ ومقالاتِ صوفیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنی کتاب "نفحات الانس" لکھتے وقت شیخ کی کتاب "طبقات الصوفیہ" سے استفادہ کیا تھا۔

ان کے علاوہ علامہ ذہبی اپنی کتاب "تاریخ اسلام" اور علامہ خطیب بغدادی اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں اکثر شیخ کی کتاب "تاریخ الصوفیہ" سے نقل کرتے ہیں حضرت ہجویریؒ نے "کشف المحجوب" میں شیخ کی کتاب "تاریخ اہل الصّفہ" کا ذکر کیا ہے اور شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "محاضرات الابرار" لکھنے

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حالات ومقالاتِ صوفیہ، ص ۱۶ تا ۴۳ (ترتیب وترجمہ، محمد ادریس انصاری، ادارۂ تبلیغ الاسلام صادق آباد، پاکستان)

شیخ کی کتاب "مقالات الاولیاء" سے مدد لی ہے۔

گو ابو عبدالرحمٰن کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے ۹۸۶ برس گذر چکے ہیں لیکن انکی معرکۃ الآرا تصانیف کا فیضان اب تک جاری ہے ان کے کچھ قلمی اور نایاب نسخے مصر، استنبول، برلن اور ٹونک (بھارت) وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

چار کتب خانے نیشاپور میں آلِ بویہ کے حکمراں "عضد الدولہ کا کتب خانہ" بھی تھا اس نے شیراز میں بھی کتب خانہ قائم کیا تھا جسکا ذکر آگے آئیگا اسی شہر میں "ابو نصر سہل بن مرزبان" کا کتب خانہ نہایت مشہور تھا ابو نصر کی نسبت علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی تمام دولت کتابیں جمع کرنے میں صرف کر دی ور صرف کتابوں کی تلاش و جستجو میں اکثر بغداد کا سفر کیا اور نادر کتابیں اپنے کتب خانے کیلئے فراہم کیں۔

درس گاہی کتب خانوں میں "مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ" بہت بڑا تھا۔ یہ مدرسہ نظام الملک طوسی نے ابو المعالی جوینی امام الحرمین کے لئے قائم کیا تھا جن کے درس میں روزانہ تین سو طلباء شریک ہوتے تھے امام غزالی اسی مدرسہ کے طالب علم تھے۔

سلجوقی سلطان طغرل بیگ متوفی (۴۵۵ھ - ۱۰۶۳ء) نیشاپور کا بادشاہ رہا اس کے عہد میں یہاں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں طغرل کے وزیر "عمید الملک کندری کا کتب خانہ" اس لئے ممتاز تھا کہ یہ شخص خود بھی علم و فضل میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔

کندری کے علاوہ اور بہت سے اہلِ علم اور شعراء وغیرہ سلجوقی دور میں پیدا ہوئے۔ تصوف اور تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں جن میں حضرت فرید الدین عطارؒ کی "تذکرۃ الاولیاء" اور ابوبکر محمد راوندی کی "راحت الصدور" (سلجوقیوں کی تاریخ) اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔

غرض نیشاپور میں عہد بہ عہد جو کتب خانے اور مدرسے قائم ہوئے ان کی تعداد کا پتا اس سے چل سکتا ہے کہ ۵۵۶ھ (۱۱۶۰ء) میں یہاں کے فسادات کے موقع پر چھبیس مدرسے اور بارہ کتب خانے برباد ہو گئے۔

قزوین

ایران کے اس مردم خیز شہر میں بڑی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں ایک بلند و بالا شخصیت ابن ماجہ (ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی، متوفی ۲۷۳ھ - ۸۸۶ء) کی ہے جو محدث، مفسر اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیف "سنن ابن ماجہ" حدیث کی ممتاز کتاب ہے۔ تفسیر القرآن،

۱؎ رسائل شبلی ص ۳۵۴۔

التاریخ اور تاریخ قزوین بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ حصولِ احادیث کے لئے ان کی والہانہ کوششوں کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں بغداد، کوفہ، بصرہ، دمشق، نیشاپور، مرو، بلخ، اصفہان، بیت المقدس اور تونس وغیرہ کے سفر کئے۔ یہ ہے وہ مقدس سفر جس کے نقشِ جمیل تصنیف وتالیف اور کتب خانوں کی تاریخ میں ہمیشہ درخشندہ رہیں گے۔

کتب خانہ قلعۃ الموت

یہ کتب خانہ قزوین کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے قلعہ میں تھا جو "قلعہ الموت" کے نام سے مشہور ہے اب اس کے کھنڈرات دیکھ کر یہ کتب خانہ اور حسن بن صباح کی بنائی ہوئی جنت یاد آجاتی ہے۔ صباحیہ فرقہ کے بانی حسن[1] بن صباح (متوفی ۵۱۸ھ) نے (۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء) میں اس قلعہ پر قبضہ کر کے اسے اپنی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ یہ قلعہ واقعی موت کا قلعہ تھا کیونکہ یہاں علماء، سلاطین اور وزراء وغیرہ کے قتل کے منصوبے بنائے جاتے تھے جن کی تکمیل حسن بن صباح کے ان مریدین کے ہاتھوں ہوتی تھی جو فدائی[2] کہلاتے تھے اسی گروہ کے ایک فدائی نے کتب خانوں اور مدرسوں کے زبردست علمبردار خواجہ نظام الملک طوسی کو ۱۰۹۲ء میں قتل کر دیا تھا۔

جنت

اس قلعہ الموت کے ساتھ حسن بن صباح کی جنت بھی ایک سرسری نظر سے دیکھ لینا بے موقع نہ ہوگا اس نے یہاں کے شاداب اور خوبصورت قطعات پر خوشنما اور عالی شان عمارات بنوائیں، انھیں عیش وعشرت کے ساز وسامان سے آراستہ کرایا۔ دودھ شراب، اور شہد کو نلوں کے ذریعہ مہیا کیا یہاں خوبصورت لڑکے اور لڑکیاں بطور حور وغلمان آباد کئے عیش ونشاط اور نغمہ وسرود کے اس دلکش مرکز کا نام حسن بن صباح نے جنت رکھا تھا چونکہ قلعہ الموت، جنت اور کتب خانہ۔ تینوں کی یکجائی ایک بڑی عجیب وغریب خصوصیت تھی اسلئے کتب خانہ کیساتھ ان دونوں کا بھی کچھ ذکر کر دیا گیا ہے جسکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک نایاب کتاب

اس موقع پر کتابوں کا یہ اعجاز دیکھیئے کہ وہ اس انسان دشمن علاقہ میں بھی ڈیڑھ سو برس تک اپنی محبت کا سکہ چلاتی رہیں اور کوئی انھیں نقصان نہ

---

[1] اس کی سوانح عبد الرزاق کی نظام الملک طوسی کے ص ۵۰۹ پر دیکھیئے [2] اسی کتاب کے ص ۵۶۰ پر ان مشاہیر اسلام کی فہرست ہے جو فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے

پہنچا سکا۔ ۱۲۵۶ء میں جب قلعہ الموت پر ہلاکو نے حملہ کیا تو اسی کی سلطنت کے ایک رکن علاؤالدین جوینی کی کوشش سے یہ کتب خانہ تباہی سے بچ گیا اس طرح یہاں کی ایک نہایت نایاب کتاب سرگزشت سیدنا[۱] (سوانح حسن بن صباح) محفوظ ہوگئی جسے حسن بن صباح کے استاد عبدالملک بن عطاش نے مرتب کیا تھا اور جو اسمعیلی مذہب کے تاریخ کے لئے اہم مواد فراہم کرتی ہے۔

مشہد

ایران کے شہر مشہد کی تقدیس اور توقیر حضرت امام علی رضاؑ کے مزار اور اس کے کتب خانہ کی بدولت ہے امام صاحب فرقہ امامیہ کے آٹھویں امام ہیں۔ ان کے دادا حضرت جعفر صادق رح (متوفی ۱۴۸ھ) جلیل القدر تابعی اور اتنے بلند پایہ عالم تھے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے ان سے علم حاصل کیا تھا آپ کے بعد مسندِ امامت پر موسیٰ کاظم (متوفی ۱۸۳ھ) متمکن ہوئے ان کے بیٹے امام علی رضاؑ (متوفی ۲۰۳ھ) میں علم اور تقویٰ جمع تھے "صحیفۃ الرضا" طب الرضا اور مسندِ امام رضا" آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ مسندِ امام رضا کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ حبیب گنج لائبریری میں محفوظ ہے یہ ۱۱۱۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ ۵۳ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۹۵ حدیثیں ہیں۔

کتب خانہ مشہدِ مقدس

یہ کتب خانہ صرف ایران ہی میں نہیں بلکہ تمام علمی دنیا میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تقریباً ایک ہزار برس سے اس کا علمی فیض جاری ہے اس کے قیام کی صحیح تاریخ تو نہیں ملتی لیکن ایک بزرگ ابوالبرکات علی ابن حسین نے اپنی جو کتابیں اس کو وقف کی ہیں ان پر وقف کرنے کی تاریخ ۴۲۱ ہجری درج ہے اس حساب سے اس کتب خانہ کی عمر اب ۹۷۵ سال سے زیادہ ہوگئی ہے۔

مشہد مقدس کا کتب خانہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مذہبی کتب خانہ ہے جس کا آغاز مذہبی کتابوں سے ہوا تھا مگر اب اس میں قرآن اور حدیث کے علاوہ حکمت و فلسفہ

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خیام از علامہ سید سلیمان ندوی ص ۔ ۴ ۔

منطق اور فقہ وغیرہ کی بھی کئی ہزار کتابیں موجود ہیں جن میں قرآن کریم کے قدیم قلمی نسخے نہایت قیمتی نوادر شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کتب خانہ کا کٹلاگ "فہرست کتب خانہ آستانہ قدس رضوی" کے نام سے کئی جلدوں میں ایران سے شائع ہوا ہے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نفیس مخطوطات کا کچھ ایسا ذخیرہ بھی موجود ہے جو دنیا کے کسی اور کتب خانہ میں نہیں ہے۔

شیراز

ایران کے مرکزی شہر شیراز کا علمی وقار ظاہر کرنے کے لئے صرف شیخ سعدی (مصلح الدین متوفی ۶۹۲ھ) اور حافظ شیرازی (محمد شمس الدین متوفی ۷۹۲ھ) کا نام لینا کافی ہے جنھوں نے فارسی ادبیات کا چہرہ منور کر دیا ہے۔ ان کی تصانیف گلستان، بوستاں، اور دیوان حافظ نے اتنی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے کہ یہ آج کل کے کتب خانوں کا بھی نہایت قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

کتب خانہ عضدالدولہ

لیکن ان دونوں عظیم شعراء سے کئی سو برس پہلے بھی شیراز کی سرزمین علمی چرچوں سے گونج رہی تھی جس کی نشانی خاندان بویہ کے علم پرور تاجدار عضدالدولہ (متوفی ۳۷۲ھ/۹۸۲ع) کا کتب خانہ تھا جس میں عضدالدولہ نے وہ تمام کتابیں جمع کر دی تھیں جو ابتدائے اسلام سے اس کے عہد تک تصنیف ہوئی تھیں بادشاہ کے جس محل میں یہ کتب خانہ تھا اس کے متعلق علامہ بشاری[1] کا بیان ہے کہ "میں نے تمام ممالک اسلامیہ میں ایسی عمارت نہیں دیکھی اور میں قیاس کرتا ہوں کہ وہ بہشت کے نمونے کے مواقف بنائی گئی ہے علامہ موصوف نے لکھا ہے کہ ایک نہایت لمبا مکان ہے اور اس میں ہر طرف متعدد کمرے ہیں جن میں بہت سی الماریاں دیوار سے لگی کھڑی ہیں۔ یہ الماریاں تین تین گز چوڑی اور قد آدم اونچی ہیں لکڑی عموماً منقش اور مُذہّب ہے ہر فن کے لئے جدا کمرہ ہے اور اس کی جداگانہ فہرست[2] ہے۔"

---

[1] مصنف "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم"۔ [2] رسائل شبلی ص ۳۶۔

[ک]تب خانہ ابن عمید

خاندانِ بویہ کے وزرا میں ابن عمید اور صاحب بن عباد کے کتب خانے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ابوالفضل ابن عمید (متوفی ۳۶۰ھ - ۹۷۰ء) بڑا صاحب علم و فضل تھا اس کے کتب خانہ میں ہر علم و فن کی کتابیں سو اونٹوں کے [بو]جھ کے برابر تھیں جنھیں وہ نہایت عزیز رکھتا تھا اس کتب خانہ کے مہتمم مورخ ابن مسکویہ نے لکھا ہے[۱]

"اُس وزیر کے مکان کو ڈاکوؤں نے اس قدر لوٹا تھا کہ پانی پینے کا ایک پیالہ اور بیٹھنے کو چٹائی تک باقی نہ رہنے دی لیکن اسے اس کی کچھ پرواہ نہ تھی اس کا دل تو اپنے کتب خانہ میں لگا ہوا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کتب خانہ کی نسبت دریافت کیا میں نے عرض کی کتابیں سب کی سب بچ گئی ہیں۔ اور ایک بھی گم نہیں ہوئی اس پر اس نے کہا واقعی تم بڑے نیک شگون ہو ہمیں ہر چیز مل سکتی ہے مگر یہ کتابیں کہاں سے ملتیں میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر بشاشت نمودار ہوگئی"۔

[ک]تب خانہ [ص]احب بن عباد

یہ کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں صرف دینیات کی کتابیں چار سو اونٹوں کا بوجھ تھیں[۲] کتب خانہ کی فہرست دس جلدوں میں تھی اس وزیر کا نام ابوالقاسم اسمٰعیل بن عباد اور لقب صاحب تھا وہ اپنے زمانہ کا علامہ [اور] ستره کتابوں کا مصنف تھا۔

صاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ - ۹۹۵ء) کو اپنے کتب خانہ سے اتنی الفت تھی کہ جب [س]امانی خاندان کے فرماں روا نوح بن منصور نے اسے وزارت کے لئے بخارا بلایا تو اس نے یہ [عہد]ہ قبول کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ اسے اپنا کتب خانہ لے جانے میں بڑی دشواری ہوگی [ابن] عباد کتب بینی کا بھی اتنا شائق تھا کہ سفر میں تیس اونٹوں پر کتابیں ساتھ رہتی تھیں۔

[ح]اصل یہ کہ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ عرب [او]ر شام، عراق، ایران، اور افغانستان وغیرہ اسلام کے زیر نگیں آ کر علم و فن کے مخزن بنگئے تھے [ع]لاقوں پر مختلف حکمراں[۹۳] خاندان اموی، عباسی، سامانی، غزنوی، بویہ، سلجوقی، زنگی، ایوبی،

---

[۹۳] ادلگا بنیڈوص اسکے تمام مسلم حکومتوں کی مختصر داستان سالنامہ نگار ۱۹۵ء (فرماں روایان اسلام نمبر) میں دیکھئے

تیموری، صفوی اور قاچاری وغیرہ اپنے اپنے زمانوں میں حکومت کرتے رہے مگر اس دور کی تا
کا روشن پہلو یہ ہے کہ ہر عہد میں بکثرت کتب خانے اور مدرسے وجود میں آئے بیشمار محدث، فقیہ
صوفیا، اولیا، شاعر، ادیب، مورخ، فلاسفر، منجم و خطاط پیدا ہوئے جن کے نام رہتی دنیا تک تا
میں باقی رہیں گے۔

صرف ایران کو لیجئے جہاں ظہور اسلام کے وقت ساسانی حکومت کر رہے تھے اگرچہ انھو
نے یہاں چار سو برس تک حکمرانی کی اور ان کو اپنی دولت و حشمت اور تہذیب و تمدن پر اتنا نا
تھا کہ وہ اپنے آپ کو خداؤں کے خدا سمجھتے تھے مگر ان کی خدائی میں علم کا کچھ بھی بھلا نہ ہوا۔ ا
وہ بقول مورخین صرف درباریوں اور مذہبی پیشواؤں تک محدود رہا جب عرب ایران آ
اور انھوں نے نہاوند[1] کی جنگ میں ساسانی سلطنت کا چراغ گل کر دیا اس وقت ایران
میں علم و ادب کی ترقی کا آفتاب طلوع ہوا اسلامی ایران میں وہاں کے قدیم علوم کو جو عروج
ملا اور انھیں عربی قالب میں ڈھال کر جس طرح سربلند کیا گیا اس کی تفصیلات براؤن[2] او
ڈاکٹر رضا زادہ[3] شفق کی کتابیں واضح اور جامع طور پر پیش کر رہی ہے مثال کے طور پر یہ
قاآنی کے صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ شیراز کے متعلق ہے مگر حقیقت
میں ایران کے دوسرے شہروں اصفہان اور تبریز وغیرہ بلکہ اس زمانہ کی اسلامی دنیا کے
شہر کی تصویر اس میں نظر آتی ہے۔

ہزار محفل و در ہر یکے ہزار ادیب : ہزار مدرس و در ہر یکے ہزار اسفار[4]

---

[1] نہاوند کی جنگ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوئی اس میں تقریباً تیس ہزار ایرانی مارے گئے اور ایرانیو
کا زور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ چونکہ نہاوند کی فتح سے پورے عراق و عجم مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے تھے اس
لئے اس فتح کو فتح الفتوح کہتے ہیں۔ [2] BROWN - HISTORY OF PERSIAN
LITERATURE [3] تاریخ ادبیات ایرانی از ڈاکٹر رضا زادہ شفق مترجمہ سید مبارز الدین
رفعت۔ [4] اسفار بمعنی کتابیں۔

قسطنطنیہ

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ترکوں کے علمی کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ قابل فخر ہے وہ کتب خانے ہیں عیسائی مورخین کریزی[1]، ایورسلے[2] اور لارپنٹ[3] وغیرہ نے بھی ترکوں کی علم دوستی کی بہت تعریف کی ہے۔ مصنف "دولت عثمانیہ" کا بیان ہے کہ سلطان اورخان نے ازنیق میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو سلطنت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا چونکہ کتب خانے مدرسوں کا جزو لاینفک ہیں اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ سلطنت عثمانیہ میں کتب خانوں کے قیام کی ابتدا ترکی حکومت کے دوسرے بادشاہ اورخان متوفی (۱۳۵۹ء) کے عہد میں ہوگئی تھی اس کے بعد دوسرے ترکی سلاطین اور دیگر اصحاب ذوق نے کتب خانے قائم کئے اور مدرسے کھولے کہا جاتا ہے کہ ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو۔ اس طرح ہر دور میں درس گاہیں کتب خانے موجود تھے خصوصاً سلطان محمد خاں ثانی (متوفی ۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ کے عہد میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اس سلطان کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے تعلیم پھیلانے میں بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا اپنی مملکت کے ہر قصبہ اور ہر شہر میں مدارس[4] کھولے قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ ہاؤس تھے۔ مصنف دولت عثمانیہ کے اس بیان میں اتنا اضافہ کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ ان سارے مدرسوں کے ساتھ کتب خانے بھی موجود تھے۔

---

(1) CREASY. HISTORY OF OTTOMAN TURKS.

(2) EVERSELEY. TURKISH EMPIRE (3) LARPENT TURKEY.

[4] تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ شبلی کا رسالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" اور ڈاکٹر محمد عزیز کی دولت عثمانیہ جلد دوم ص ۳۹۰۔

کتب خانے کتب خانوں اور مدرسوں کو ترقی دینے میں سلیمان اعظم (متوفی ۱۵۶۶ء) نے بھی نمایاں حصہ لیا اس نے تعلیمی نظام کو اتنی وسعت دی کہ مکہ معظمہ میں بھی چار مدرسے قائم کر دیے اس زمانہ کے کتب خانوں میں سلیمان کے وزیر اعظم "رستم پاشا کا کتب خانہ" بھی تھا جس میں قرآن پاک کے چھ سو نسخے اور پانچ ہزار دوسری کتابیں تھیں سلطان احمد ثالث (متوفی ۱۷۳۰ء) کے عہد میں مطبع جاری ہو جانے کی وجہ سے کتب خانوں کی ترقی کی راہیں کشادہ ہو گئیں۔ محمود اول متوفی ۱۷۵۴ء نے قسطنطنیہ میں "چار عظیم الشان کتب خانے" قائم کئے اور جامعہ نور عثمانی کی تعمیر شروع کی مگر اس دور میں کریمیا کی جنگ سے کتب خانوں کی ترقی کی ساری تدبیریں خاک میں مل گئیں روسی فوجوں نے شہروں اور قصبوں میں آگ لگا دی اور باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ قدیم یادگاریں بے رحمی کے ساتھ مٹا دیں اور کتب خانے و مدرسے شعلوں کی نذر کر دیے[۱]

لیکن ان علمی نقصانات کی تلافی مصطفیٰ ثالث (متوفی ۱۷۷۳ء) اور سلیم ثالث (متوفی ۱۸۰۷ء) کے عہد میں ہو گئی[۲] لکھا ہے کہ مصطفیٰ کے زمانے میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر ۲۷۵ مدرسے یا یوں کہیئے کہ "۲۷۵ درس گاہی کتب خانے" تھے اس بادشاہ کے صدر اعظم راغب پاشا نے بھی اپنی جیب خاص سے ایک عام کتب خانہ قائم کیا تھا جو "کتب خانہ راغب پاشا" کے نام سے مشہور ہے۔ سلطان سلیم ثالث کے عہد میں بھی بہت سے نئے مدرسے قائم ہوئے اور ایک جدید بحری مدرسہ کھلا اس دور کے درس گاہی کتب خانوں میں "مدرسہ توپچیہ کا کتب خانہ" نہایت اہم تھا اسمیں کتابوں کی تعداد تو صرف چار سو تھی مگر یہاں وہ تمام اہم کتابیں جمع تھیں جو یورپ میں جدید فنون جنگ اور ریاضیات پر لکھی گئی تھیں[۳]

اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ترکوں کی عظیم الشان فتوحات سے ترکی کتب خانوں کو بے انتہا نفع پہنچا۔ سلطان محمد خان ثانی نے ۱۴۵۳ء میں مسیحی یورپ کے مرکز قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تھا سلطان سلیم اول (متوفی ۱۵۲۰ء) کے عہد میں مصر، شام اور حجاز بھی ترکی سلطنت میں شامل ہو گئے ۱۶۳۸ء میں مراد چہارم نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ ان فتوحات میں دولت

۱-۳ دولت عثمانیہ از ڈاکٹر محمد عزیر جلد اول ص ۲۲۹، ۲۴۹-۲۵۱۔

بنی امیہ اور بنی عباس کا علمی اندوختہ ترکوں کے ہاتھ آیا ہوگا اور وہ بچی کھچی کتابیں انھیں ملی ہونگی۔ جو کبھی بغداد، قاہرہ، دمشق وغیرہ کے کتب خانوں میں تھیں جس کی تصدیق علامہ شبلی کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تھے انھوں نے اپنے سفرنامہ[۵] میں لکھا ہے کہ "یہ شہر تمام اسلامی دنیا میں عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے یہاں ۴۵ کتب خانے، ۱۶۴ مدارس قدیم ۵۰۰ مدارس جدید اور بارہ کالج ہیں"۔ قسطنطنیہ کا شاہی کتب خانہ" شبلی نے نہایت قدیم بتایا ہے اور پچھلے سلاطین اور اُمراء وغیرہ کے کتب خانوں کے نام بھی دیدیے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

کتب خانہ جامع ایاصوفیہ، کتب خانہ جامع بایزید، کتب خانہ حمیدیہ قدیم، کتب خانہ جامع محمد فاتح، کتب خانہ علی پاشا شہید، کتب خانہ لالہ لی، کتب خانہ اغلی علی پاشا، کتب خانہ عاشر آفندی، کتب خانہ سلیمیہ، کتب خانہ جامع والدہ سلطان، کتب خانہ شہزادہ داماد ابراہیم پاشا، کتب خانہ سلیمانیہ،

ان کتب خانوں میں بقول علامہ شبلی کتابوں کی مجموعی تعداد بچاسی ہزار تھی عہد عباسی میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے ان میں سے کچھ اس وقت تک یہاں محفوظ تھے عبدالقاہر جرجانی کی اسرار البلاغہ، یاقوت حموی کی معجم الادباء، البلاذری کی کتاب الاشراف اور امام بخاریؒ کی تاریخ کبیر کے صحیح اور مستند نسخے یہاں شبلی کی نظر سے گزرے تھے وہ لکھتے ہیں کہ تاریخ و ادب کی نایاب تصنیفات مشہور حکماء اور ائمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ امام غزالی، بو علی سینا، فخر الدین رازی، اور فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جنکے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں اکثر یہاں موجود ہیں کتب خانہ ایاصوفیہ میں ایک جرمن مستشرق ہلمٹ رٹر (HELMUT RITTER) کو دیوان حافظ کا ایک نسخہ ملا تھا جسکی کتابت سنہ ۸۱۳ھ اور ۸۱۷ھ کے درمیان ہوئی تھی اور جو اس وقت تک دریافت شدہ نسخوں میں سب سے قدیم کہا جاتا ہے[۶]۔

یہ ہی وہ کتابیں ہیں جنھیں دیکھکر بقول علامہ شبلی حیرت ہوتی ہے کہ ان کتابوں کے ایسے عجیب و غریب نسخے کہاں سے بہم پہو نچائے ہیں۔

---

۵ سفرنامۂ روم و مصر و شام از شبلی نعمانی ص ۳۶، ۸۱ - ۹۱ ۶ مجلہ علوم اسلامیہ (ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) جلد (۱)، ص ۵۹ -

شمالی افریقہ

شمالی افریقہ کے خشک صحراؤں میں مسلمانوں کے قدم سے علم و فضل کے جو چشمے پھو
تھے وہ کتب خانہ جامع زیتونیہ تولنس، کتب خانہ رباط مراکش، کتب خانہ مدرسہ تلمسان کی
شکل میں آج تک موجود ہیں۔

افریقہ کو عقبہ بن نافع نے فتح کر کے ۵۵ھ/۶۷۵ء میں شہر قروان کی بنیاد ڈالی۔ او
مسجد قروان تعمیر کی۔ وہ اسلامی قلم و کو بڑھانے کی ایسی تڑپ اور لگن رکھتے تھے کہ خشکی
ختم ہونے کے بعد انھوں نے اپنا گھوڑا بحر اوقیانوس میں ڈال دیا اور نعرۂ تکبیر بلند کر کے کہ
"اگر مجھے سمندر نہ روک لیتا تو میں خدا کا نام اور پیغام سارے مغرب میں پہونچا دیتا" ان
اس کارنامہ عجیب کو ڈاکٹر اقبال نے "شکوہ" کے ان اشعار میں قلمبند کر دیا ہے ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہمنے ÷ بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

افریقہ میں مسلمانوں کی آمد کے وقت زیادہ تر بربری قوم آباد تھی جو اپنی وحشت او
بربریت کے لئے مشہور رہے لیکن اسلام کے اثر سے یہ لوگ مہذب اور شائستہ ہوئے اور ا
میں پڑھنے پڑھانے اور کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا جب دوسری صدی ہجری میں
افریقہ کا رشتہ عباسی سلطنت سے منقطع ہو گیا تو بربری خاندانوں (ادریسی، مرابطین، موحد
میرینی اور حفصی) کی یکے بعد دیگرے حکومتیں قائم ہوتیں۔

کتب خانہ مدرسہ صفارین میرینی سلطان یعقوب بن عبد الحق (۵۹۱/۶۶۱۹ء ۱۱۹۴/۱۲۱۷ء) نے
کتب خانہ قائم کیا تھا بقول اولگا نیٹو اس میں زیادہ تر وہ کتابیں تھیں
جو موصوف نے اسپین کے مغلوب بادشاہ سانچو (SANCHO) کے
پاس سے طلب کی تھیں[1]۔

---

[1] اولگا نیٹو۔ ص ۲۱۔

کتب خانہ فاس تمدن عرب میں ہے کہ فاس (F A S) کا شہر دسویں صدی عیسوی میں بغداد کا مدمقابل تھا اس زمانہ میں مراکش کے اس شہر کو اتنا عروج ملا کہ یہاں پانچ لاکھ باشندے اور آٹھ سو مساجد تھیں۔ ان مسجدوں سے منسلک کتب خانوں کی تعداد بھی آٹھ سو ہی ہوگی۔ فاس کے کتب خانے کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ بیش بہا یونانی اور لاطینی قلمی کتابوں سے معمور تھا۔

مراکشی کتب خانوں پر ایک نظر

مرابطی خاندان کے فرماں روا یوسف بن تاشقین کے عہد ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء تا ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء میں "مراکش کے کتب خانے" کافی ترقی کر گئے تھے۔ اس بادشاہ نے مراکش آباد کیا اور رفتہ رفتہ تمام اسلامی اندلس پر قبضہ کر لیا تھا ان فتوحات کی بدولت اندلس سے علمی رابطے بھی قائم ہوئے اور وہاں کی سیکڑوں بہترین کتابیں مراکش پہنچ گئیں جن سے کتب خانوں کے ذخائر میں بڑا اچھا اضافہ ہو گیا۔ یوسف اور اس کا جانشین علی بڑے عابد و زاہد اور علم پرور تھے مگر انھوں نے یہ زیادتی کی کہ علم کلام اور فلسفہ کی کتابوں کو کتب خانوں سے نکلوا دیا کیونکہ ان بادشاہوں کا رجحان مالکی فقہ کی طرف حد سے زیادہ تھا اور وہ فلسفہ و علم کلام کے اتنے شدید مخالف ہو گئے تھے کہ امام غزالی کی تصانیف رکھنے والوں کو گردن زدنی قرار دیدیا تھا ان کا یہ طرز عمل بالآخر مرابطین کی تباہی کا سبب بن گیا۔ مورخ اکبر شاہ خاں کا بیان ہے کہ ایک روز کسی نے امام غزالیؒ سے کہا کہ علی بن یوسف بن تاشقین نے آپ کی کتابیں جلا ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کا ملک برباد ہو جائیگا اور ابن تومرت جو اس وقت موجود تھا اس کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ علی کے ملک و سلطنت کی بربادی اس شخص کے ذریعہ عمل میں آئیگی امام غزالی کی یہ پیشینگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور مرابطین کی جگہ موحدین آگئے۔

موحدین کے عہد میں مراکش کے کتب خانے امام غزالی کی تصانیف اور فلسفہ و علم کلام کی کتابوں سے معمور ہو گئے اس زمانہ میں دینی علوم کے علاوہ فلسفہ نے بھی بڑی ترقی کی اور

---

۱ - ۲ تمدن عرب - ص ۴۱۲ -

سے پڑھی جانے لگیں گو موحدین سلطنت کے بانی محمد بن عبداللہ تومرت (متوفی ۵۲۲ھ ۱۱۲۹ء) نے علوم دینیہ اور فقہ وغیرہ کی تعلیم مولانا ابوبکر شاشی سے حاصل کی تھی لیکن انھوں نے امام غزالی کی تصانیف سے بھی استفادہ کیا تھا تومرت نے مرابطین کی سلطنت کا خاتمہ کر کے موحدین کی حکومت قائم کر دی تھی اس کا جانشین عبدالمومن ہوا۔ اس کے بیٹے ابویعقوب یوسف کے عہد (۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء - ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء) میں اس کی سلطنت نے اتنی ترقی پائی کہ یہ بادشاہ دنیا کے عظیم الشان بادشاہوں میں شمار ہونے لگا۔

کتب خانہ ابویعقوب یوسف ابو یعقوب نے اپنے علمی ذوق کی بنا پر جو کتب خانہ قائم کیا تھا وہ بڑا عظیم الشان کہا جاتا ہے یہ بادشاہ علم دوست اور اہل علم کا بڑا قدردان تھا اس کے مصاحب اور مشاہیر میں ابن طفیل بھی شامل تھے جو فلسفہ اور علم کلام کے امام مانے جاتے ہیں ڈی بوئر (DE BOER) نے لکھا ہے[1] کہ ابن طفیل کو انسانوں کی بہ نسبت کتابوں سے زیادہ محبت تھی اپنے آقا کے عظیم الشان کتب خانہ میں اس نے بہت سی کتابیں پڑھیں جن کی اسے اپنے فن کے لئے ضرورت تھی یا جن سے اس کے علم کی پیاس بجھتی تھی"۔

ابو یعقوب یوسف کے بعد بھی اس کے کتب خانہ کی عظمت برقرار رہی ہو گی کیونکہ اس کے بیٹے ابو یوسف یعقوب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "ہر طرح اپنے باپ سے مشابہ تھا۔ علماء و فضلاء کا قدردان اور کتابوں کا شائق تھا"

قرآن مجید کیلئے ایک مرصع رحل اور ایک عجیب و غریب چراغ دان دراصل ان باپ بیٹے کو علم اور کتابوں سے شغف ورثہ میں عبدالمومن سے ملا تھا جو مذہبی علوم سے گہری رغبت رکھتا تھا چنانچہ اس کے عہد میں مختلف مقامات سے جو کتابیں مراکش پہنچیں ان میں حضرت عثمانؓ کے عہد کا ایک قرآن مجید بھی تھا جسکو اس نے بڑے احترام اور اہتمام کے ساتھ جامع مسجد مراکش میں رکھدیا تاکہ عوام اسکی زیارت اور تلاوت کر سکیں۔ عبدالمومن نے اپنے دین کی اس عالی مرتبت کتاب سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار یوں کیا کہ حسب بیان علامہ مقری[2] "اس قرآن پاک کو ایک عجیب و غریب

---

[1] ڈی بوئر کی "تاریخ فلسفہ اسلام" کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر عابد حسین ص ۲۲۲؛ [2] نفح الطیب از علامہ مقری (اردو ترجمہ ص ۳۲۰)

طریقہ پر سونے اور چاندی سے منڈھا گیا۔ کناروں پر ایسے بیش قیمت یاقوت، موتی زمرد سے کام کیا گیا کہ جو بہت کم بادشاہوں کے خزانے میں نکلیں گے آبنوس اور دوسری قیمتی لکڑیوں کی ایک منقش رحل بنائی گئی اور ایک تخت بنایا گیا جس پر یہ قرآن شریف رکھا جاتا تھا یہ تمام چیزیں مرصع تھیں اس کے علاوہ ایک صندوق بھی ایسا ہی بیش قیمت تیار کرایا گیا اور ایسا ہی ایک چراغ دان تیار ہوا چراغ دان کو کھولنے سے قرآن شریف خود بخود کھل جاتا تھا اور بند کرنے سے بند ہو جاتا تھا یہ قرآن شریف مع ان تمام چیزوں کے مراکش کی جامع مسجد میں رکھا گیا اور اس کی اتنی مرتبہ تلاوت ہوئی کہ جس کا شمار کرنا مشکل ہے"

تلمسان

الجزائر کا شہر تلمسان بھی قرونِ وسطیٰ میں کتب خانوں سے خالی نہیں رہا یہاں کے ایک درس گاہی کتب خانہ "مدرسہ تلمسان کے کتب خانہ" کا نام ابھی آچکا ہے اس کے علاوہ یہاں جو کتب خانے ہوں گے ان کا ذکر نہیں مل سکا مگر یہاں کی علمی سرگرمیوں کا جو ذکر ملا ہے اس کی روشنی میں کتب خانوں کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے اس شہر کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "مرابطین" کے زمانہ میں یہ علم کلام اور فقہ کی درس و تدریس کا ایک بڑا مرکز تھا اس دور میں اس نے بڑے بڑے علماء اور فقہا پیدا کئے۔ ان میں ابو اسحٰق تلمسانی (متوفی ۶۹۰ھ - ۱۲۹۱ء) بڑے عالم فاضل اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ ان کے نام کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیئے کہ موجودہ تلمسان کی بنیاد مرابطی حکمران یوسف بن تاشفین نے گیارہویں صدی عیسوی میں ڈالی تھی اس کے بعد یہاں تعلیم گاہوں کے قیام کا سلسلہ جاری رہا چودھویں صدی عیسوی میں یہاں ایک مدرسہ تھا جس میں اقوال منسنت، مذہب، علوم و تاریخ عرب وغیرہ زمانہ عروج تک پڑھائی جاتی تھی اس مدرسہ میں جو کتب خانہ ہوگا اس میں ان ہی مضامین کی کتابیں ہوں گی۔ یہ مدرسہ مسجد سدی بومدین سے منسلک تھا جس کی عمارت افریقہ کی شاندار عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

تونس

اس ملک کے شہر قیروین کی بنیاد پڑنے کے بعد فاتح افریقہ عقبہ بن نافع نے ایک بہت بڑی

۱؎ تمدن عرب ص ۲۴۲

مسجد ۵۵ھ میں ہی تعمیر کر دی تھی جس کی بعد میں توسیع ہوتی رہی اس مسجد کی زیب وزینت اور شان "تمدن عرب" کے اوراق (ص ۱۴۲) پر دی ہوئی تصاویر میں دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جائیگا کہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق مسجد سے جو مدرسہ اور کتب خانہ منسلک تھا وہ بھی نہایت شاندار ہوگا اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی افریقہ کے اسلامی عہد میں کتب خانوں کے قیام کا آغاز ۵۵ھ میں ہی ہو گیا تھا۔

تونس میں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں "جامع زیتونیہ کے کتب خانہ" نے بڑی طویل عمر پائی ہے، اس کے علاوہ اور بھی کتب خانے ہونگے کیونکہ یہاں علمی و تعلیمی ترقیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے۔ شہر تونس کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے آٹھویں نویں صدی عیسوی میں مذہبی تعلیم کے لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی اور "یہاں روزگار زمانہ علماء و معلمین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جنھوں نے اپنی تعلیمات سے پورے ملک میں اسلام کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا۔"

کتب خانہ ابو زکریا جب بنو حفص کا عہد آیا تو اس کے پہلے بادشاہ ابو زکریا ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء - ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء نے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ قائم کیا جس کا فیض تقریباً اسی برس تک جاری رہا اس کا خاتمہ یوں ہوا کہ ابو زکریا کے جانشین نے ۷۱۷ھ میں حکومت سے دست بردار ہو جانے کے بعد اسے فروخت کر دیا تھا[۱]۔

اس طرح مختلف زمانوں میں جو مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے ان میں مدرسہ زیتون کا کتب خانہ اب تک موجود ہے اس کی ایک فہرست بھی اسی زمانہ میں شائع ہو چکی ہے آج سے کوئی پچاسی سال قبل ایک بزرگ محمد ابن سلیم الشہابی المخزومی المدنی سیاحت کرتے ہوئے تونس پہنچے تھے۔ انھوں نے اپنے سفرنامہ "الرحلة الحجازية" میں لکھا ہے کہ تونس میں ۱۳۶ مسجدیں ہیں ان میں مسجد زیتون سب سے بڑی مسجد ہے اس کا مدرسہ نہایت قدیم اور عظیم الشان ہے اس کے کتب خانہ میں قلمی اور مطبوعہ کئی لاکھ کتابیں ہیں جن میں شمالی افریقہ کے مرحوم حکمرانوں کے کتب خانوں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

---

[۱] اولگا نیپٹو ص ۱۱۔

اُنْدلس

۵ رشوال ۹۲ ھ (۷۱۱ ء) کو طارق ابن[1] زیاد نے اپنی بارہ ہزار فوج سے عیسائیوں کے
ب لاکھ لشکر جرار کو شکست دیکر اندلس میں اسلامی سلطنت قائم کر دی یہ وہ زمانہ تھا
ب کہ یورپ میں جہل و جمود کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور اخلاقی پستی و علم دشمنی[2] کی نوبت
ں تک پہنچ گئی تھی کہ علم کے نام لیوا ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جاتے تھے۔ اس ظلمت
ہ میں علم اور تہذیب کے چراغ پہلے پہل مسلمانوں نے روشن کئے جن کے دورِ حکومت میں
لس کا ہر شہر علم و فن کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا۔ ان میں دارالخلافہ قرطبہ کو خاص عظمت حاصل
، اس چوبیس میل لمبے شہر کی دس لاکھ آبادی میں . . ے مسجدیں سینکڑوں مدرسے کتب خانے اور مختلف
م و فنون کے بلیظیر عالم موجود تھے جن کا علمی فیض پورے مغرب میں پھیلا ہوا تھا بقول ڈاکٹر اقبال سہ

ہے زمین قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور ؎ ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور

طارق ابن زیادہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے گورنر موسیٰ بن نصیر کا آزاد کردہ غلام تھا یہ اپنی فوج کو لے
ں اترا تھا اسے جبل الطارق (GIBRALTER) کہتے ہیں مورخ اکبر شاہ خاں کا بیان ہے کہ طارق نے خواب میں
رت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ اُندلس کی فتح کی بشارت دیرہے ہیں چنانچہ فتح کا کامل یقین رکھتے ہوئے طارق
پنے جہازوں کو آگ لگا کر واپسی کے راستے بالکل بند کر دئے تھے ۔ ؎ عیسائی کلیسا کی علم دشمنی کے بھیانک نمونے
لم والعلماء" میں درج ہیں ان میں سے کچھ یہاں ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں لکھا ہے کہ جس شخص پر علم دوستی کا ذرا بھی شبہ
ا اسے پوپ کی قائم کردہ مجلس تفتیش و احتساب (ENQUISITION) فوراً گرفتار کر لیتی اور جرمانے سے لیکر
قید قتل اور زندہ جلا ڈالنے تک کی سزائیں دیتی۔ محکمہ احتساب کی سفاکیوں کا یہ حال تھا کہ اسنے ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء
لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں ان میں بتیس ہزار انسان ایسے تھے جنھیں زندہ جلا ڈالا گیا اسپین
محکمہ احتساب نے اپنی پہلی سالگرہ اس کارنامے سے منائی کہ بارہ مہینے میں دو ہزار آدمیوں کو زندہ جلایا اور
رہ ہزار کو بھاری جرمانے اور حبسِ دوام کی سزائیں دیں۔

کتب خانے تاریخ کہتی ہے کہ اسلامی اندلس میں صرف کتب خانے ہی قائم نہیں ہوئے بلکہ علم پرور بادشاہوں بالخصوص عبدالرحمٰن[1] اول، ہشام اول، حکم اول، عبدالرحمٰن ثانی، عبدالرحمٰن ثالث اور حکم ثانی کے عہد میں علم وفن کے ہر شعبہ نے بے انتہا عروج پایا اور تعلیم اتنی پھیلی کہ بقول مورخ ڈوزی اسلامی اندلس میں ہر متنفس لکھنا پڑھنا جانتا تھا لیکن مسیحی یورپ میں سوائے بڑے درجے کے لوگوں یا پادریوں کے سب ناخواندہ تھے کہتے ہیں کہ قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں شاندار کتب خانوں اور اعلیٰ درجہ کی لیبورٹریوں سے معمور تھیں صرف قرطبہ میں ۸۰۰[2] اور غرناطہ میں ۱۳۷[3] مدرسے تھے کتب خانوں کی تو کوئی انتہا نہ تھی، شاہی درس گاہی شخصی، عام غرض ہر قسم کے کتب خانے موجود تھے ایک شہر غرناطہ میں عام کتب خانوں کی تعداد ۷۰ تھی[4] اسکاٹ نے لکھا ہے۔

"کوئی بڑا شہر ایسا نہ ہوتا تھا جہاں تشنگانِ علوم کو سیراب کرنے کے لئے کم از کم ایک چشمہ (کتب خانہ) نہ ہوان کتب خانوں کی الماریاں ہر شخص کے لئے جو ان سے مستفیض ہونا چاہتا تھا کھلی رہتی تھیں۔ فن وار فہرستیں ہر کتب خانہ میں مہیا رہتی تھیں تاکہ ہر شخص کو تمام کتابوں کے نام اور ان کے مضامین بہ آسانی معلوم ہوسکیں بہت سی کتابیں مُطلّا و مذہب ہوتی تھیں قیمتی کتابوں کی جلدیں خوشبودار لکڑی اور گل دار چمڑے سے باندھی جاتی تھیں اور بعض پر سونا چڑھا ہوتا تھا اکثر کتب خانوں میں کتابیں خوشبودار اور قیمتی لکڑیوں (مثلاً سرو، عود، آبنوس اور صندل) کے بکسوں میں رکھکر الماریوں میں رکھی جاتی تھیں۔"

---

[1] اموی خلیفہ ہشام کا پوتا عبدالرحمٰن عباسیوں کے ظلم وستم سے بچ کر مصیبتیں اٹھاتا ہوا اندلس پہنچا اور یہاں اس نے ایک نئی اموی سلطنت قائم کی جو ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) سے ۴۲۲ھ (۱۰۳۱ء) تک رہی اس کے بعد دوسرے خاندان حکومت کرتے رہے۔ [2] اخبار الاندلس جلد سوم ص ۵۱۳ -

[3] عالم عرب از جرجی زیدان ص ۲۳۲ -

[4] اخبار الاندلس جلد سوم ص ۵۱۶ / ۶۸۹ -

لیکن کتب خانوں کے لحاظ سے قرطبہ کو سب شہروں پر فضیلت حاصل تھی بقول مورخ اکبر شاہ خاں "دنیا کے کسی شہر میں اس قدر قلمی کتابیں نہیں تھیں جس قدر قرطبہ میں موجود تھیں" اس سلسلہ میں علامہ مقری نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ "جب کوئی عالم اشبیلیہ میں مر جاتا ہے تو اس کی کتابیں فروخت ہونیکے لئے قرطبہ میں آتی ہیں اور جب کوئی مطرب قرطبہ میں مرتا ہے تو اس کے آلات اشبیلیہ جاکر بکتے ہیں" اسی مورخ کا بیان ہے۔

"بلاد اندلس میں سب سے زیادہ کتابیں یہیں (قرطبہ) میں ملتی ہیں کتب خانے رکھنے میں یہاں کے لوگ سب سے بڑھ گئے ہیں کتب خانہ کا ہونا شانِ ریاست سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ بہت سے رئیس ایسے ہیں کہ جو خود عالم نہیں ہیں مگر وہ فخر کرتے ہیں کہ ان کے مکان میں کتب خانہ موجود ہے روساء کا تذکرہ اس طرح ہوتا ہے کہ فلاں کے یہاں کتب خانہ ہے فلاں کتاب فلاں شخص کے کتب خانہ میں ہے اور فلاں رئیس نے فلاں شخص کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ایسی گراں قیمت میں خریدی ہے"

الحکم ثانی کا کتب خانہ

اندلس میں کتب خانوں کی تحریک سب ہی بادشاہوں کے عہد میں پھلی پھولی مگر اس باب میں خلیفہ الحکم ثانی (۳۵۰ھ - ۳۶۶ھ / ۹۶۱ء - ۹۷۶ء) سب پر سبقت لیگیا وہ کتابیں جمع کرنے کا بڑا شائق تھا حسب بیان مورخ ڈوزی الحکم کے برابر کوئی عالم و فاضل بادشاہ اسپین میں نہیں گزرا نہ علوم و معارف میں کسی کو اتنی قدرت حاصل ہوئی اور نہ کسی نے اتنی کتابیں جمع کیں۔ الحکم نے قرطبہ میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا مورخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ علامہ جرجی زیدان نے کہا ہے کہ یہ کتب خانہ تمام قدیم اسلامی کتب خانوں سے سبقت لے گیا تھا۔ مورخ اسکاٹ کا بیان ہے کہ یہ وہ خزانہ تھا جو علماء کو محظوظ کرتا اور جاہلوں اور وہمیوں کو متحیر۔ اس کتب خانہ میں عربی، یونانی، عبرانی وغیرہ کی چار لاکھ کتابیں جمع تھیں جن کی باقاعدہ فہرست مرتب کی گئی تھی جو چوالیس جلدوں پر مشتمل تھی۔

یہ نفیس کتب خانہ اور الحکم کی علم نوازی اہل علم کیلئے بڑی کشش رکھتی تھی چنانچہ ممتاز عالم، محدث، مورخ اور شاعر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے ان میں ابن مغیث، محمد بن مفرج، یوسف بن ہارون، احمد بن سعید ہمدانی، محمد بن یوسف وراق، عیسیٰ بن محمد اور یعیش بن سعید جیسی زبردست شخصیتوں کے نام ملتے ہیں۔

عملہ کتب خانہ میں عملہ کی تعداد کا اندازہ مورخ اکبر شاہ خاں کے اس بیان سے ہوجاتا ہے کہ" دارالکتب میں ہزارہا جلد ساز اور کاتب مصروف کار رہتے تھے"۔ یہاں ثقرالبغدادی اور قیاس بن عمر جیسے اعلیٰ خوشنویس کتابت کی خدمت پر مامور تھے کتب خانہ کے مہتمم کا عہدہ الحکم کی نظر میں اتنا وقیع تھا کہ اس منصب پر اس نے اپنے بھائی کو مامور کیا تھا۔

عمارت کتب خانہ کی عمارت کے متعلق مورخ اسکاٹ کا مفصل بیان اس کتاب کے باب اول میں پیش کر دیا گیا ہے اس بیان کی چند سطور یہاں بھی پیش کی جارہی ہیں تاکہ کتب خانہ کے تمام رُخ نظر کے سامنے آجائیں۔ اس کی عمارت شان وشوکت میں قصرِ شاہی سے کم نہ تھی اس کا فرش قیمتی سنگ مرمر کا تھا۔ دیواریں اور چھتیں بہترین سنگ رخام کی اور الماریاں نہایت قیمتی صاف وشفاف لکڑیوں کی تھیں ہر ایک الماری پر سونے کے پتروں سے مضمون کا نام لکھا ہوا تھا جگہ جگہ دیواروں پر لوگوں کے اقوال سنہرے حروف میں لکھے ہوئے تھے تاکہ انھیں دیکھ کر لوگوں میں علم کا شوق اور بڑے بڑے علماء اور شعراء کے قدم بقدم چلنے کا خیال پیدا ہو۔

کتب خانہ کی توسیع اور افادیت الحکم کا ذوق کتب بینی اور کتابوں سے ان کی سچی محبت ان کے کتب خانہ کی توسیع اور افادیت کا بھی سبب بنی ان کی کثرتِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے کتب خانہ کے ذخائر میں سے بھی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا تھا تاریخ تو یہ کہتی ہے کہ ان کے کتب خانہ کی چار لاکھ کتابوں میں بہت ہی کم ایسی تھیں جن کا الحکم نے مطالعہ نہ کیا ہو۔ مگر یہ پیش نظر رکھئے کہ ان کا مطالعہ محض کتاب خوانی نہ تھی بلکہ وہ کتابوں کا بغور مطالعہ کر کے ان پر مفید حواشی بھی لکھدیتے تھے۔ علامہ مقری کا بیان ہے کہ الحکم کی عادت یہ تھی کہ جس کتاب کو وہ پڑھتا اس پر مصنف کا شجرۂ نسب، اس کا مولد اور اس کی وفات بھی لکھدیتا تھا۔ الحکم کی ان تحریروں سے ان کے کتب خانہ کی افادیت دوبالا ہوگئی تھی۔

الحکم کی کتابوں سے محبت کا شہرہ سن کر لوگ ہدیوں اور تحفوں میں کتابیں ان کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے لئے کتابوں سے بہتر کوئی تحفہ نہ تھا۔ کتابوں کی خریداری پر بھی وہ بڑی فراخدلی سے بے دریغ روپیہ صرف کیا کرتے تھے اس سلسلہ میں ان کی فیاضی کا یہ حال تھا

جب انھیں معلوم ہوا کہ ابوالفرج اصفہانی نے عرب کی شاعری اور وہاں کے مُغنیوں پر ایک جامع کتاب "کتاب الاغانی" لکھی ہے تو اسے حاصل کرنے کا اہتمام کیا اور ایک ہزار دینار مصنف کو عطا کر کے اس کے حوصلے بڑھا دیئے۔ غرض کتابوں کی آمد کی یہ صورتیں کتب خانہ کی توسیع کا ذریعہ بنی رہیں کتابوں کے اس نایاب خزانے کا الحکم کے بعد جو حشر ہوا وہ اگلے صفحات میں دیکھئے۔

الحکم کی علم نوازی پر ایک نظر

الحکم کی علم نوازی کے متعلق مورخ اکبر شاہ خاں کا مکمل بیان یہاں اس لئے پیش کیا جارہا ہے تاکہ اس زمانہ کے یورپ کی علم دشمنی کا مسلمانوں کی علم دوستی سے مقابلہ کرکے الحکم کا یہ علمی کارنامہ دیکھا جاسکے کہ اس نے آج سے ایک ہزار سال قبل یورپ کی سرزمین پر ایک ایسا علم افروز کتب خانہ قائم کیا تھا جس سے پہلے وہاں اس جیسا کوئی کتب خانہ موجود نہ تھا۔ الحکم کی علمی قابلیت کتابوں سے اس کی گہری محبت اور اس کے عہد کی علمی ترقیات کے بارے میں اسی مورخ نے لکھا ہے۔

"الحکم نے جابجا ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کالج اور دار العلوم قائم کئے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی مدرسے قائم تھے طلباء کے اکثر مصارف شاہی خزانہ سے ادا ہوتے تھے جو طالب علم باہر سے آتے تھے وہ جب تک اندلس کے اندر تحصیل علم میں مصروف رہیں خلیفہ کے مہمان سمجھے جاتے تھے۔"

"خلیفہ حکم ثانی کو تمام علوم مروجہ میں دست گاہ کامل حاصل تھی کتابوں سے اس کو عشق تھا۔ دمشق، بغداد، قسطنطنیہ، قاہرہ، قیروان، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ تمام ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا خلیفہ حکم کے گماشتے موجود رہتے تھے ان کا کام یہ تھا کہ جو اچھی یا نایاب کتاب پائیں اس کو خریدیں اور خلیفہ کے پاس بھیجدیں مصنفین کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی تصنیف کی پہلی کتاب خلیفہ کے پاس بھیجیں، علماء کو قرطبہ آنے کی ترغیب دیں جہاں ان کی نہایت فراخ دلی کے ساتھ قدر و منزلت بڑھائی جاتی تھی اور وہ دولت سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ کسی کتاب کے حاصل کرنے میں چاہے کتنی ہی مصیبت

تاریخ اسلام جلد سوم۔ ص ۱۸۶۔

برداشت کرنی پڑے اور اشرفیوں کی چاہے کتنی ہی تھیلیاں خالی کرنی پڑیں حکم کے کتب خا
کے لیئے کتاب ضرور ہی خریدی جاتی تھی۔"

"ہر ایک شہر میں خلیفہ حکم کی طرف سے بہت سے لوگ صرف اسی کام پر متعین تھے کہ و
کتابوں کی نقلیں کر کے قرطبہ میں بھیجیں دنیا کے تمام بادشاہوں سے خلیفہ حکم کے مراسم
اور ان سب کے شاہی کتب خانوں میں نقل کرنے والے لوگ خلیفہ حکم کی طرف سے موجود رہتے
تھے کہ تمام نایاب کتابوں کی نقلیں حاصل کریں۔"

"روئے زمین کے ہر ایک ملک اور ہر ایک شہر میں اس بات کی شہرت ہو گئی تھی کہ قرطبہ
کا خلیفہ سب سے زیادہ مصنفین کا قدردان ہے اس لئے بہت سے ایسے مصنفین تھے جو
بغداد یا بصرہ وغیرہ میں رہتے تھے مگر اپنی کتابیں خلیفہ حکم کے نام سے معنون کر کے دربار قرطبہ
میں بھیجتے تھے یونانی اور عبرانی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرانے کے لئے سینکڑوں ہزار
علماء کا ایک زبردست محکمہ بنا دیا تھا۔ اندلس بالخصوص قرطبہ کے ہر ایک شریف آدمی کو کتا
کا شوق ہو گیا تھا اور ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود ملتا تھا صرف قرطبہ ہی میں نہیں بلکہ
اندلس کے ہر ایک بڑے شہر میں ایک بڑا کتب خانہ سرکاری اہتمام سے موجود و مہیا تھا۔"

"ہر ایک شخص جو امیر المومنین کی خدمت میں عزت و رسوخ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ کو
نایاب اور مفید کتاب بطور ہدیہ لے کر حاضر ہوتا تھا۔"

پانچ نفیس کتب خانے

الحکم جیسے عاشق کتب کے عہد میں کتابوں کی محبت اتنے عروج پر پہنچ
گئی تھی کہ کتابوں کے شیدائیوں میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی نمایاں
طور پر نظر آرہی تھیں اور انھوں نے بھی کتب خانے قائم کر لئے تھے خواتی
کے کتب خانوں میں شہزادہ احمد کی بیٹی "عائشہ کا کتب خانہ" اندلس کے نفیس و مکمل کتب خانو
میں سے تھا اس خاتون کے متعلق اخبار الاندلس میں ہے کہ اسے "جہاں نظم میں کمال حاصل تھا
وہاں وہ نہایت فصیح و بلیغ خطیبہ بھی تھی" کتابوں سے قلبی محبت رکھنے والوں میں قرطبہ کے
قاضی ابو مطرف اور ابن حزم کے نام بھی سرفہرست ملتے ہیں۔ قاضی فطیس بن سلیمان المعر
بہ ابو مطرف کا کتب خانہ" بھی بہت بڑا تھا جس میں چھ کاتب کام کرتے تھے اس کے ذخا

تنے قیمتی تھے کہ جب قاضی صاحب کے خاندان کو اپنے نامساعد حالات کی بنا پر یہ کتب خانہ نیلام کرنا پڑا تو اس کی قیمت چالیس ہزار دینار (دو لاکھ باسٹھ ہزار روپیہ سے زائد) وصول ہوئی۔ ایک علم دوست مدرس "محمد بن حزم کا کتب خانہ" اس قدر نفیس تھا کہ اکثر اہل علم اس پر رشک کیا کرتے تھے وہ کتابوں کے معاملہ میں اتنے فیاض تھے کہ انھوں نے ارباب علم کو اپنے کتب خانہ سے استفادہ کی اجازت دے رکھی تھی۔

ان کے علاوہ وزراء، امرا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے خود مختار حکمراں بھی علم وفضل اور کتابیں جمع کرنے میں کچھ کم درجہ نہ رکھتے تھے مثلاً والی بطلیوس "المظفر افطسی کا کتب خانہ" بہت مشہور تھا ان کی تصنیف المظفری پچاس جلدوں پر مشتمل ہے جس سے ان کی قابلیت اور انکے کتب خانہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ المیریا کے حکمران زہیر کے وزیر "ابن عباس کا کتب خانہ" نہایت وسیع اور عالیشان تھا اس میں بے شمار رسائل کے علاوہ چار لاکھ کتابیں تھیں یہ وزیر نہایت جید عالم اور بہت اچھا خوشنویس تھا اس کے کتب خانہ کی شان اور خوبصورتی کی نسبت اسکاٹ نے لکھا ہے۔[۲۹]

ابن عباس کے محل کا کوئی حصہ اتنا پرتکلف اور شاندار نہ تھا جتنا کہ کتب خانہ الماریاں خوشبودار لکڑی کی تھیں اور ان میں ہاتھی دانت سیپ اور کچھوے کی کھوپڑی سے منبت کاری کی ہوئی تھی۔ تمام کمرے میں سونے کا کام تھا۔ دیواروں میں سفالی کی اینٹیں تھیں جس سے تمام کمرہ جگمگاتا تھا اور فرش سنگ مرمر کا تھا وہ اپنی فرصت کا وقت اس عالیشان کتب خانہ میں کاٹتا تھا"

اندلسی کتب خانوں کا اثر یورپ پر جس طرح بغداد، دمشق اور دوسرے علمی مراکز نے ایشیا میں ایک علمی وادبی فضا پیدا کر دی تھی اسی طرح اسلامی اندلس کے مدرسوں اور کتب خانوں نے یورپ کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی پر نہایت گہرا اور پائدار اثر ڈالا تھا اس زمانہ میں اندلس کے سوا یورپ میں کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کی جا سکتی چنانچہ طالبان علم یورپ سے اندلس

---

[۲۹] مورخ ڈوزی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "عبرت نامہ اندلس" مترجمہ محمد عنایت اللہ جلد ثانی ۳۴۱۔ [۳۰] اخبار الاندلس ج ۲۔ ص ۱۳۶

آتے اور یہاں کے اداروں سے فیض اٹھاتے تھے ان میں ایک شخص گربرٹ تھا جس نے ق
یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی اور جو ۹۹۰ء میں سلویسٹر دوم کے نام سے پوپ کے عہدہ پر
ہوا تھا مورخ سدیو[1] نے لکھا ہے کہ گربرٹ نے اندلسی کتب خانوں سے فائدہ اٹھا کر ا
عجیب وغریب علوم ومعارف اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش کئے کہ انھوں نے اس پر جادو
کی تہمت لگا دی اور اسے زہر دیکر مار ڈالا لیکن ان وحشیانہ مظالم کے باوجود یورپ
علم دوست حضرات ابن سینا، ابن رشد اور فارابی جیسے علمائے اسلام کی کتابوں سے رو
حاصل کرتے رہے اگرچہ دین مسیح کے رہنما ان کی کتابوں کے سخت مخالف تھے اور ان کا پڑھن
انھوں نے کفر قرار دے دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اہل یورپ مسلم مفکرین کی تصانیف کے اس ق
دلدادہ ہوگئے کہ بقول مورخ اسکاٹ "یہ ممنوعہ کتابیں یورپ کے ہر دیر میں نہایت شوق
پڑھی جانے لگیں۔" اور وہ ابن ارشد جسے گالیاں دینا عیسائی کلیسا نے مذہبی شعار بنالیا
اسی کی تصانیف ۱۴۷۳ء میں یورپ کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل وخرد کو بیدار کرنے والی یہ تصانیف اہل یورپ کی مذ
اور علمی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا ایک زبردست آلہ ثابت ہوئیں کہتے ہیں کہ لوتھر[2]
اصلاح مذہب کی جو تحریک پروٹسٹنٹ (PROTESTANT) کے نام سے جاری کی
بڑی حد تک اسی بیداری کا نتیجہ تھی جو مسلم حکماء کی تصانیف کے اثر سے پیدا ہوئی تھی۔
عرب جغرافیہ دان ادریسی کی تصانیف[3] نے جو لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں جغرافیہ کا ع
یورپ کے ازمنہ متوسط میں پھیلایا۔ بحری دنیا میں ابن[4] ماجد کی تصانیف اور اس کے تجر
پندرھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کے وسط تک جہازرانوں کیلئے شمع راہ کا کام دیتے رہے
پرتگالی جہازراں واسکوڈی گاما نے اپنے بیڑہ کو مشرقی افریقہ کے ساحل مالندی سے ہندوستان کی
کالی کٹ تک لے جانے اور ساری دنیا کا چکر لگانے میں ابن ماجد کی تصانیف اور معلوما

[1] مسلمانوں کا عروج وزوال از مولانا سعید احمد اکبرآبادی ص ۱۶۲ [2] MARTIN (14..3-1546) LUTHER) [3] "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں لکھی گئی [4] مفصل حالات کیلئے
مورسالہ برہان دہلی مارچ ۱۹۴۰ء) [5] واسکوڈی گاما ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ پہنچا تھا۔

بہت کچھ استفادہ کیا تھا کولمبس[1] نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے نئی دنیا یعنی امریکہ کے دریافت کرنے میں ان نظریات وقیاسات سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے جو عربوں نے اپنی تصانیف میں پیش کئے ہیں۔

عیسائی مورخین گبن، لین پول، اسکاٹ، موسیو لیبان وغیرہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی درسگاہوں اور ان کی تصانیف کی بدولت وہ اسباب فراہم ہوئے جن کے اثر سے یورپ جہالت کی تاریکی سے نکلا اور اس دور ترقی کا آغاز ہوا جو نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کے نام سے مشہور ہے موسیو لی بری لکھتا ہے[2] کہ اگر عربوں کا نام تاریخ سے نکال دیا جاتا تو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کئی صدیوں پیچھے ہٹ جاتی موسیو لیبان کہتا ہے۔ کہ یونان کی تصانیف کا علم ان کے عربی ترجمہ ہی کے ذریعہ سے پھیلا ان ہی ترجموں کی بدولت وہ تصانیف قدیمہ ہم تک پہنچی ہیں جن کی اصلیں بالکل تلف ہوگئیں اور دنیا کو عربوں کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس ذخیرہ بے بہا کو تلف ہونے سے بچایا مگر ان باتوں کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں ہے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اندلسی کتب خانوں کی تباہی میں سب سے بڑا ہاتھ اس قوم کا ہے جسے مسلمانوں نے علم اور تہذیب کی نعمتیں بخشی تھیں۔

اندلسی کتب خانوں کی تباہی

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت پر زوال آجانے کے بعد ان کے کتب خانے بھی تباہ و برباد ہوگئے خلیفہ حکم ثانی کے عظیم کتب خانہ کا یہ حشر ہوا کہ اس کا بیٹا ہشام ثانی اپنے باپ کے اس علمی خزانے کی حفاظت نہ کرسکا اس کمزور خلیفہ کے عہد میں وزیر محمد بن ابی عامر نے فلسفہ اور علم کلام وغیرہ کی تمام کتابیں کتب خانہ سے نکلوا کر جلوا دیں چند برسوں بعد اس کا کچھ حصہ فروخت کر ڈالا گیا۔ کچھ کتابیں منتشر ہوکر مختلف کتب خانوں میں پہنچ گئیں جو بچیں وہ بربری حملہ کے وقت برباد ہوگئیں۔ اس موقع پر کتابوں کے اور بہت سے ذخیرے برباد ہوئے اسکاٹ نے لکھا ہے کہ "وحشیان بربر نے جب قرطبہ کو لوٹا ہے تو ان لوگوں نے کتابوں کی بے بہا جلدیں اکھاڑ کر اپنے جوتے بنائے۔ جانور صفت حملہ آوروں نے سونا اور جواہرات جلدوں پر سے اتار کر کتابوں کو پامال کرنے کے لئے ادھر ادھر پھینک دیا"۔

---

[1] CHRISTOPHER COLUMBUS (1451-1506) [2] تمدن عرب از ڈاکٹر گستاولی بان ص ۵۱۴۔

اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد مسیحی رہنماؤں نے علم دشمنی اور وحشت و بربریت کا ایسا نمونہ پیش کیا جسے علمی دنیا کبھی نہیں بھول سکتی انھوں نے اسلامی اندلس کے سارے کتب خانوں کو یک لخت مٹا دینا اپنا مذہبی فریضہ قرار دیا اور اس کا نام عمل ا (AUTO DE FA) رکھا اب اندلس میں علم سوزی کا بازار گرم تھا اور مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی ثقافت کے بے بہا خزانے تباہ کئے جا رہے تھے۔ تمام بلاد اندلس میں جو کتابیں برباد کی گئیں ان کا تو کوئی حد و حساب ہی نہیں صرف ایک شہر غرناطہ میں جو کتابیں اسپین کے اسقفِ اعظم فرانسسکو ژمینیس[1] نے جلا کر خاکستر کر دیں ان کی تعداد اسّی ہزار تھی۔ عیسائیوں نے ۸۹۷ھ (۱۴۹۱ء) میں غرناطہ پر قبضہ کرنے کے بعد ایک طرف مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا دوسری طرف یہاں کا شاہی کتب خانہ جلایا انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں لیں اور عربی زبان کی جس قدر کتابیں ملیں وہ ضبط کر لیں اسی طرح تقریباً دس[2] لاکھ کتابیں جمع ہوئیں لکھا ہے کہ غرناطہ میں کتابوں کے انبار دس روز تک برابر جلتے رہے علوم و فنون کے اس قیمتی ذخیرے کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے مورخ اسکاٹ لکھتا ہے

"اس وحشیانہ فعل سے مالی نقصان تو بہت ہوا ہی تھا مگر اس کا مہلک اثر جو سوسائٹی پر پڑا وہ بالکل ناقابل بیان ہے اس سے وہ یگانہ روزگار علمی یادگاریں تباہ ہو گئیں جن کا بدل ناممکن ہے گھڑی بھر میں اس دشمنِ (ژمینیس) نے صدیوں کا جمع کیا ہوا وہ بیش بہا خزانہ خاک سیاہ کر دیا جس سے زمانہ حال کے مورخ مسلمانانِ اندلس کی تہذیب کے متعلق ایسے ماخذ پیدا کر سکتے تھے جن کا علمی دنیا میں اب پتہ لگنا بالکل ممکن نہیں ہے۔"

یہ مورخ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "اس عجیب و غریب سلطنت (اندلس کی تباہی) صرف ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں ہی کو خون رلائے یہ ایسا بدقسمت واقعہ اور ایسی مصیبت ہے جس پر نہ صرف زمانہ حال بلکہ زمانۂ آئندہ کے علم دوستوں کو آنسو بہانے چاہئیں

[1] FRANCISCO XIMENES DE CISNEROS.

[2] مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا سعید احمد ص ۱۹۸

باب سوم

غیر منقسم ہندوستان کے مسلم عہد میں

کتب خانوں کا قیام اور نظام

مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی علمی ترقیاں اور کتب خانے

ہندوستان میں مسلم عہد کے کتب خانوں کا حال بیان کرنے کے سلسلہ میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد سے پہلے کے کتب خانوں کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان مسلمانوں کی آمد سے سینکڑوں برس قبل علم ہیئت، ریاضی، طب، فلسفہ، الٰہیات اور فنِ سنگ تراشی وغیرہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔

کتابیں موریہ، گپت اور دیگر حکمراں خاندانوں کے عہد میں علم و ادب وغیرہ کی بڑی ترقیاں ہوئیں۔ چندر گپت موریہ (تخت نشینی ۳۲۱ ق م) کے استاد و وزیر چانکیہ نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب "چانکیہ نیتی"[1] لکھی۔ گپت عہد (۳۲۰ء - ۶۵۰ء کے مشہور شاعر کالیداس نے ڈراما "شکنتلا" لکھ کر ڈرامہ نگاری کے میدان میں شہرت دوام حاصل کر لی۔ راجہ ہرش کے درباری شاعر بان نے ایک نظم "ہرش چتر" لکھکر بڑی شہرت پائی اور راجہ کنشک کے دربار کا طبیب چرک بڑا نامور طبیب ہوا۔

اس زمانہ میں ہندو مصنفین نے جو اہم کتابیں لکھیں ان میں علم طب پر چرک اور سشرت کی کتابیں، عورتوں کے امراض پر ایک پنڈتانی کی کتاب، علم ہیئت پر ایک فاضل پنڈت کی کتاب "سدھانت" بھی شامل ہیں یہ کتابیں عربوں میں اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کے ترجمے عربی

---

[1] اس کتاب کا ہندی ترجمہ راقم الحروف نے پروفیسر محمد ایوب قادری کے ذاتی کتب خانہ (کراچی) میں دیکھا ہے۔

میں کرائے گئے ۱۷۷۰ء میں ایک فاضل پنڈت سدھانت لے کر بغداد گیا اس کتاب کی وہاں اتنی قدر و منزلت ہوئی کہ بقول مصنف آب کوثر "ہارون رشید اور مامون رشید کے عہد میں علم ہیئت کی ترقیاں ہو جانے کے باوجود عرب ہیئت داں بغداد سے لے کر اسپین تک اس کے پیچھے لگے رہے اس کے خلاصے لکھے اس کی شرحیں لکھیں اس کی غلطیاں درست کیں، اس میں اصلاحیں کیں یہاں تک کہ گیارھویں صدی عیسوی یعنی البیرونی کے زمانہ تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اب بھی عربی میں علم ہیئت کی چند اصطلاحیں ایسی باقی ہیں۔ جن میں ہندوستانی علم ہیئت کا اثر نظر آتا ہے۔"

حسابِ ہندی علم ہیئت کے علاوہ علم حساب میں اس وقت جو ترقیاں ہوئیں ان کے اثرات بھی ہندوستان سے عربوں تک پہنچ گئے۔ وہ اعداد لفظوں میں لکھا کرتے تھے لیکن ہندسے لکھنے کا طریقہ انھوں نے ہندوؤں سے سیکھا اس وجہ سے وہ ہندسوں کو "حساب ہندی یا ارقام ہندیہ" کہتے ہیں اور یورپ میں یہ عربک نیومرلس (ARABIC NUMERALS) کہلاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے باشندوں نے ہندسے لکھنے کا طریقہ عربوں سے سیکھا تھا۔

بید ان علمی و فنی ترقیوں کے ساتھ ہندو بیدوں کی شہرت کا ذکر بھی ملتا ہے جن کی لیاقت کا حال سن کر خلیفہ منصور نے ایک ہندو بید کو بغداد بلوایا اور اس کے علاج سے شفا پا جانے کے بعد نہ صرف اسے انعام و اکرام سے نوازا بلکہ اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر سنسکرت کی کتابیں ترجمہ کرنے کیلئے اسے دار الترجمہ میں مترجم مقرر کر دیا۔

آثارِ قدیمہ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس عہد سے صدیوں پہلے کے تہذیب و تمدن کے آثار مثلاً پنجاب میں ہڑپا، سندھ میں موہن جوڈارو، دکن میں اجنتا اور ایلورا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں فن سنگ تراشی، نقاشی اور مصوری کی بڑی ترقی ہو گئی تھی ان ترقیوں کے نمونے راجہ اشوک (متوفی ۲۳۲ ق م) کی بنوائی ہوئی لاٹوں اور کتبوں میں بھی ملتے ہیں جن پر کندہ شدہ تحریریں اس عہد کے حالات کی اب تک عکاسی کر رہی ہیں۔

سیّاح

ان کے علاوہ چینی سیاحوں کے سفرناموں سے بھی ہندوستان کے طرز معاشرت رسم و رواج، مذہب اور طرز حکومت کے حالات ملتے ہیں چونکہ بدھ مذہب کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی چنانچہ اس مذہب کے مقدس مقامات کی یاترا کرنے بیرون ہند سے بھی بدھ ہندوستان آتے رہتے تھے ان میں چینی سیاح فاہیان پہلا شخص ہے جو ہندوستان آیا اس کے آنے کا مقصد بدھ مذہب کی مقدس کتابیں اور مستند روایات جمع کرنا کہا جاتا ہے اس کے سفرنامہ میں بھی بڑا تاریخی سرمایہ موجود ہے۔

کتب خانہ نالندہ

ایک چینی سیّاح آئی۔سانگ (I T'SING) کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے ایک بدھ درس گاہ نالندہ کے کتب خانہ سے دس سال (۶۷۵-۶۸۵ء) تک استفادہ کیا تھا اور پانچ لاکھ اشلوک پر مشتمل چار سو سنسکرت کی کتابیں جمع کی تھیں۔ یہ تعلیمی مرکز بدھ عہد کی علمی ترقیات کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اس کا کتب خانہ اتنا وسیع تھا کہ وہ درسگاہ نالندہ کے ڈیڑھ ہزار اساتذہ اور نو ہزار طلباء کی علمی ضروریات پوری کر دیتا تھا یہ کتب خانہ بقول مُکرجی[1] جس جگہ واقع تھا۔ اُسے دھرم گنج کہتے تھے۔ اس کی عمارت تین وسیع عمارتوں پر مشتمل تھی جو رتنا ساگر رتنا دھاوی اور رتن رنجک[2] کہلاتی تھی رتنا ساگر کی نو منزلہ عمارت نادر اور نایاب کتابیں رکھنے کے لئے مخصوص تھی۔

چار اہم علمی مراکز

نالندہ کے علاوہ اور کئی علمی مراکز تھے جن میں پرشا پورہ[3] (موجودہ پشاور) ولابھی (موجودہ کاٹھیاوار) ٹیکسلا (پنجاب میں) وکرم شیلا (بنگال میں) اور کانچی پورہ (مدراس) بھی شامل تھے ان سے بھی قدیم طرز کے کتب خانے یقیناً منسلک ہوں گے کیونکہ درس گاہوں کے ساتھ کتب خانوں کی ضرورت اس زمانے میں یہ کہہ کر واضح کی جاتی تھی کہ درس گاہ کی حیثیت بغیر کتب خانہ کے ایسی ہے جیسی قلعہ کی بغیر اسلحہ خانے کے ہوتی ہے یعنی جس طرح بغیر اسلحہ قلعہ کا تحفظ ناممکن ہے۔ اسی طرح کتب خانہ کے بغیر درس و تدریس کا کام چلانا ممکن نہیں ہے۔

---

[1] RADHAKUMUD MOOKERJI ANCIENT INDIAN EDUCATION-PAGE.574

[2] [3] یہ نام اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کی قدیم ہندوستان کی ان علمی سرگرمیوں کو دیکھنے کے بعد بھی یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ اُس زمانہ میں یہاں علمی اور کتابی ذوق عام نہ تھا اور علم ذات پات کے جال میں پھنس کر ایک مخصوص طبقہ کی ملکیت بن گیا تھا مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں علم کی توسیع واشاعت ہوئی اور سیاسی وحدت کے ساتھ لسانی وحدت و ذہنی بیداری کے بھی سامان فراہم ہوئے اور ایک تہذیب ظہور میں آئی جسکی توانائی و رعنائی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سرپی۔سی رائے نے اپنے خطبہ میں کہا ہے[1]۔

"یہ صحیح نہیں کہ مسلمان ہندوستان میں آکر صرف بس گئے ہیں اور انھوں نے کچھ کیا نہیں بلکہ اس کے برخلاف انھوں نے یہاں کے فنون لطیفہ، ادب اور فن ملک داری میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب تمدن کی پیچ در پیچ الجھی میں رنگ رنگ کے جو بہت سے دھاگے نظر آتے ہیں وہ ذہانت اسلامی ہی کا نتیجہ ہیں۔عروس ہند کو مسلمانوں نے جو لباس زرتار پہنایا ہے اگر اتار لیا جائے تو وہ کیسی حقیر لاغر اندام نظر آنے لگے۔"

مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان علمی و ثقافتی ترقیوں کے لئے ہندوستان براہ راست اسلامی تعلیم کا احسان مند ہے۔ مذہب اسلام نے مسلمانوں میں علم کی اشاعت کا جو ذوق و شوق پیدا کر دیا تھا وہ مسلم مشائخ، علماء اور فاتحین کیساتھ پہاڑوں، ریگستانوں، دریاؤں اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا ہندوستان پہنچا اور یہاں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں کتابوں کا استعمال عام کرنے اور مدرسوں اور کتب خانوں کے ذریعہ علم کو پھیلانے کا شعور اور رجحان جاگا، بڑھا اور پھیلا۔ چنانچہ مورخ جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے[2]۔

"کتابوں کو نقل کر کے تقسیم کرنے اور علم کی عام اشاعت کے رواج کے لیے ہم اسلامی اثرات کے رہین منت ہیں ورنہ پرانے ہندو مصنفین تو اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو خفیہ رکھنے کے شیدائی تھے۔"

لیکن یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کی آمد کے اثرات صرف کتابوں کی اشاعت ہی تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے ہندی تہذیب و تمدن کے ہر گوشہ کو منور کر دیا مولانا سید سلیمان ندوی

---

[1] اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم (خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ ۱۹۲۳ء) ص ۲۲

[2] (INDIA THROUGH THE AGES BY J. SRKAR)

نے اپنے ایک مقالہ[۱] میں ان اشیاء کی مفصل فہرست دی ہے جو مسلمان اپنے ساتھ لیکر ہندوستان آئے تھے اور جن سے یہ ملک پہلے بالکل ناآشنا تھا۔ ہندوستانی زندگی پر مسلمانوں کے جو اثرات پڑے ان سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے صرف زبان کو لیجیے جو تہذیبی لین دین کا سب سے واضح ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن اس کثرت میں وحدت کا رنگ ہندو اور مسلمانوں کے معاشرتی اختلاط سے ابھرا اور ایک نئی زبان وجود میں آئی جو مختلف مدارج طے کرکے اردو کہلائی۔ اس لسانی انقلاب نے ہندوؤں کے مذہبی شعور کو بھی متاثر کیا۔ الفاظ خیالات کا جامہ کہے جاتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کی زبان کے ساتھ اسلامی افکار بھی غیر ارادی طور پر ہندوستان آگئے اور جب عربی و فارسی الفاظ یہاں کی مقامی زبانوں میں گھل مل گئے تو قدرتی طور پر اسلامی فکر کے اثرات بھی ہندوؤں کے دل و دماغ پر پڑنے لگے یہاں تک کہ ان کے دل میں اپنے ہزاروں سال پرانے مذہب کی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوگیا اور ہندو مذہب کے بہت سے اصلاحی فرقے مثلاً بھگتی تحریک، برھمو سماج اور آریہ سماج[۲] وغیرہ وجود میں آئے۔ ہندوستان کی مذہبی فکر اسلامی توحید سے جسطرح متاثر ہوئی اس کے نقوش نامدیو (مرہٹی شاعر) کبیرداس اور گرونانک جیسے بزرگوں کی تعلیمات میں صاف نظر آتے ہیں۔ کبیرداس نے بت پرستی کی مذمت کرتے ہوئے بڑے لطیف و موثر انداز میں کہا ہے:-

پاہن پوجے ہری ملیں تو میں پوجوں پہاڑ[۳]
تاتے یہ چاکی بھلی، پیس کھائے سنسار

---

[۱] "ہندوستان میں ہندوستانی" یہ مقالہ انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی کے جلسہ میں پڑھا گیا اور ۱۹۳۴ میں علی گڑھ سے شائع ہوا [۲] آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (اصل نام مول شنکر) کے بُت پرستی سے بیزار ہونے کا یہ سبب بتایا جاتا ہے کہ ایک رات وہ شیوجی کے مندر میں پوجا کرنے گئے اس وقت چوہے بُت پر دوڑ رہے تھے۔ اپنے معبودوں کی اس بے بسی نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے بُت پرستی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

[۳] اگر پتھر پوجنے سے خدا ملتا تو میں پہاڑ کو پوجتا۔ اس سے تو یہ چکی بھلی جس سے لوگ کر پیس کر کھاتے ہیں۔

مسلمانوں کے عہد میں
کتابیں جمع کرنیکا ذوق وشوق

ہندوستان میں مسلمانوں کا عہد اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ ان کے عہد میں مدرسوں اور کتب خانوں کے قیام کا اہتمام نہایت وسیع پیمانے پر ہوا اور کتابیں جمع کرنا ایسا محبوب مشغلہ بن گیا کہ جس کی نظیر اس سے قبل ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کا قدم سرزمین ہند کے جس مقام پر پہنچا وہاں مسجدیں تعمیر ہوئیں اور مسجدوں کے زیرِ سایہ مدرسے کھُلے ان کے علاوہ علمار اور امراء کے مکانوں کے ساتھ بھی مدرسے ہوتے تھے اور ہر مدرسہ سے چھوٹا یا بڑا کتب خانہ ملحق ہوتا تھا اور شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو کہ جس میں حدیث و وظائف، شعر و شاعری اور قصے کہانیوں کی کچھ کتابیں جمع نہ ہوں۔

ایک خواب لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کتابیں جمع کرنے کا ذوق بھی اسلامی تعلیم کے اثرات کا رہینِ منت ہے جس کی ایک روشن مثال مولوی خدابخش (بانی اورنٹیل لائبریری بانکی پور[1]) کے ایک خواب میں نظر آتی ہے۔ مولانا موصوف کتابیں جمع کرنے کا جو والہانہ جذبہ رکھتے تھے اس کی تہ میں تعلیم محمدی اتنی قوت کیساتھ کام کر رہی تھی کہ ایک بار انھیں خواب میں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکے کتب خانہ میں تشریف لاتے ہیں۔

خدابخش مرحوم کہتے ہیں "ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کتب خانہ سے لگی ہوئی گلی میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں میں بھی گھر سے نکل پڑا۔ لوگ چلّانے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے کتب خانہ کی سیر کیلئے تشریف لا رہے ہیں۔ تم کہاں ہو؟"

---

[1] ایک مشرقی کتب خانہ ص ۸ (انجمن ترقی اردو۔ ہند علی گڑھ)

"میں اُس کمرے کی طرف دوڑا جہاں قلمی کتابیں رکھی تھیں، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاچکے تھے لیکن حدیث کی دو قلمی کتابیں میز پر کھلی رکھی تھیں لوگوں نے بتایا کہ ان دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرما رہے تھے"۔

اس خواب سے متاثر ہو کر ان دونوں کتابوں پر مولوی خدابخش مرحوم نے یہ نوٹ لکھ دیا ہے کہ انھیں کسی حالت میں بھی کتب خانہ سے باہر نہ لے جایا جائے۔[۹]

کتب خانوں پر ایک نظر اس خواب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کتابیں جمع کرنے کا ذوق مسلم عہد میں اتنا شدید اور مستحکم ہو چکا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی خوں ریزیاں بھی اسے کم نہ کرسکیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس ذوق کی جڑیں گہری اور مضبوط کرنے میں مسلم بادشاہوں اور امیروں نے اپنی دولت بڑی فراخ دلی سے صرف کی تھی۔ عہد مسلم کے ہندوستان میں بادشاہ، امرا اور عوام سب کتابیں جمع کرنے اور مدرسے قائم کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ دہلی سلطنت میں یہ شوق اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ مدرسوں اور کتب خانوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ مغلیہ عہد تو اس اعتبار سے عہد زریں کہا جاسکتا ہے کہ کتب خانوں کی زیادہ سے زیادہ ترقی اسی زمانہ میں ہوئی بعض مغل بادشاہوں کے کتب خانے پوری دنیا میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمایوں کا کتب خانہ اس لئے نادر کہا جاتا ہے کہ اس میں ریاضی اور نجوم کی نایاب اور منتخب کتابیں جمع تھیں۔ اکبری کتب خانہ کے یکتائے روزگار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں کثیر تعداد میں جمع تھیں۔ جہانگیر کا کتب خانہ آرٹ کی کتابوں کا بے بہا خزانہ تھا۔ عالمگیر کا کتب خانہ اسلامیات کی کتابوں کا مخزن ہونے کی وجہ سے بے نظیر تھا۔ شہزادیوں کے کتب خانوں میں زیب النساء کا کتب خانہ نہایت نفیس تھا۔

شاہانِ دہلی کی مملکت کے علاوہ خود مختار حکومتوں دکن، گجرات، بنگال، کشمیر، وغیرہ میں بھی گراں قدر کتب خانہ موجود تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بادشاہ علوم و فنون

---

[۹] ایک مشرقی کتب خانہ ص ۸ (انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ)

کے بڑے سرپرست تھے ان میں سے ہر فرماں روا علم کی سرپرستی کرنے میں ایکدوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

ہندوستان کے عہد اسلامی میں گشتی کتب خانوں (MOBILE LIBRARIES) کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ہمایوں کے بے سروسامانی کے عالم میں کتابوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے مارے مارے پھرنا، جہانگیر او عالمگیر کے ساتھ مہمات کے دوران میں کتابوں کا ہونا بیجاپور کے فرماں روا علی عادل شاہ کا کتابوں کو اپنا رفیق سفر بنانا کتب خانوں کی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔

ہندوؤں کا کتابی ذوق

اس سے بھی اہم اور لائق ذکر بات یہ ہے کہ مسلم دور حکومت میں کتابیں جمع کرنے کا شوق صرف مسلمانوں تک محدود نہ رہا بلکہ ہندوؤں میں بھی پھیلا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم کی حفاظت کرنے میں کسی تعصب سے کام نہیں لیا اور تعلیم کے معاملہ میں ذات، پات اور مذہب وملت کی کوئی تفریق نہ رکھی۔ انھوں نے سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کرائے۔ ہندوؤں کی تعلیم کے لئے ملتان، متھرا اور بنارس وغیرہ میں پاٹ شالے اور مدرسے قائم کئے، ان کے درباروں میں ہندو فضلاء کو مسلمان فضلاء کے برابر جگہ ملتی تھی، مدرسوں میں ہندو اور مسلمان طالب علم ساتھ ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ اسلامی کتب خانوں میں سنسکرت وغیرہ کی کتابیں بھی رہتی تھیں، اس آزاد تعلیمی پالیسی کا اثر ہندوؤں پر نہایت گہرا پڑا اور ان میں تحصیل علم کا جذبہ، کتابیں جمع کرنے کا شوق اور خطاطی وخوشنویسی کا ذوق پیدا ہو گیا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے[۱]۔

"یہ تو ہم نہیں کہتے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا لیکن اس عہد میں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو شرفاء میں کتب خانوں

---

[۱] ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ ص ۲۴۳-۲۴۴۔ یہ مقالہ سید سلیمان ندوی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۸ء بمقام کلکتہ پڑھا تھا اسے آل انڈیا پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے سید الطاف علی بریلوی کے وقیع دیباچے کیساتھ ۱۹۵۴ء میں شائع کیا ہے۔

کے قائم کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ تاریخی حوالوں کو چھوڑ کر آج ہندوؤں کے جو قدیم علمی گھرانے موجود ہیں وہاں عربی اور فارسی کے چند فرسودہ جلدیں کس مپرسی میں پڑی ہوئی ملیں گی۔ بڑے بڑے ہندو امرا کے ایوانوں میں دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتب خانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا۔ لاہور، دلی، لکھنؤ، پٹنہ اور ڈھاکہ میں ایسے بکثرت گھرانے ملیں گے۔ پٹنہ میں اس وقت دو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہیں جن کے یہاں عربی کتابوں کے نادر نسخے اب تک موجود ہیں اور ان کو اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان کو جدا نہیں کر سکتے۔ راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان میں اس قسم کا ایک نادر کتب خانہ موروثی چلا آتا ہے۔"

واقعاتِ بابری کا ایک نہایت قیمتی نسخہ

شائقین علوم کی فہرست میں راجہ جے سنگھ والیٔ جے پور اور راجہ بنے سنگھ والیٔ الور بہت بڑا درجہ رکھتے تھے جنھوں نے محمد شاہ کے عہد میں علم ہیئت اور نجوم کی ترقیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ راجہ بنے سنگھ کو کتابیں جمع کرنے کی ایسی لگن پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے واقعات بابری[۱] کا ایک نسخہ پانچ ہزار روپیہ میں خریدا تھا اور گلستانِ سعدی کے نسخہ کی تیاری پر سوا[۲] لاکھ روپے خرچ کر دئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قابل دید نسخہ کو میر پنجہ کش کے شاگرد آغا مرزا دہلوی نے لکھا تھا اس کا ایک ورق ۱۲ دن میں تیار ہوا اور پوری کتاب پندرہ برس میں مکمل ہوئی۔ اس کا سنہ تکمیل ۱۲۶۵ھ (۴۸-۱۸۴۷ء) ہے۔ یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ گلستاں کے اس قیمتی اور خوب صورت نسخہ کی کتابت و تزئین کا قطعہ تاریخ مرزا غالب نے لکھا ہے مگر یہ ان کے دیوان کے متداول نسخوں میں موجود نہیں ہے۔

قطعۂ تاریخ:

فرزانۂ یگانہ مہاراؤ راجہ را	بادا بقائے دولت و اقبال جاوداں
مہرش یکے ز کارگزارانِ بارگاہ	ماہش یکے ز ناصیہ سایانِ آستاں
فرمود تا طرازِ گلستاں کنند نو	زاں ساں کہ در بہار شود تازہ بوستاں

---

[۱] و [۲] گلستانِ سعدی اور واقعات بابری کے یہ نسخے الور کے میوزیم میں ہیں۔ [۳] ملاحظہ ہو روداد کل راجستھان اردو کنونیشن از احترام الدین احمد شاغل۔ ص ۱۱۰ اور ۱۱۶۔

آغا کہ حق سپردہ بدستش کلیدِ گنج ؛ تا کردہ خامہ را بہ نگارش گہر فشاں
رخشیدِ حسنِ جوہرِ الفاظ از مداد ؛ زاں ساں کہ در سوادِ شب انجم شود عیاں
غالب طراز سال بدیں گونہ نقش بست ؛ از روئے طرزِ تعمیہ در معرضِ بیاں
ہر کس کہ خواہد آگہی از سالِ اختتام ؛ باید کہ دل نہد بہ گلستانِ بے خزاں

۳۴ + ۱۲۳۱ = ۱۲۶۵ھ

کتب خانوں پر اولیاء اللہ کا فیضان ہندوستان میں کتابیں جمع کرنے کے شوق کو عام کرنے میں اولیاء اللہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ حضرات مسلم فاتحین کی آمد سے پہلے ہندوستان تشریف لائے اور پھر ابرِ کرم بن کر سارے ملک پر چھا گئے۔ لاہور میں داتا گنج بخشؒ، اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، دلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ و خواجہ نظام الدین اولیاؒ، پاک پٹن میں بابا فریدؒ، ملتان میں شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ اُچ (سندھ) میں جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت، بنگال میں شیخ جلال الدین تبریزیؒ گجرات میں نور قطب عالم، گلبرگہ میں سید محمد گیسو درازؒ اور اورنگ آباد میں بابا شاہ سعیدؒ[۱] پلنگ پوش و بابا شاہ مسافر وغیرہ کی خانقاہوں کے دروازے مسلم و غیر مسلم دونوں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں نے انسانی اعمال میں اخلاص[۲] کی روح بیدار کرنے کے لئے جو مجاہدے اور ریاضتیں مقرر کی ہیں ان میں تحصیلِ علم بھی ایک اہم عنصر ہے چنانچہ شیخ سراج الدین عثمانی کو منصبِ خلافت عطا کرتے وقت حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا تھا کہ "اس کام میں علم سب سے زیادہ درکار ہے اور تمھیں علم سے ابھی وافر حصّہ نہیں ملا"

[۱] بابا شاہ سعید پلنگ پوش اور بابا شاہ مسافر کے بارے میں ایک نہایت قابلِ قدر مضمون "اورنگ آباد کی پن چکی اور اس کی تاریخ" رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جون اور جولائی ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے۔ [۲] تصوف کی زبان میں اخلاص فی العمل، احسان کو کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اسے اتنا یقین ہو کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے یہی وہ صفت احسان ہے کہ جو انسان کو فرشتہ خصلت بنا دیتی ہے۔

اسی وجہ سے شیخ موصوف نے پڑھنا شروع کیا اور کئی سال تک تعلیم جاری رکھی اسی طریقہ کار کا یہ نتیجہ ہے کہ صوفیائے کرام کے نام ہندوستانی مصنفین کی صفِ اول میں نظر آتے ہیں ۔ فارسی اور ہندی زبانوں کو ان سے فیض پہنچا اردو میں تصنیف و تالیف کا آغاز ان ہی کے بابرکت ہاتھوں سے ہوا شمالی ہند میں حضرت امیر خسرو اور خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی دکن میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شمس العشاق شاہ میراں جی شاہ برہان الدین جانم اور شاہ میراں جی خدا نما کی تصانیف اردو نظم و نثر کی اولین کتابیں شمار کی جاتی ہیں ۔

غرض اسلام اور علم کی اشاعت کا کام خوبی کے ساتھ انجام دینے کے سلسلے میں صوفیائے کرام نے اپنی خانقاہوں میں کتابوں کے بڑے اچھے ذخیرے جمع کئے تھے ۔ ان میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے کتب خانہ کی مورخین نے بڑی تعریف کی ہے ۔ اصل میں تو ہر سچا صوفی ایک متحرک کتب خانہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے نورِ باطن سے لوگوں کے دل و دماغ کو علم و عرفان کی روشنی سے منور کر دیتا ہے ۔

الغرض مسلمانوں کے عہد میں کتابیں جمع کرنے کا ذوق سندھ سے بنگال اور کشمیر سے مدراس تک جاری و ساری تھا اور ہندوستان میں چاروں طرف کتب خانے اور مدرسے پھیلے ہوئے تھے ۔ ساحل ملابار اور کارومنڈل کے علاقوں میں تو مسلم فتوحات سے پہلے عرب سوداگروں اور مشائخ و علماء کی بدولت علم کی شعاعیں پہنچ گئی تھیں ۔ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد ملتان، لاہور، دہلی، گجرات اور لکھنؤ کے علمی مراکز سارے ہندوستان کو فیض پہنچاتے رہے ۔ فرنگی محل لکھنؤ کے ایک عالم ملا عبد العلی بحر العلوم کرناٹک کے نواب محمد علی والاجاہ کی دعوت پر رام پور سے مدراس چلے گئے جہاں علم و فضل کا یہ دریا برسوں بہتا رہا ۱۸۱۹ میں مولانا نے وہیں وفات پائی ۔ مسلم عہد کے اس آخری دور میں بھی ہندوستان کے ہر شہر میں علم کے دریا بہہ رہے تھے اور ہر شخص کے دل میں تحصیل علم کا شوق موجزن تھا کرنل سلیمن ریذیڈنٹ اودھ نے ۱۸۴۸ء میں جو خفیہ رپورٹ لندن بھیجی تھی اس میں لکھا تھا۔

شرح اسرار خودی مولفہ یوسف سلیم چشتی ۔ ص ۲۳۲ ۔

مُسلمانوں میں تحصیلِ علم کا شوق اس قدر شدید ہے کہ جو متصدی بیس روپیہ
ماہوار تنخواہ پاتا ہے وہ بھی اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے ایک منشی یا مولوی ضرور
ملازم رکھتا ہے اور تعلیم یافتہ مسلمان منطق اور فلسفہ میں اس قدر
ماہر ہیں کہ انگلستان کا گریجویٹ ان کے سامنے لب کشائی کی جرأت
نہیں کرسکتا"۔

کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد

مسلم عہد کے سارے کتب خانوں کی تفصیل اور کتابوں کی تعداد تو نہیں مل سکی ہے لیکن معاصر تاریخوں سے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ اکبری کتب خانہ میں ۲۴ ہزار جہانگیر کے کتب خانہ میں کتابوں اور تصویروں کی تعداد تقریباً ۶۰ ہزار، فیضی کے کتب خانہ میں ۴۳۰۰، نوابین اودھ کے کتب خانہ میں تقریباً ۳ لاکھ اور وزیر محمود گاواں کے پاس ۳۵ ہزار کتابیں تھیں ان کتب خانوں میں بھی ایک کتاب کے بہت سے نسخے رہتے تھے۔ فیضی کے کتب خانے کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں مثنوی نل دمن کے ۱۰۱ نسخے تھے۔

درس گاہی کتب خانوں کی کثرت

چونکہ کتب خانوں اور مدرسوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ان کے اعداد و شمار کا اندازہ لگانے کے لئے اگر اس عہد کے مدارس[1] کی تعداد بھی دیکھی جائے تو کتب خانوں کی تصویر واضح طور پر نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔ صرف دہلی اور آگرہ میں جو علمی اعتبار سے ہندوستان کے بغداد و قرطبہ تھے۔ ہزاروں چھوٹے بڑے کتب خانے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر محمد تغلق کے عہد کو لیجئے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس وقت دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے ہر مدرسے کے ساتھ کتابوں کے ذخیرے بھی ضرور ہوں گے اس کے یہ معنی ہوئے کہ دہلی میں شاہی اور شخصی کتب خانوں کے علاوہ "ایک ہزار درس گاہی کتب خانے"۔ تھے ہر کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد مدرسے کی حیثیت کے مطابق ہو گی یہ اگر ایک محتاط اندازہ کے مطابق دوسو

---

[1] اسلامی عہد کے مدارس کا مفصل حال ملاحظہ ہو (الف) "ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں" از مولوی ابوالحسنات ندوی" (ب) LAW- PROMOTION OF LEARNING IN INDIA

کتب خانہ یا اس سے کچھ کم بھی رکھی جائے تو ان درس گاہی کتب خانوں میں ڈیڑھ دو لاکھ کتابیں ہوئیں جو اس زمانہ کے لحاظ سے بڑی کثیر تعداد کہی جا سکتی ہے۔

عہد مغلیہ میں مدرسوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا اور اس ترقی کا سلسلہ سلطنت مغلیہ کے آخری دم تک جاری رہا۔ لکھا ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں یعنی برطانوی عہد حکومت سے قبل صرف بنگال میں مدرسوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی اس حساب سے سارے ہندوستان میں لاکھوں مدرسے ہوئے اور درس گاہی کتب خانوں کی تعداد بھی لاکھوں تک پہنچی۔

غرض ہندوستان کے اسلامی کتب خانوں میں کتابوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ کئی کروڑ ہو سکتا ہے۔ یہ تعداد اس عہد کی علمی سرگرمیوں کے دیکھتے ہوئے بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی

کتابوں کی فراہمی

ہند کے اسلامی عہد میں کتابوں کی فراہمی کے لئے کم و بیش وہی وسائل اختیار کئے جاتے تھے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ہندی مسلمانوں نے کتابیں فراہم کرنے میں جس کاوش اور شغف سے کام لیا اس کی بدولت اطراف عالم سے کھنچ کھنچ کر نادر سے نادر کتابیں ہندوستانی کتب خانوں میں پہنچ جاتی تھیں غلام خاندان کے سلطان ایلتمش کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بیرون ہند سے اچھی اچھی کتابیں منگواتا اور ہندوستان کے علمی خزانوں کو مالا مال کیا کرتا تھا اسی کے عہد میں آداب السلاطین اور رمعاۃ السلاطین جیسی کتابیں بغداد سے آئیں[1]۔ اکبر کے کتب خانہ میں باہر سے آئی ہوئی کتابوں میں یاقوت کی معجم البلدان کی ضخیم جلدیں بھی موجود تھیں۔ ایک ترکی دیوان[2] کا نسخہ سلاطین خراسان و ہرات کے کتب خانوں سے منتقل ہوتا ہوا جہانگیر کے کتب خانہ میں پہنچا۔ شاہ جہاں کے کتب خانہ میں حسینی کے شہنشاہ[3] نامہ کا نسخہ تھا جو سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں ترکی سلطان محمد سوم کے لئے قسطنطنیہ میں لکھا گیا تھا۔ عالمگیر کے کتابی ذوق کا شہرہ سُن کر ہرات سے

---

[1] آب کوثر از شیخ محمد اکرم ص ۱۳۶۔

[2] اس کا سرورق جس پر جہانگیر کی تحریر ہے اب کتب خانہ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

[3] یہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں ہے۔

اس کی خدمت میں قرآن کا ایک نفیس[1] نسخہ بھیجا گیا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے سلسلہ میں خود عالمگیر نے بھی بہت سی کتابیں بیرون ہند سے منگائی تھیں۔ ریاست ٹونک کے ایک امیر عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں "متنِ حدیث" کے ایک نادر نسخہ کی نقل عرب سے حاصل کی گئی تھی۔ عالمگیری عہد کے ایک بزرگ مُلّا محب اللہ بہاری نے اپنی کتاب "مسلم الثبوت" کی تصنیف کے زمانہ میں اصول فقہ کی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا تھا وہ سب ہندوستان سے باہر کی تصانیف پر مشتمل تھا۔

ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں یہ کتابیں بڑے جتن سے ہاتھ آئی ہوں گی اور ان کے حاصل کرنے میں بے حد وحساب روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ مسلم عہد کے ہندوستان میں کتابوں کے ایسے عاشق زار پیدا ہوگئے تھے جو ایک کتاب کی قیمت سینکڑوں اور ہزاروں روپیہ تک ادا کرنے میں پس وپیش نہ کرتے تھے اسی وجہ سے کتابوں کی تجارت کو فروغ ہوا۔ ہر شہر میں کتب فروش موجود تھے جو دنیا بھر سے کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے اور شائقین سے خاطر خواہ قیمتیں پاتے تھے۔

ہدیوں اور تحفوں میں کتابیں بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے والے بھی خالی ہاتھ نہ جاتے ان کے دامن زر و جواہر سے بھر دیئے جاتے تھے۔ ایک ایرانی شخص نے سلطان محمد تغلق کے دربار میں ابن سینا کی کتاب کا ایک نسخہ پیش کیا جو یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اس پر بادشاہ نے خوش ہو کر پیش کرنے والے کو دو لاکھ مثقال یا اس سے زیادہ سونا انعام میں دیا ایک آدمی نے اسی سلطان کے سامنے چند کتابیں پیش کیں تو سلطان نے اسے جواہرات عطا کئے جن کی قیمت سونے کے سکّے کے لحاظ سے بیس ہزار مثقال تھی۔ اس سلسلہ میں مغل بادشاہوں کی فیاضیاں اس درجہ بڑھی ہوئی تھیں کہ شاہجہاں نے ایک قصیدے کے صلہ میں اپنے درباری شاعر حاجی محمد جان قدسی کا منہ سات بار موتیوں سے بھر دیا تھا ان فیض رسانیوں کے باعث ایران سے بھی ارباب علم و فن کھچ کھچ کر ہندوستان چلے آرہے تھے

---

[1] یہ کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے اس پر ہرات سے آنے کی تاریخ ۱۵ شوال ۱۰۹۰ھ درج ہے۔

بقول علامہ شبلی ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے۔

بیرونِ ہند سے آنے والے حضرات اپنے ساتھ کتابیں بھی لاتے تھے عہد تغلق میں ایک عالم شمس الدین چار سو حدیث کی کتابیں لے کر ہندوستان آئے تھے علی عادل شاہ فرمانروائے بیجا پور کے پاس شیراز سے جو لوگ آئے اور انعام واکرام لے کر واپس ہوئے ان کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے اس سے اندازہ لگائیے کہ سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے عہد میں کتنے بے شمار عالم ہندوستان آئے ہوں گے اور اگر فی کس سو کتابوں کا بھی اوسط رکھا جائے تو باہر سے آنے والی کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔

اب دیکھئے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں ایک طرف تو باہر سے کتابیں آنے کا تانتا بندھا ہوا ہے دوسری طرف ملک کے اندر مصنّفین اور مولّفین کی ایک جماعت تصنیف وتالیف میں مصروف ہے اس طرح ہندوستان کتابی اعتبار سے مالا مال ہو رہا ہے اور کتب خانوں کی رونق میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

کاغذ کتابوں کی فراہمی میں کاغذ سازی اور خطاطی کی ترویج وترقی سے غیر معمولی اضافہ ہوا مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں عموماً لکھنے کے لئے تاڑ کے پتوں اور بھوج[۱] پتروں کا استعمال ہوتا تھا لیکن جب مسلم عہد میں کاغذ کا رواج ہوا تو کاغذ سازی کے کارخانے ہند کے مختلف شہروں میں کھل گئے۔ اکبری دور میں ایک کارخانہ

---

[۱] البیرونی لکھتا ہے کہ "جنوبی ہندوستان میں تاڑ کے پتوں پر لکھتے ہیں۔ پتوں کی یہ کتاب ایک دھاگے سے اسطرح بندھی ہوتی ہے کہ دھاگہ پتوں کے بیچ کے سوراخوں میں گزرتا ہوا ہر پتے میں سماجاتا اور کتاب کو یکجا رکھتا ہے۔ وسط اور شمالی ہند میں درخت توز کی چھال (لکھنے کیلئے) استعمال کرتے ہیں اس کو بھوج کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ لمبی اور پھیلی ہوتی انگلیوں کے برابر یا اس سے کچھ کم چوڑی ہوتی ہے اس کو کسی طریقہ سے مثلاً تیل لگا کر اور صیقل کر کے سخت اور چکنا کر لیتے ہیں اور اس پر لکھتے ہیں۔ یہ چھالیں متفرق ہوتی ہیں اور انکی ترتیب مسلسل ہندسوں سے معلوم ہوتی ہے۔ پوری کتاب کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹی ہوئی دو تختیوں کے درمیان جو کتاب کے برابر ہوتی ہیں، بندھی رہتی ہے ان کتابوں کا نام پوتی (پوتھی) ہے"

کتاب الہند۔ البیرونی (اردو ترجمہ) ص ۲۲۴۔

کشمیر میں قائم ہوا اور طرح طرح کے کاغذ بنائے جانے لگے۔ ابری کاغذ عہد مغلیہ میں ایجاد ہوا تھا، اس زمانے میں کالپی، ظفرآباد، پٹنہ[1]، بہار شریف اور اروال کاغذ سازی کے لئے بہت مشہور تھے۔ قصبہ بہار شریف کا ایک محلہ کاغذ سازی ہی کی وجہ سے آج تک کاغذی محلہ کہلاتا ہے۔ ظفرآباد کی نسبت لکھا ہے[2] کہ یہاں پانچ سو دکانیں (کارخانے) کاغذ بنانے کی تھیں اور سال میں تین چار لاکھ روپے کی تجارت ہوتی تھی۔ یہاں آٹھ قسم کا کاغذ بنتا تھا۔ اروئی نصیر ہیرانند، راسی، موٹھا، تپنگی، چوکھوٹا اور مسلم۔

---

[1] مولوی سید مقبول احمد صمدنی نے حیات جلیل حصہ اول کے صفحہ ۱۴۹ پر لکھا ہے کہ ۱۸۳ کے قریب تک انگریزی کتابیں پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھیں۔

[2] ملاحظہ ہو "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی جلد اول حاشیہ ص ۹۲۔ حوالوں میں جہاں کہیں "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" آتا ہے اس سے یہ ہی کتاب مراد ہے۔

کتب خانوں کا نظام

مسلم عہد میں کتب خانوں کی ترتیب اور نظام کی طرف بھی توجہ کی گئی بڑے بڑے کتب خانوں میں تراجم کا سرشتہ بھی ہوتا تھا مگر اس سلسلہ میں باقاعدہ محکمے مغلوں کے زمانے سے قائم ہوئے۔ کتب خانوں میں ملازمین کی تعداد اور ان کی استعداد کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اکبر نے شاہی کتب خانہ کی کتابیں مصوّر اور مزین کرانے کے لئے ایکسو گیارہ نامور مصوّر مقرر کئے تھے، ان کے علاوہ بہت سے کاتب، نقاش اور جلد ساز تھے۔ اسی طرح دوسرے مغل بادشاہوں اور ان کے امراء وغیرہ کے کتب خانوں میں بہت سے اصحاب علم وفن کام کرتے تھے۔ جن میں اکثر عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ دکن کے عادل شاہی خاندان کے فرماں روا عادل شاہ اول کے کتب خانہ میں کارکنوں کی تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان ہے کہ نوابین اودھ کے کتب خانوں میں تقریباً تین سو آدمی ملازم تھے۔ اکبر کے ایک رتن ابوالفضل کے ذاتی کتب خانہ میں چالیس کاتب کام کرتے تھے۔ عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانے میں بقول علامہ شبلی اہل کمال کا ایک بڑا عملہ مقرر تھا۔ اُس عہد کا مشہور جلد ساز محمد امین خراسانی اسی کتب خانہ کے عملہ میں شامل تھا۔ یہ مدت تک مشہد مقدس کے کتب خانہ میں رہا اس کے بعد خراسان سے نکل

---

[۱] ڈاکٹر اسپرنگر نے نوابین اودھ کے کتب خانوں کی فہرست ۱۸۴۸ء میں تیار کرنی شروع کی تھی اس فہرست کی پہلی جلد فارسی اور اردو نظم سے متعلق کلکتہ سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی باقی حصے شائع نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کی ایک اہم تصنیف "لائف آف محمد" ہے جس کی پہلی جلد الٰہ آباد سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی اور باقی تین حصے ۱۸۶۵ء میں بمقام برلن چھپے ڈاکٹر صاحب کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو دلی کالج اردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء۔

کر ہندوستان آیا۔ یہاں خانخاناں کے دربار میں رسائی ہوگئی انھوں نے اپنے کتب خانہ سے منسلک کرکے چار ہزار روپیہ[۱] مشاہرہ مقرر کیا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ "دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی کتب خانہ کے تربیت یافتہ ہیں اکثر شعرا خوش نویس صنّاع جن کو خانخاناں تربیت دینا چاہتا تھا۔ کتب خانہ کے کام پر مقرر ہوتے اور ترقی کرتے کرتے نادر روزگار ہو جاتے تھے"

ملازمین کے انتخاب میں مذہب و ملّت کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا۔ عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانہ کا ایک کارکن مادھو تھا جسے مصوری اور شبیہ سازی میں کمال حاصل تھا مادھو کے علاوہ اور بہت سے ہندوئوں کے نام خطاطوں اور مصوروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں پنڈت جگن ناتھ، رائے منوہر لال، وسونت کمار، لبسادن، کیسو، تارا، ہری بنس اور جگن اکبری عہد میں خطاط و مصوّر تھے۔ جہانگیری دور کے ممتاز مصوروں میں منوہر اور لشن داس شامل تھے اور عالمگیر کے زمانہ میں پنڈت لکشمی رام، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل رائے مشہور خوشنویس تھے۔

کاتب چونکہ بادشاہ خوشنویسی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اس لئے شاہی کتب خانہ کے لئے کاتب کا اہتمام خاص طور پر کیا جاتا اور یگانۂ روزگار کاتب ملازم رکھے جاتے تھے شاہجہاں کے عہد میں کاتبوں کی قدر و منزلت اتنی بڑھی کہ انھیں مہتمم کے عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ کاتب کتب خانوں کے لئے کتابوں کے نسخے تیار کرتے تھے ان سے بوقت ضرورت کتابوں کی نشر و اشاعت کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کو جب تزک جہانگیری کی اشاعت کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنے کتب خانہ کے کاتبوں کو اس کتاب کے بہت سے نسخے تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ نسخے حکام سرکاری اور ملک بھر کے معزز امراء کو تقسیم کئے گئے۔

خوشنویسی کے فن میں ہندوستان بھی کسی اسلامی ملک سے پیچھے نہیں رہا یہاں کے بادشاہوں، صوفیوں اور عالموں نے اُسے عرش معلیٰ پر پہنچا دیا تھا۔ ایک طرف سلطان ناصرالدین محمود اور عالمگیر تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے لکھ رہے تھے۔

---

[۱] مقالات شبلی حصہ دوم ص ۷۳۔

دوسری طرف سید عبدالجلیل بلگرامی جیسے ذی علم صوفی کے دست وقلم کتابت میں مصروف تھے۔
لیکن اس فن کی اصل ترقی عہدِ مغلیہ میں ہوئی اس سے پہلے سلطان ابراہیم غزنوی اور سلطان ناصر الدین محمود کے نام کاتبوں کی فہرست میں ملتے ہیں مگر اس زمانہ میں یہ فن پوری طرح ترقی نہ کر سکا۔ کتابیں عموماً خطِ شکست میں لکھی جاتی تھیں۔ مغلوں کے حسن ذوق نے اسے پسند نہ کیا اور خطِ نستعلیق میں کتابیں لکھوائیں۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سارے مغل بادشاہ شہزادیاں اور شہزادے خوشنویسی سے بے انتہا شغف رکھتے تھے۔ شاہجہاں نہایت اچھا خوش نویس تھا۔ عالمگیر کو بھی اس فن میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ بزم تیموریہ میں ہے کہ وہ شہزادگی سے لے کر آخری عمر تک فرصت کے اوقات میں صبح ۵ بجے سے ۷ بجے تک اور سہ پہر کو ۲ ½ بجے سے ۵ ½ تک قرآن شریف لکھا کرتا تھا اُس نے مدینہ منورہ بھیجنے کے لئے دو قرآن اپنے ہاتھ سے لکھے اور ان کی تزئین وغیرہ پر سات ہزار روپے صرف کئے۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ کی کچھ وصلیاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغلوں کے زوال کے بعد بھی خطاطی کا شوق کمال پر تھا۔
خود مختار ریاستوں کے حکمران بھی اس فن کے بڑے دلدادہ اور مربی تھے گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ اور بیجا پور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی نہایت نفیس خوش نویس تھے۔ نوابین اودھ نے فن خوش نویسی کی جس طرح سرپرستی کی اس کا حال عبدالحلیم شررؔ نے "گزشتہ لکھنؤ" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔
ان شاہانہ سرپرستیوں کے اثر سے وراقیت[۱] اور نساخیت کا نظام ہندوستان بھر میں قائم ہو گیا تھا اور فن کتابت نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی ایک ایک آدمی صرف اپنے قلم سے مستقل کتب خانہ مہیا کر لیتا تھا۔ ابوالفضل کے والد شیخ مبارک ناگوری نے اپنے ہاتھ سے پانچ سو ضخیم کتابیں لکھی تھیں۔ اُس زمانے میں یہاں ایسے باکمال خوش نویس پیدا ہوئے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ عہد مسلم کے بالکل آخر میں ایک خوشنویس

---

[۱] وراق کے کئی معنی ہیں۔ وراقیت کے تحت کتابت، نقل نویسی، جلد بندی اور کتب فروشی وغیرہ آتے ہیں۔

میر بنیاد علی[1] مرتعش رقم تھے جن کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر میں رعشہ کی کیفیت کو فن کا درجہ دے رکھا تھا۔

مصوّر شاہان مغلیہ کے کتب خانوں میں کاتبوں کے ساتھ ساتھ مصوّر بھی نظر آتے ہیں یہ کتابوں میں تصویریں بناتے، مرقعے اور شبیہیں تیار کرتے پھر ان میں نقرئی اور سنہرے رنگ بھر کر اپنی فن کاری کے جوہر دکھاتے تھے کتابی تصویر کا فن بھی مغلوں کے عہد میں انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا۔ دراصل اکبر کی مصوری سے والہانہ شیفتگی اور جہانگیر کی اس فن میں مہارت اور باریک تنقیدی نظر مصوری کی ترویج و ترقی کا باعث ہوئی مغلوں کے عہد میں باہر سے خواجہ عبدالصمد شیرازی، میر معصوم قندھاری، مولانا عبدالرحیم ہراتی، میر عبداللہ تبریزی، عبدالرشید دیلمی اور سید علی خاں تبریزی جیسے صاحب کمال خطاط و مصور ہندوستان آئے اور قدرشناس بادشاہوں کی بارگاہوں سے شیریں قلم، عنبریں قلم، مشکیں رقم، جواہر رقم، یاقوت رقم، زرّیں قلم، خطابات پائے۔ اس طرح مغلوں کے کتب خانوں میں شہرۂ آفاق خطاط و مصوّر جمع ہو گئے تھے۔

کتابوں کی سجاوٹ اور حفاظت مغلوں کے عہد میں کتابوں کو نقش و نگار سے سجانے اور ان کی خوبصورت و منقش جلد بندی کرنے کا فن بھی انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس کام کے لئے کتب خانوں میں نقاش اور جلد ساز رہتے تھے جن کی فن کاری کے نمونے آج بھی جابجا ملتے ہیں۔ کتابوں کو سجانے اور انھیں آراستہ و پیراستہ کرانے پر جو بے دریغ روپیہ اس زمانے میں صرف کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کو مرصّع اور مزیّن کرانے پر دس ہزار روپیہ صرف کئے تھے اور سلطان ٹیپو نے قرآن شریف کے ایک نسخہ کی تزئین پر نوّے ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔ عالمگیری عہد کا ایک قرآن شریف پٹنہ کے ایک مارواڑی جالان کے پاس ہے یہ اول تا آخر سونے کے حروف میں ہے اور فن کار نے نقاشی کا فن اس پر ختم کر دیا ہے۔

---

[1] میر بنیاد علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین وصلیاں کتب خانہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔

ان حسین اور قیمتی کتابوں کو نمی، دیمک اور چوہوں سے محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ کتابوں کی دیکھ بھال کے لئے کتب خانوں میں وراق مامور تھے جو نیم کی پتیاں سکھا کر کتابوں کے اندر رکھتے تھے اور ورق گردانی کر کے یہ دیکھتے رہتے تھے کہ ان میں کہیں دیمک تو نہیں لگی یا سیلن کا اثر تو نہیں ہو گیا۔ عام طور پر کتابوں کے شروع میں دیمک کے بادشاہ کا نام "کبیکج" لکھ دیا جاتا اور یہ عقیدہ تھا کہ اس کے بعد کتابیں دیمک سے محفوظ ہو جائیں گی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر کتابوں کے یہ الفاظ بھی دیمک نے کھا لئے تھے۔

کتابوں پر مہریں اور عبارتیں

کتابوں کی حفاظت کے سلسلے میں یہ احتیاط برتی جاتی تھی کہ جب کوئی کتاب شاہی کتب خانے میں داخل ہوتی تو اسے تحویلدار کے حوالہ کیا جاتا وہ اس پر پہلے شاہی مہر لگاتا پھر اپنی مہر ثبت کرتا اور اس مہر کے نیچے تحویل کا سنہ لکھ کر اپنے دستخط کر دیتا تھا۔ جب تحویلدار بدلا جاتا تو نئے تحویلدار کو اپنی تحویل میں لینے کی تاریخ درج کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ بعض کتابوں پر ایک ہی بادشاہ کے عہد میں مختلف تحویلداروں کے نام اور تحویل کی تاریخیں درج ہیں۔ مہروں کے علاوہ کتابوں پر مختلف عبارتیں بھی ملتی ہیں۔ ان مہروں اور عبارتوں سے آج بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کتاب کس کس کی ملکیت میں رہ چکی ہے، اور وہ بطور نذر ملی ہے یا خریدی گئی ہے۔ اکثر کتابوں پر "عرض دیدہ شد" لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب بادشاہ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہے۔ عالمگیری کتب خانہ کی ایک کتاب "حصن حصین" کے متعلق لکھا ہے کہ اس پر عالمگیر کے قلم کا صاد ثبت ہے۔ شاہی امراء اور تحویلداران کتب خانہ کی مہریں بھی پائے جاتے ہیں[1] عالمگیری عہد کے تحویلداروں میں خواجہ سہیل، محافظ خاں اور محمد حافظ کے نام ملتے ہیں۔ دیوان کامران (نسخۂ خدابخش) اور تاریخ تیموریہ (نسخۂ خدابخش) خواجہ سہیل کی تحویل میں رہتے تھے۔ دیوان کامران (نسخۂ خدابخش) پر یہ عبارت درج ہے[2]۔

"۲۷ شوال ۱۰۹۰ھ از وجوہ محافظ خاں تحویلدار متوفی تحویل محمد حافظ شد"

---

[1] مقالات شروانی (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مضامین نثر کا مجموعہ) ص ۴۰۷۔

[2] دیکھئے مجلۂ علوم اسلامیہ ج ۱۔ ص ۱۳۵ (ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اب نہ یہ کتب خانے باقی ہیں اور نہ ان کا عملہ۔ البتہ ان کی یادگاریں کتابوں کی شکل میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی کیسی نادر مرصّع مزیّن، مُطلّا اور مُذہّب کتابوں سے وہ مرحوم کتب خانے معمور تھے۔ یہ کتابیں دراصل عہد گذشتہ کے علمی پیام بر ہیں۔ جو ہند کے مسلم دَور کے علمی، ادبی اور ثقافتی کارناموں کی سرگزشت زبان حال سے سنا رہے ہیں۔

لکھے نہ کیوں نقش پائے ہمت قدم قدم پر مرا فسانہ
میں وہ مسافر ہوں جسکے پیچھے ادب سے چلتا رہا زمانہ

باب چہارم

عہدِ سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ میں

کتب خانوں کی تشکیل و ترقی

۱۲۰۶ء ——— ۱۸۵۷ء

پاک و ہند کے اولین کتب خانے

دہلی سلطنت کے قیام (۱۲۰۶ء) سے تقریباً پانچ سو سال قبل محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۷۱۱ء) کے اثرات سے سندھ میں کتب خانوں کے مرقع تیار ہونے لگے تھے لیکن اس زمانہ سے بھی برسوں پہلے صوفیائے کرام اور تاجروں کی آمد کے باعث جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں عرب آباد ہو گئے تھے جن کی آبادیاں معبر اور مالابار میں آج بھی موجود ہیں۔ اسے یاد رکھیئے کہ وہ عرب اپنے وطن سے کتابیں جمع کرنے کا ذوق و شوق لے کر آئے تھے وہاں ۵۰ھ کے لگ بھگ ہی کتب خانوں کی بنیادیں پڑ گئی تھیں اور کتابوں سے والہانہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا چنانچہ عربوں نے یہاں آکر اپنی بستیوں میں مسجدوں کے ساتھ جو مدرسے اور کتب خانے قائم کئے ہوں گے وہ پاک ہند کے اولین کتب خانے شمار کیئے جا سکتے ہیں۔

فتح سندھ

لیکن کتب خانوں کی تشکیل و ترقی کی پختہ راہیں فتح سندھ نے کھولی تھیں۔ محمد بن قاسم نے دو سال (۷۱۱۔۷۱۳ء) کے عرصہ میں سندھ سے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا پھر فتوحات کا دائرہ بڑھنے کے ساتھ یہ راہیں اور کشادہ ہو گئیں اور کتب خانہ کے قیام کا سلسلہ سندھ اور ملتان کے بعد لاہور، اُچ اور سیالکوٹ تک پھیل گیا۔ یہ خیال رکھیئے کہ کتب خانوں کی رفتارِ ترقی پر محمود غزنوی اور محمد شہاب الدین غوری کے حملوں کے اثرات بڑے پائدار ثابت ہوئے۔ غزنوی حملوں کے اثر سے لاہور پر غزنوی سلاطین کا جو قبضہ برسوں رہا وہ کتب خانوں کی ترقی کے لیئے بڑا معاون ہوا اور جب سلطان

شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دیکر اجمیر اور دہلی کا علاقہ فتح کر لیا۔ تو
مسلمانوں کی حکومت دہلی سلطنت کے نام سے قائم ہو گئی پھر مسلم حکومت کا دائرہ رفتہ رفتہ
بنگال اور دکن تک پھیل گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سندھ اور ہند کے تمام علاقے "برصغیر پاک و ہند"
کہلائے جانے لگے۔

سلطان محمد غوری اور کتب خانے

ان دولتوں کے ذکر کے ساتھ ۱۱۹۲ء کو بھی یاد رکھئے اسی سال
سلطان شہاب الدین غوری کی ایک لاکھ فوج نے راجہ پرتھوی راج
کی تین لاکھ فوج کو ترائن کے میدان میں شکست دیکر شمالی ہند
میں راجپوتوں اور ہندوؤں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور اس علاقہ میں مسلمانوں کی پائیدار
حکومت قائم ہو گئی لیکن یہ واضح رہے کہ محمد غوری ہندوستان میں زیادہ عرصہ نہ رہا وہ دہلی
کے تخت شاہی پر قطب الدین ایبک کو بٹھا کر غزنی جاتے ہوئے راستہ میں قتل کر دیا گیا تھا
مگر اس قلیل مدت میں بھی اس نے اجمیر وغیرہ میں متعدد مدرسے قائم کر کے نئی مسلم سلطنت
میں کتب خانوں کے نشو و نما کے لئے زمین ہموار کر دی یہ سلطان تعلیم کے معاملہ میں نہایت
وسیع النظر تھا اس نے اپنے غلاموں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دیکر غلامی سے شاہی کے مرتبہ پر
پہونچا دیا۔ سلطان کی وفات کے بعد اس کی سلطنت کے کئی ٹکڑے ہو گئے اور ان پر اس
کے غلام حکمراں ہوئے۔ غزنی پر تاج الدین یلدوز کی حکمرانی رہی۔ سندھ اور ملتان ناصر الدین
قباچہ کے حصہ میں آئے اور قطب الدین ایبک دہلی سلطنت کا بادشاہ ہوا اس کا جانشین
شمس الدین التمش اور مشہور سپہ سالار فاتح بہار و بنگال محمد بن بختیار خلجی بھی سلطان
غوری ہی کے غلام رہے تھے یہ خیال رکھیئے کہ ان پانچوں حکمرانوں نے اپنے اپنے علاقوں میں
مدرسوں اور کتب خانوں کی تخلیق کے لئے مثبت اقدامات کئے تھے۔

سلاطینِ دہلی اور کتب خانے

۱۲۰۶ء میں سلاطین دہلی کی سلطنت کے قیام کے بعد سے ہندوستان میں کتب خانوں کا نیا اور سنہرا دور شروع ہوا۔ اب چونکہ اس ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہوگئی تھی اس لئے کتب خانوں کا سلسلہ وسیع ہونے کے امکانات روشن ہوگئے۔ جب دہلی سلطنت کے پہلے سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو یہ شہر علم وہنر کا ایسا عمدہ گہوارہ بن گیا۔ جس میں علمی اور کتابی ذوق کی پرورش اور ترقی نہایت سرعت کے ساتھ ہوئی۔ اسی مرکزی شہر سے یہ ذوق سلاطین دہلی کی فوجوں، تاجروں، مشائخ اور علماء کے قافلوں کے ساتھ بنگال، گجرات اور دکن وغیرہ پہنچا جس نے کتب خانوں کی وسعت اور ان کے استحکام کا مستقل انتظام کر دیا۔ اس موقع پر یہ کہہ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں غلام سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی جو چوراسی برس تک قائم رہی۔ اس کے بعد مختلف خاندان خلجی، تغلق، سید اور لودھی یکے بعد دیگرے ۱۵۲۶ء تک حکومت کرتے رہے۔ لیکن دہلی سلطنت کا تین سو بیس سالہ دور بڑا ناہموار رہا۔ آئے دن خانہ جنگیاں اور حکومت کی تبدیلیاں ہوتی رہیں سلاطین دہلی کو شروع میں مغلوں کے حملے پریشان کرتے رہے۔ پھر ۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے نے انھیں بالکل بے جان کر دیا۔ اس کے باوجود انھوں نے علم و ہنر کا چراغ روشن رکھا اور اہل علم کی قدر دانی اور ہمت افزائی کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا اس زمانہ کے وسطی ایشیا میں چنگیزی حملوں کے تباہ کن اثرات کے باعث جو علماء اور فضلاء بخارا وغیرہ سے دہلی آتے انھیں نہ صرف پناہ دی جاتی بلکہ ان کی قدر و منزلت بھی کی جاتی تھی اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی بیش قیمت کتابیں بھی اپنے ساتھ لایا کرتے تھے۔ پچھلے اوراق میں مولانا [illegible]الدین کا چار سو کتابیں لے کر ہندوستان آنا بیان ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ سلاطین دہلی کی علم نوازی کے اثر سے جا بجا مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے۔ علائی عہد میں تو ہر علم و فن

کے اتنے علماء اور فضلاء دہلی میں جمع ہو گئے تھے کہ بقول مورخ ضیاء الدین برنی دہلی کی عظمت بخارا، بغداد، سمرقند، دمشق، اصفہان اور تبریز سے بڑھ گئی تھی۔[۵]

غلام خاندان دہلی سلطنت کے اس پہلے حکمراں خاندان کے عہد میں ایسی سرگرمیوں کے ذکر ملتے ہیں جن سے کتب خانوں کی تعمیر و ترقی کا قیاس کیا جاسکتا ہے

۱۲۰۶ - ۱۲۹۰ء

قطب الدین ایبک (متوفی ۱۲۱۰ء) نے دہلی فتح کرنے کے بعد مسجد قوت الاسلام تعمیر کی تھی یہ بادشاہ بڑا علم دوست اور سخی تھا اس نے اہل علم و ہنر کو اکرام و انعام سے اتنا نوازا اور ایسی بے پایاں داد و دہش کی کہ لکھ بخش مشہور ہوا۔

قطب الدین ایبک نے صرف چار سال حکومت کی اس مختصر عہد حکومت میں بھی تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیوں کے ذکر ملتے ہیں تاریخ تعلیم[۶] میں ہے کہ "قطب الدین کے عہد میں بے شمار مساجد تعمیر کی گئیں اور اسلامی اصول تعلیم کے ماتحت ہر مسجد میں ایک تعلیم گاہ تھی" جن کے ساتھ اس زمانہ کے رواج کے مطابق کتب خانہ بھی ہوں گے۔ اس عہد کا ایک خاص واقعہ یہ بھی ہے کہ محمد بن بختیار خلجی کو قلعہ بہار سے سنسکرت کی جو کتابیں ملی تھیں وہ اس نے سلطان کی خدمت میں پیش کر دی تھیں[۷] اسطرح دہلی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد ہی کتابوں کی آمد شروع ہو گئی تھی اور کتب خانے کھلنے لگے تھے۔

ایبک کے جانشین سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۱۲۳۵ء) کے عہد میں علمی و تعلیمی سرگرمیاں جاری رہیں، اس نے جو مدارس قائم کئے ان سے اس عہد کے کتب خانوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلطان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بیرون ہندوستان سے اچھی اچھی کتابیں بھی منگواتا تھا اور اس ملک کے علمی خزائن کو مالا مال کرتا تھا۔ اس کے بیٹوں کے لئے بغداد سے "آداب السلاطین اور مآثر السلاطین" کے آنے کا ذکر ہم نے گزشتہ اوراق میں کر دیا ہے سلطان

---

[۶] مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم ص ۴۲، ۴۴، ۲۱۳ (این۔ این لا کی انگریزی تصنیف "پرموشن آف لرننگ انڈر دی محمڈن رول" کا اردو ترجمہ) حوالوں میں جہاں تاریخ تعلیم کا نام آیا ہے اس سے یہ ہی کتاب مراد ہے۔

[۷] آب کوثر۔ ص ۱۳۶۔

کتابوں سے انتہائی لگاؤ کا یہ حال تھا کہ جب قاضی جلال عروس بغداد سے تحفہ میں
خلیفہ مامون رشید کی ایک تحریر[1] لائے جواس نے سفینۃ الخلفاء میں لکھی تھی اسے پا کر سلطان
اتنا خوش ہوا کہ اس کے صلہ میں اس نے قاضی جلال کو اپنی آدھی مملکت دے دینی چاہی ۔

التمش کی جانشین اس کی بیٹی رضیہ نہایت قابل عورت تھی اس کے بارے میں کہا
جاتا ہے کہ اس نے اپنے باپ کے اداروں کو ترقی دی۔ لیکن وہ ایسی سیاسی الجھنوں میں پھنسی رہی
کہ کوئی بڑا علمی کام انجام نہ دے سکی۔ اس کے قتل ہو جانے کے بعد ایک عالم اور متقی سلطان
ناصر الدین محمود (متوفی ۱۲۶۶ء) دہلی کے تخت پر بیٹھا یہ کتابوں کا اتنا بڑا شیدائی تھا کہ اس نے
کتابت کو اپنا دل پسند مشغلہ بنا کر اس فن کو پاک و ہند میں معزز و محترم بنا دیا۔ سلطان اتنا
پرہیزگار انسان تھا کہ وہ سرکاری خزانے کا روپیہ اپنے صرفے میں نہیں لاتا تھا بلکہ قرآن کریم
کی کتابت کر کے اپنے اخراجات پورے کیا کرتا تھا۔ اور سلطنت کے کام اس کا وزیر اور خسر
غیاث الدین بلبن انجام دیتا تھا۔

محمود کا جانشین غیاث الدین بلبن (متوفی ۱۲۸۷ء) غلام خاندان کا بہت بڑا
بادشاہ تھا اس کے رعب و داب اور اس کی دینداری کا بقول مورخ برنی یہ حال تھا کہ بعض
امراء اور روٴساء پر بلبن کے دربار کا جاہ و جلال اور رعب اتنا غالب ہوتا تھا کہ وہ خوف سے
گر پڑتے اور بے ہوش ہو جاتے تھے مگر جب سلطان کسی عالم کا وعظ سننے مسجد میں جاتا تو
وہاں معمولی آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر وعظ سنتا تھا وہ بڑا بہادر اور علم دوست تھا اسکے
عہد میں ممتاز عالم اور مشائخ موجود تھے اور دہلی میں بہت سے علمی مراکز قائم ہو گئے تھے ۔

کتب خانہ بلبن اس سلطان نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جو اس کے علمی شغف اور
اس کے عالی مرتبت درباری علماء کی بدولت بڑی ترقی کر گیا تھا لیکن اس
کے عیش پسند اور نااہل جانشین کیقباد کے عہد میں وہ مزید ترقی نہ کر سکا اس کے کچھ عرصہ
بعد سلطان جلال الدین خلجی نے اسے ترقی دے کر بلبن کی اس علمی یادگار کو اجاگر کر دیا تھا۔

ان سلاطین کی معارف پروری کی بدولت اس نوزائیدہ سلطنت میں کتب خانے

---

[1] اس تحریر کا خلاصہ بزم مملوکیہ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن) کے ص ۹۱ پر ہے ۔

اور مدرسے قائم ہوگئے تھے دہلی کے مدرسوں میں "مدرسہ معزیہ[1]" اور "ناصریہ" نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔

ان کو سلطان التمتش نے سلطان شہاب الدین غوری اور اپنے لڑکے ناصر الدین محمود کے نام سے قائم کیا تھا ان مدرسوں میں شیخ اسحاق علی بخاری اور قاضی منہاج الدین سراج (مصنف طبقات ناصری) مدرس رہے تھے۔ یہ کتاب قاضی منہاج نے ناصر الدین محمود کے نام منسوب کر دی تھی۔ عہد غلاماں کے ایک مشہور مصنف فخر الدین مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر نے ایک ضخیم کتاب بحر الانساب لکھکر قطب الدین ایبک کے حضور میں پیش کی تھی اس نے فنون جنگ پر آداب الحرب بھی لکھی تھی اور اسے التمتش کے نام معنون کیا تھا ایک اور مصنف نظام الدین حسن نظامی نیشاپوری ہیں جنکی تصنیف تاج المآثر میں قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمتش کے عہد حکومت کے واقعات درج ہیں۔

اس عہد میں کئی شعرا بھی موجود تھے۔ مثلاً تاج الدین ریزہ، خواجہ ابو نصر ناصری خراسانی اور امیر روحانی بخاری۔ اول الذکر کے متعلق مصنف آب کوثر نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی ہونے پر فخر کیا کرتا تھا اس نے کہا ہے ؎

مولد و منشا بہ بیں در خاک ہندوستاں مرا ؛ نظم و نثرم بیں کہ با آب خراسان آمدہ است

صوفیائے کرام

غلاموں کے عہد میں صوفیائے کرام کی وجہ سے بھی کتب خانوں کی رونق بہت بڑھ گئی تھی اسے حسن اتفاق کہیئے کہ ایک طرف ۶۰۲ھ میں دہلی سلطنت قائم ہوئی اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح (متوفی ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء) نے دہلی میں روحانی سلطنت قائم کی، ان کے جانشین شیخ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۱۲۶۵ء) نے تو پاک پٹن کو اپنا مرکز بنایا مگر ان کے خلیفہ خواجہ نظام الدین[2] اولیا۔ (متوفی ۱۳۲۵ء) اور ان کے خلیفہ

---

[1] سلطان شہاب الدین غوری کا لقب معز الدین تھا۔

[2] خواجہ صاحب کے ملفوظات کا مکمل مجموعہ فوائد الفواد ہے جسے ان کے مرید حسن سجزی نے مرتب کیا تھا۔

خ نصیر الدین چراغ دہلوی[1] (متوفی ۱۳۵۶ء) نے دہلی کو رونق بخشی۔

کتب خانہ خواجہ نظام الدین اولیاء

ان بزرگوں کی خانقاہوں سے جو کتب خانے منسلک تھے ان میں خواجہ صاحب کا کتب خانہ دہلی سلطنت کے نفیس کتب خانوں میں سے تھا اس کے ذخائر کو بہت بیش بہا کہا گیا ہے اس میں زیادہ تر مذہب اور تصوف سے متعلق کتابیں تھیں حضرت کی رحلت کے بعد ان کے خلیفہ شیخ سراج الدین عثمانی اس کتب خانہ کی کچھ کتابیں اپنے وطن لکھنوتی (بنگال) لے گئے تھے خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے کتب خانے نے اس زمانہ کی روحانی اور علمی زندگی کو جس طرح متاثر کیا اسے پروفیسر وحید مرزا نے مورخ برنی کے حوالے سے یوں تحریر کیا ہے[2]

"زیادہ تر امراء اور بڑے لوگ اور طلاب جو شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے تھے ایسی کتابیں جیسے احیاء العلوم اور اس کا ترجمہ، عوارف، کشف المحجوب، قوۃ القلوب شرح تعرف رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ قاضی حمید الدین ناگوری کی لوائح اور لوائح اور امیر حسن کی فوائد الفواد کے بہت سے گاہک مشتاق رہتے تھے اور کتب فروشوں کی دکانوں پر لوگ زیادہ تر تصوف اور حقائق کی کتابیں تلاش کیا کرتے تھے۔"

خلجی خاندان ۱۲۹۰ - ۱۳۲۰ء

خلجی عہد میں بھی خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو اور دوسرے ارباب علم کی دینی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری رہیں جن سے عوام میں کتابیں جمع کرنے کا میلان پیدا ہوا اور کتب خانوں کی تعداد بڑھی بالخصوص انھیں امیر خسرو کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ ہندوستان کی علمی وادبی اور موسیقی کی تاریخ میں خسرو کو نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے انھیں متفقہ طور پر ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی شاعر مانا گیا ہے انھوں نے ایک طرف اپنی کہہ مکرنیوں، گیتوں، پہیلیوں اور غزلوں سے اردو

---

[1] چراغ دہلی کے ملفوظات کے ایک مجموعہ کا نام "خیر المجالس" ہے

[2] امیر خسرو از پروفیسر وحید مرزا ص ۱۵۸ -

زبان کے ابتدائی خاکہ کو دلچسپ اور دلفریب بنایا اور دوسری طرف اپنی کثیر تصانیف
سے کتب خانوں کی رونق بڑھائی۔ مورخ برنی کا بیان ہے کہ خسرو کی تصانیف اتنی تعد
کہ ان سے ایک کتب خانہ بن سکتا تھا۔ جامی نے ان کی تعداد ننانوے بتائی ہے اس ز
کے ارباب علم میں صرف خسرو ہی ایسے شخص تھے جو اپنی علمی قابلیت، جودت طبع اور دینا
کی وجہ سے مشائخ کے حلقوں اور بادشاہوں کے درباروں میں نگہ محبت و احترام سے دیکھے
جاتے تھے خواجہ نظام الدین اولیاء کو ان سے بڑی محبت تھی جلال الدین خلجی نے انھیں اپنا
ندیم اور مصحف بردار مقرر کیا تھا۔

جلال الدین خلجی (متوفی ۱۲۹۶ء) بڑا رحمدل بادشاہ تھا اسی وجہ سے وہ کامیا
کے ساتھ حکومت نہ کرسکا اور اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کی سازش کا شکار ہو کر قتل
کردیا گیا لیکن علم و ادب اور کتب خانوں کی دنیا میں اس کا نام باقی رہے گا وہ بہت بڑ
شاعر تھا اور کتابوں سے اتنی الفت رکھتا تھا کہ جب اس نے سلطان بلبن مرحوم کا کتب خا
مائل بہ زوال دیکھا تو اسے ترقی دے کر اس کی عمر بڑھا دی۔

شاہی کتب خانہ کے نگراں امیر خسرو

جلال الدین خلجی نے ایک یہ اہم علمی کام انجام دیا تھا کہ "شاہی کتب خا
کا نگراں[1] حضرت امیر خسرو کو مقرر کر دیا تھا اس سے یہ ظاہر ہو
ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ عہدہ نہایت اہم اور محترم سمجھا جاتا تھا۔ غور
فرمائیے کہ اس کتب خانہ کی عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے جس کی نگراں و مہتمم امیر خسرو
جیسی شخصیت ہو

علاء الدین خلجی

اس سلطان کے عہد میں "شاہی کتب خانے" کی مزید ترقی ہوئی ہوگی چ
علم و فن کی ترقی کے اعتبار سے علائی دور نہایت ممتاز تھا اس دو
میں بقول ضیاء الدین برنی پنتالیس[2] علوم و فنون کے عالم بہ حیثیت معلموں کے دار العلو
میں متعین تھے۔ ایسے ممتاز اہل علم کے کتب خانے بھی مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے معمو
ہوں گے اس دور کے کتب خانوں کی کثیر تعداد کا اندازہ اہل علم کی کثرت اور فتوحات کی

لہ ۲ تاریخ تعلیم ص ۵۴، ۵۸۔

وسعت سے ہو سکتا ہے۔ عہد علائی میں مسلمانوں کی حکومت انتہائی وسیع ہو گئی تھی اس سے تقریباً نوے برس پہلے محمد بن بختیار خلجی کی فوجی قیادت میں مسلمان بنگال تک پہنچ گئے تھے اب علاء الدین کی فتوحات کا سلسلہ دکن اور گجرات تک پہنچ گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ دہلی کے علمی مرکز کی روشنی نے ان دونوں علاقوں کو بھی منور کر دیا اس طرح مدرسوں اور کتب خانوں کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا تھا۔

علاؤالدین خلجی (متوفی ۱۳۱۶ء) کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ناخواندہ تھا پھر اس نے تعلیم حاصل کر کے بڑی استعداد پیدا کر لی تھی لیکن علم سے بہرہ مند ہو جانے کے بعد بھی اس کی سخت مزاجی اور سنگدلی میں کمی نہ ہوئی بہرحال اس کی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ امور سلطنت کی انجام دہی میں وہ علماء کو شریک رکھتا تھا اس کے وزیر شمس الملک علاؤالدین اور مشیر خاص قاضی مغیث الدین تھے اور یہ دونوں اس عہد کے زبردست عالم تھے۔

درحقیقت علائی عہد علم وفضل اور فتوحات کے لحاظ سے بہت ممتاز رہا اس دور میں نہایت مفید اور عمدہ اصلاحات بھی ہوئیں۔ مگر وہ اس کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ پھر بھی یہ سن لیجئے کہ جب سلطان نے مملکت میں شراب نوشی کی ممانعت کر دی تو پہلے اپنے جام وسبو توڑ ڈالے اور شراب کا استعمال ترک کر دیا۔ جہاں تک فتوحات کا تعلق ہے ان کا دائرہ نہایت وسیع وعریض تھا جس کی وجہ سے سلطان کو عظمت اور کتب خانوں کو وسعت مل گئی تھی۔

علاؤالدین کی وفات کے بعد سے عہد تغلق تک کا زمانہ درس گاہوں اور کتب خانوں کے لئے نامساعد رہا اس کے جانشین مبارک شاہ اور خسرو خاں کی بداعمالیوں اور بدانتظامیوں کے باعث علمی ادارے خطرے میں پڑ گئے تھے مگر ایک درس گاہ "مدرسہ مقبرہ علاؤالدین" کا ذکر ملتا ہے جسے مبارک شاہ نے تعمیر کرایا تھا اور جو فیروز شاہ کے عہد تک موجود تھا لیکن یہ نامساعد حالات زیادہ عرصہ نہ رہے علاؤالدین کے انتقال کے نو برس بعد محمد تغلق جیسا علم پرور اور درس گاہوں کا علمبردار سلطان دہلی کے تخت پر متمکن ہو گیا۔

لہ عہد علائی کے ابتدائی پندرہ سال کے واقعات امیر خسرو کی "خزائن الفتوح" میں ہیں۔

تغلق خاندان ۱۳۲۰ - ۱۴۱۴ء

عہد تغلق میں شمالی ہند اور دکن کے علمی رشتے زیادہ مستحکم ہو گئے اور درس وتدریس کی بھی خوب رونق ہوئی۔ ظاہر ہے کہ علم کو جتنا فروغ ہوگا اور تعلیم جتنی پھیلے گی اسی قدر کتب خانوں کی ترقی ہو گی تغلق خاندان کے دور میں سلطان محمد تغلق نے تخت نشین ہونے کے دوسرے ہی سال ۱۳۲۶ء میں دولت آباد (دیوگری) کو اپنا پایہ تخت بنایا اور دہلی والوں کو وہاں جانے کا حکم دیا چنانچہ لوگ اپنا ساز وسامان اپنا لسانی اندوختہ اور اپنی کتابی دولت لے کر دولت آباد پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ زیادہ دنوں پایہ تخت نہ رہا لیکن اس دوران میں وہاں علمی وکتابی ذوق کے جو بیج پڑ گئے تھے وہ آگے چل کر برگ و بار لائے اس میں شک نہیں کہ محمد تغلق کے بعض منصوبوں سے عوام کو بڑی تکالیف پہنچیں مگر اس کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں وہ عربی و فارسی کا عالم اور حافظ قرآن تھا۔ ریاضی، نجوم، اور فن خطاطی میں بڑی مہارت رکھتا تھا مورخین نے اس کی دینداری[1] فیاضی اور انصاف پسندی کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے تعلیم کی توسیع کے لئے جو کام کئے وہ سب کے نزدیک مسلّم ہیں اس کے عہد میں مدرسوں کے قیام سے کتب خانوں کی رفتار ترقی بہت بڑھ گئی تھی۔

کتب خانۂ محمد بن تغلق

اس کتب خانہ کے بیش قیمت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ سلطان کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق رکھتا تھا تاریخ گواہ ہے کہ اس کے حضور میں کتابیں پیش کرنے والے بیش قیمت انعامات سے نوازے جاتے تھے۔ ایک شخص نے ابن سینا کی کتاب کا نسخہ پیش کیا تو اس کے صلہ میں سلطان نے دو لاکھ مثقال یا اس سے زیادہ سونا انعام میں دیا ایسی داد و دہش کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ ان شاہانہ فیاضیوں کی روشنی میں پردۂ تصور پر یہ نظر آتا ہے کہ محمد تغلق کے دربار میں کتابیں نذر کرنے والوں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا ہے لوگ عمدہ عمدہ کتابیں پیش کر کے بیش قیمت انعامات حاصل کر رہے ہیں اور کتب خانوں میں طرح طرح کی قیمتی کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔

---

[1] محمد بن تغلق کی دینداری اور مذہبی پالیسی کے متعلق ملاحظہ ہو "سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات" از خلیق احمد نظامی (رسالہ برہان دہلی مارچ ۱۹۴۶ء)

سلطان کے کتب خانہ کے علاوہ بے شمار "درس گاہی کتب خانے"

ایک ہزار مدارس دہلی اور دیگر شہروں میں پھیلے ہوئے تھے کیونکہ اس عہد میں مدارس کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس[1] تھے۔ سلطان کو مدرسے قائم کرنیکا بھی ایسا شدید شوق تھا کہ اس نے نئی دہلی (خرم آباد) بسائی تو وہاں مساجد اور عمارات تعمیر کرانے کے ساتھ ایک مدرسہ کے لئے بھی عمارت بنوائی ان عالی شان عمارات کا قطعہ تاریخ بدر چاچ نے لکھا ہے۔

سلطان علماء و فضلاء اور شعراء کی بھی اتنی قدر و منزلت کرتا تھا کہ اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو خاص طور پر شیراز بھیجا کہ قاضی عضد (مواقف کے مؤلف) کو ہندوستان لائیں اسی زمانہ میں مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا تھا۔ سلطان نے اسے انعام واکرام سے سرفراز کیا اور دہلی کا قاضی مقرر کر دیا۔ اس سلطان کی سرکار سے بدر چاچ[2]، عصامی[3] ضیاء الدین برنی[4] اور مولانا ضیاء الدین نخشبی بدایونی فیضیاب ہوتے تھے اسی عہد کے ایک نہایت نامور

---

[1] قلقشندی کی صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۶۹ (تاریخ تعلیم ص ۶۹)۔ [2] بدر چاچ نے ایک مثنوی "شاہنامہ" لکھی اور سلطان محمد تغلق کی مدح میں قصائد لکھے [3] عصامی نے بارہ ہزار اشعار کی ایک مثنوی "فتوح السلاطین" لکھی جو مدراس سے شائع ہو چکی ہے [4] برنی نے تاریخ فیروز شاہی لکھی جس میں سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس تک کے واقعات ہیں۔

[5] نخشبی کی دو کتابیں تصوف میں "سلک السلوک" اور "کلیات و جزئیات" ہیں۔ ان کی تصنیف "طوطی نامہ" آفاق مشہور ہے جس کے ترجمے ترکی، جرمن اور انگریزی میں بھی ہوئے۔ ۱۷۲۹ء میں اس کا ترجمہ دکنی اردو میں ہوا اور ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے ایک ادیب سید حیدر بخش حیدری دہلوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کرکے "طوطا کہانی" نام رکھا۔ رسالہ صحیفہ لاہور ستمبر ۱۹۵۵ء کے ایک مضمون "طوطا کہانی" میں محمد اسمٰعیل پانی پتی لکھتے ہیں کہ طوطی نامہ نخشبی کے دو قلمی نسخوں کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ ایک برٹش میوزیم لندن میں ہے، جسے ایک پارسی خورشید بن اسفندیار نے کپتان آنجین (AUNGIEN) کے لئے لکھا تھا اور دوسرا نسخہ محمد حسین خاں مالک کتب خانہ افغانی سرکلر روڈ لاہور کے پاس ہے۔

بزرگ مولانا شیخ جمال الدین دہلوی کنبوہ بن حسام الدین ملتانی بقول مولانا ضیا[۱] احمد بدایونی "حضرت امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں فارسی شاعری کے رکنِ رکین مانے جاتے ہیں انھوں نے جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک قصیدہ پڑھنا شروع کیا تو اس کا مطلع سن کر ہی وہ اتنا محظوظ و مسحور ہوا کہ مولانا کے سر تک اشرفیاں[۲] لگوانے کا حکم دیا جب اشرفیاں سر تک پہنچیں تو مولانا[۳] کھڑے ہو گئے سلطان نے قدِ آدم ڈھیر لگوا دیا اور وہ سب اشرفیاں انھیں انعام میں دیدیں۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را
محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطاں را

فیروز شاہی کتب خانہ

فیروز شاہ تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) کے عہد میں کتب خانوں کے قیام کا عمل اور آگے بڑھا۔ خود فیروز شاہ کا کتب خانہ اس عہد کے نفیس کتب خانوں میں سے تھا جس کے قیمتی ذخائر سلطان کے علمی و تصنیفی ذوق کی تکمیل کیا کرتے تھے وہ بڑا قابل اور امن پسند بادشاہ تھا اس کی تصنیف "فتوحاتِ فیروز شاہی" سے اس کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں اور جو ترجمے کی گئیں ان سے فیروز شاہی کتب خانے اور دیگر کتب خانوں میں قابلِ قدر اضافے ہوئے۔

کتب خانہ تاتار خاں

اسے سلطان کے ایک امیر خان اعظم تاتار خاں نے قائم کیا تھا جو تغلقی دور کے کتب خانوں میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اس کے اعلیٰ ذخائر کی افادیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خانِ اعظم نے تفسیر تاتارخانی اور فتاویٰ تاتارخانی اسی کتب خانہ[۴] کی مدد سے مرتب کی تھی۔

(۱-۲) تفصیل کے لئے دیکھئے معارف (۱۹۲۶ء) میں مولانا ضیاء احمد (ریڈر شعبۂ فارسی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی) کا مضمون اور رسالہ عالمگیر کے سالانہ نمبر (۱۹۳۶ء) میں شاہانِ سلف کی ادب نوازی [۳] مولانا شیخ جمال الدین راقم الحروف کے خاندان زبیری کے ایک ممتاز بزرگ تھے اس خاندان کے بزرگوں کا ذکر اس کتاب میں جہاں آیا ہے وہاں مولوی حسین الدین زبیری کی تصنیف "خاندان زبیری کنبوہی" ہمارے پیشِ نظر رہی ہے۔

[۳] آب کوثر ۵۹۴۔ [۴] نزہۃ الخواطر ج ۲۔ ص ۱۹۳ (تاریخ تعلیم، ص ۳۲۲)

تعلیمی سرگرمیاں فیروز شاہی دور میں تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے "درس گاہیں کتب خانے" بھی بڑی کثیر تعداد میں تھے ان میں "کتب خانہ مدرسہ فیروز شاہی" سب سے بڑا تھا دہ ہر اعتبار سے اتنا ہی عالی شان ہوگا جتنا کہ یہ مدرسہ تھا، مورخ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ "مدرسہ شان وشوکت، خوبی عمارت وموقع اور حسن انتظام کے لحاظ سے تمام مدارس ہند میں سب سے بہتر اور عمدہ ہے"[1]

اس زمانہ میں بھی تعلیم کی خوب ترقی ہوئی کیونکہ سلطان نے اشاعت علم کی طرف خاص توجہ دے رکھی تھی اس نے تیس[1] مدارس قائم کئے اور دو مدرسوں (مدرسہ شمس الدین ایلتمتش اور مدرسہ مقبرہ سلطان علاؤالدین خلجی) کی مرمت کرا کے ان کی عمریں بڑھا دیں اول الذکر مدرسہ کی مرمت کرانے میں اس نے اتنی فیاضی سے کام لیا کہ اس کے دروازے صندل کی نہایت قیمتی لکڑی سے بنوائے تھے۔

فیروز شاہ نے اہل علم کی سرپرستی کرنے اور تعلیم کو ترقی دینے میں بھی بڑی فیاضی دکھائی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس مد پر ایک کروڑ چھتیس[2] تنکہ سالانہ صرف کیا کرتا تھا اس نے لڑکیوں اور اپنے غلاموں کی تعلیم کا بھی خاص اہتمام کیا تھا اس کے پاس تقریباً اٹھارہ ہزار غلام تھے ان میں کچھ دستکاری اور تجارتی کام سیکھتے تھے اور کچھ کو تعلیم دی جاتی تھی۔ اور بعض کتابیں نقل کرنے میں بھی مصروف رہتے تھے۔

تراجم سلطان نے علوم وفنون کو ترقی دینے میں جو کام کئے ان میں ایک اہم کام کتابوں کے فارسی تراجم بھی ہیں جب ایک ہندو ریاست نگرکوٹ[3] (کانگڑہ) کی فتح کے موقع پر سلطان کو سنسکرت کی تیرہ[4] سو کتابیں ملیں تو ان میں سے کچھ کا ترجمہ کرایا گیا۔ ان میں کی ایک کتاب کا عزالدین خالد خانی نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "دلائل فیروز شاہی" رکھا گیا۔

---

[1] آئینہ حقیقت نما: از اکبر شاہ خاں جلد دوم ص ۱۷۸، ۱۶۸ [2] ایلیٹ کی ہسٹری آف انڈیا (انگریزی) ج ۳، ص ۳۱۷۔ [3] یہاں ایک کوہ آتش فشاں تھا جسے جوالا مکھی کہتے تھے۔
[4] آب کوثر از محمد اکرام ص ۴۹۷۔

اس موقع پر علامہ محمود شیرانی کے اس بیان کو بھی ملاحظہ کرلیں۔ "فیروز شاہ کے دور میں یہ امر آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ ہندی زبان میں مثنوی بھی لکھی گئی ہے مولانا داؤد نے کتاب "چنداین" جو لورک اور چندا کا عشقیہ افسانہ ہے جونا شہ خاں جہاں خلف وزیر خاں جہاں کے نام پر لکھی ہے"

غرض فیروز شاہی عہد میں متعدد علوم و فنون اور مختلف زبانوں کی نہ صرف کتابیں جمع ہو گئی تھیں بلکہ متعدد بلند پایہ عالم بھی موجود تھے جن میں مولانا خواجگی (قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے مرشد) قاضی عبدالمقتدر، مولانا علیم اور مولانا احمد تھانیسری کے نام بھی ہیں۔ اس دور کے ایک مورخ شمس سراج عفیف ہیں جن کی تصنیف تاریخ فیروز شاہی میں سلطان فیروز شاہ کے جلوس سے وفات تک کے واقعات درج ہیں۔

اس دور میں بڑے بڑے علمی کاموں کے علاوہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اہم کام ہوئے مثلاً اس علم دوست بادشاہ نے دہلی کے قریب ایک شہر فیروزآباد بسایا، چالیس مساجد لحو بہت سی عمارات بنوائیں، سو شفا خانے کھولے، نہریں کھدوائیں، باغات لگوائے۔ رفاہِ عام کے ان کاموں کے نشانات دہلی میں اب بھی موجود ہیں۔ ان میں فیروز شاہ کے کوٹلے کے کھنڈرات اور اشوک کی لاٹ قابلِ دید ہیں۔ یہ لاٹ ستر کوس کے فاصلے سے جس اہتمام و انتظام کیساتھ دہلی لائی گئی تھی اس کا حال پڑھنے کے لائق ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ غیر مسلموں کے تاریخی کارناموں کی بھی قدر و منزلت کیا کرتا تھا۔

ناسازگار دور لیکن فیروز شاہ تغلق کے بعد لودھی عہد کے آغاز تک کا تریسٹھ سال دور کتب خانوں اور درس گاہوں کے لئے انتہائی ناسازگار رہا ایک المیہ یہ ہوا کہ فیروز شاہ کے بعد اس کے جانشینوں کی نااہلی کی وجہ سے تغلق خاندان کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ دوسرا بڑا المیہ تیموری حملہ تھا جو فیروز شاہ کی رحلت کے دس سال بعد ہوا اس تباہ کن حملہ کے دوران ارباب علم و فن کا مرکز دہلی غارتگری کا مرکز بنی رہی جس نے اس شہر کی علمی عظمتوں کو خاک میں ملا دیا لودھی عہد میں اس خاکستر سے ایک نیا جہاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو بڑی حد تک کامیاب رہی

لہ تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ تعلیم ص ۷۷-۸۰۔

لودی خاندان ۱۴۵۱ - ۱۵۲۶

اس خاندان کے آخری بادشاہ ابراہیم لودی کے ایک امیر غازی خاں کا کتب خانہ۔ یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ کتب خانوں کے قیام کا جو سلسلہ دہلی سلطنت کے اولین دور سے شروع ہوا تھا وہ بعض سخت نامساعد حالات کے باوجود اس سلطنت کے آخری دور تک جاری رہا۔ غازی خاں کے کتب خانہ میں فقہ، تصوف، اور دیگر علوم کی اعلیٰ کتابیں جمع تھیں۔ ابراہیم کے پانی پت کی جنگ (۱۵۲۶ء) میں قتل ہو جانے کے بعد یہ کتب خانہ اس جنگ کے فاتح بابر کے قبضہ میں آ گیا تھا۔

کتب خانہ سید ابراہیم

یہ اُس زمانہ کا ایک مشہور کتب خانہ تھا جس کے مالک سید ابراہیم عہد سکندری کے ایک جید عالم تھے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "چنداں کتب و اکثر بخط او از کتب خانہ او بر آمد کہ از حد و حصار خارج"۔ ایسے اور بھی ذاتی کتب خانے پھیلے ہوئے تھے کیونکہ بقول مصنف تاریخ داؤدی (عبداللہ) اور طبقات اکبری (نظام الدین احمد خاں) ہر ایک کے دماغ میں علم کا سودا سمایا ہوا تھا۔

علمی سرگرمیاں

ان کتب خانوں کے ساتھ اس عہد کی علمی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھیے اور اسے نہ بھولیے کہ سلطان فیروز شاہ کے بعد سے سلطان بہلول لودی تک کا ترسیٹھ سالہ دور کتب خانوں اور مدرسوں کے لیے ساز گار نہ تھا لیکن بہلول کے عہد میں علمی اداروں پر سکوت و جمود طاری نہ رہا اور ان کی ترقی کے لئے پُر امید راہیں کھل گئیں کیونکہ بہلول عالم نہ ہونے کے باوجود علمی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لیتا تھا اس کے چونتیس ۳۴ سالہ دور میں دہلی سلطنت کا دائرہ بڑھا تھا اور مدرسے بھی قائم ہوئے تھے۔ بہلول کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودی تخت پر بیٹھا وہ صاحب علم اور عالی دماغ بادشاہ تھا اسے شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ گل رخ اس کا تخلص تھا اس کی علم نوازی کی بدولت اس کا عہد یگانۂ روزگار علماء و فضلاء اور اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا مسکن و مخزن بن گیا تھا۔ ۱۳۹۸ء میں تیموری حملہ سے جو علمی ادارے ویران ہو گئے تھے ان میں بہار سکندری عہد (۱۴۸۸ - ۱۵۱۷ء) میں آئی تھی طبقات اکبری میں ہے۔

"در عہد فرخندہ او علم رواج یافت و امراء زادگان

دولت وسپاہیان بکسب فضل اشتغال نمودند۔"

آگرہ سکندر نے دہلی سے تقریباً اکیسو پچاس میل دور ایک نیا شہر آگرہ آباد کر کے شمالی ہند میں علم و ثقافت کا ایک نیا مرکز قائم کر دیا جس کی علمی رونقیں اتنی بڑھیں کہ وہ دہلی کی ہمسری کرنے لگا۔ سکندر کا پایہ تخت آگرہ تھا مگر دہلی بھی اس کی علمی سرگرمیوں سے محروم نہیں رہی اس کی علمی مرکزیت قائم رہی البتہ آگرہ کے آباد ہونے سے کتب خانوں کی ترقی پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ اکبری عہد میں تو یہ شہر کتب خانوں اور درس گاہوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ مغل عہد میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے عروج کے پیش نظر اگر دہلی کو بغداد کہا جائے تو آگرہ کو ہندوستان کا قرطبہ کہنا چاہیئے۔

سکندر کے عہد میں سرکاری اور غیر سرکاری مدرسے اور کتب خانے آگرہ میں قائم ہوئے یہاں ایک "مدرسہ سید رفیع الدین" تھا۔ علم حدیث کے یہ عالم سکندری دور میں شیراز سے آئے تھے اور آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی وہ اپنی خانقاہ میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے اس کے علاوہ اور بھی مدارس یہاں عہد بہ عہد قائم ہوتے رہے۔[۱] آگرہ کے قریب ہندوؤں کے مقدس اور مرکزی شہر متھرا میں اور نروار (مالوہ) میں بھی سکندر نے مدرسے قائم کرائے تھے۔

اس سلطان کی ایک خوبی یہ تھی کہ علم و فضل کے معاملے میں اس نے بھی تعصب سے کام نہیں لیا اس کے عہد میں ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہوئے، ہندوؤں نے بھی فارسی پڑھنی شروع کی ان میں سے بعض نے فارسی دانی میں بڑا نام پایا۔ ہندوؤں کی جس جماعت نے فارسی کی تعلیم حاصل کرنا اپنا مسلک بنایا تھا وہ کایستھ کے نام سے مشہور ہوئی۔

---

[۱] ایک مشہور عالم زین الدین خوافی نے آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے مسجد اور مدرسہ بنوایا تھا ان کا انتقال ہمایوں کے عہد میں ہوا تھا یہاں مدرسہ خس، مولانا علاؤالدین لاری (متوفی ۹۶۹ھ-۹۱) نے اور "مدرسہ اعظم" اکبر نے قائم کیا تھا جس کے مدرس چلپی بیگ تھے۔ شاہ جہاں کی فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم نے آگرہ میں "مدرسہ عالیہ جامع مسجد" جاری کیا تھا۔

ان علمی سرگرمیوں کی مزید شہادت طب اسکندری بھی دے رہی ہے ۔

"ہر طرف علم و فضل را رونق شدہ و کرم و بذل را رواج افزود و فصحائے روزگار و علمائے کبار در ہر علمے تصنیفات ساختند و در ہر فتح فتحنامہ ساختند"۔

طب اسکندری سلطان سکندر کے وزیر میاں بھوہ ابن خواص خاں کی کتاب معدن الشفا معروف بہ طب اسکندری میں ایک ہزار سے زیادہ امراض اور ان کے علاج کا ذکر ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ " یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں جڑی بوٹیوں اور مفرد دواؤں کے ہندی اور دیگر مقامی نام دیے گئے ہیں "، اس کتاب کی تکمیل کے سلسلہ میں علم طب کی بہت سی کتابیں فراہم کی گئیں۔ خراسان سے کچھ کتابیں آئیں ان سے شاہی کتب خانہ کو بھی فائدہ پہنچا اس میں طب کی بہت سی نایاب کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔

چند خاص کتابیں اس ضمن میں یہ خیال رکھئے کہ طب اسکندری کے علاوہ اس دور میں اور بھی کتابیں لکھی گئیں کچھ کے ترجمے سنسکرت سے فارسی زبان میں ہوئے۔ ہندی زبان کے ایک شاعر مشتاقی (شیخ رزق اللہ دہلوی) نے ہندی میں دو کتابیں " پیم آتن " اور " جوت نرنجن " لکھیں۔ ایک شاعر محمد بن ضیاء نے فارسی لغت تحفۃ السعادۃ " لکھکر سکندر لودھی کے نام معنون کی۔ یہ کتاب " فرہنگ اسکندری " کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس عہد کے مصنفین میں شیخ جمالی کی " سیر العارفین"[1] مثنوی مہر و ماہ اور مثنوی مراۃ المعانی، نہایت گراں قدر کتابیں مانی گئی ہیں۔ اس طرح تصنیف و تالیف کے ذریعہ کتابوں کا بڑا قیمتی سرمایہ جمع ہو گیا جن کی وجہ سے کتب خانوں نے کافی ترقی کر لی تھی

تین خاص درس گاہیں یوں تو سکندری دور کی علمی فضا میں بہت سی درس گاہیں اور ان کے کتب خانے ہوں گے لیکن یہاں تین خاص درس گاہوں کا ذکر کیا جا رہا ہے

---

[1] یہ پاک و ہند کے برگزیدہ مشائخ و صوفیہ کا اولین تذکرہ ہے جس کا اردو ترجمہ مرکزی اردو بورڈ (لاہور) ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا اس کے مترجم او رمرتب پروفیسر محمد ایوب قادری ہیں۔ مقدمہ حسام الدین راشدی نے لکھا ہے جس میں جمالی کی سیرت، تصانیف اور ان کے عہد پر نہایت فاضلانہ انداز سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

شیخ عبداللہ تلنبی[1] اور ان کے بھائی عزیز اللہ تلنبی نے ملتان سے آکر دہلی اور سنبھل (ضلع مراداباد) میں علم کی مسندیں بچھائی تھیں، جو نہایت ممتاز درس گاہیں شمار کی جاتی تھیں اول الذکر کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں سے جو تعلیم پاکر نکلے ان میں بیالیس[2] متبحر علماء ہوئے جن میں میاں لاڈن ان کے بھائی مفتی جمال خاں دہلوی اور میر سید جلال بدایونی بھی شامل تھے۔ دہلی میں شیخ صاحب کی درس گاہ اتنا بلند مرتبہ رکھتی تھی کہ خود سکندر لودھی ان کے درس میں شریک ہو جایا کرتا تھا مگر وہ شاہانہ کروفر کے ساتھ شریک نہ ہوتا تھا بلکہ ایک عام آدمی کی طرح آتا اور حلقہ درس کے قریب مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھکر فیض حاصل کرتا۔
شیخ عبداللہ تلنبی کے شاگرد میاں لاڈن کی درس گاہ بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی یہاں کے طلباء میں ملا عبدالقادر بدایونی کے استاد شیخ عبداللہ بدایونی اور سید علاؤالدین بھی موجود تھے جنہوں نے آگرہ میں "علاول بلاول مجذوب" کے نام سے شہرت پائی ہے۔ شیخ عبدالغفور المعروف بہ میاں لاڈن سکندر لودھی کے مشیر مذہبی تھے جتنے دن سلطان کے پاس رہتے وہ ان ہی کی امامت میں پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کرتا تھا۔
ان درس گاہوں کے مرتبہ کے مطابق ہی ان کے کتب خانے ہوں گے جن میں قاضی عضدالدین شیرازی کی "مطالع اور مواقف" اور ابولیعقوب سکاکی کی "مفتاح العلوم" بھی ہوں گی چونکہ یہ کتابیں اس زمانہ کے نصاب میں شامل تھیں۔

چند ممتاز علماء و فضلاء

میاں لاڈن کے دادا حضرت مخدوم شیخ سماء الدین (متوفی ۱۶-۹ ھ ۱۴۹۵ء) کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ "اپنے دور کے جید عالم اور برگزیدہ شیخ طریقت تھے" عہد لودھی میں ترک وطن کر کے ملتان سے دہلی آئے تھے ان کی ساری عمر رشد و ہدایت اور درس و تدریس میں گذری انھوں نے کئی کتابیں[3]

---

[1] تلنبہ "ملتان کے قریب ایک قصبہ ہے۔ [2] حیات شبلی از علامہ سید سلیمان ندوی ص ۳۱
[3] مفتاح الاسرار۔ حواشی بر لمعات شیخ فخر الدین عراقی۔ تذکرہ حضرت مخدوم شمس العارفین صدر الدین محمد ترک بیابانی خلفت شیخ مخدوم شہاب الدین سہروردی (دیکھئے مولوی حسین احمد زبیری کی کتاب، خاندان زبیری کنبوی)

لکھیں ان سے بہلول لودھی اور سکندر لودھی کو بھی بڑی عقیدت تھی یہ دونوں سلاطین
بس عجز و نیاز کے ساتھ حضرت کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر "مخزن افغانی
خواجہ نعمت اللہ ہروی) میں آیا ہے۔

شیخ موصوف کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ بیابانی عشق الٰہی اور شوق علم
دونوں سے سرشار تھے۔ جذب کے عالم میں مالوہ کے جنگلوں میں پھرتے رہے مگر کتابیں پاس رہیں
بحرہ سہروردہ[1] میں کتابوں کی چوری اور پھر ان کے حصول کی کیفیت درج ہے شیخ سماءالدین کے
سرے صاحبزادے شیخ نصیرالدین عہد سکندر لودھی میں شیخ الاسلام تھے انھوں نے علم کی
دولت اپنے باپ سے پائی تھی ان کے لڑکے شیخ فتح اللہ، شیخ عبدالغفور المعروف بہ میاں لاڈن
مفتی جمال[2] خاں بڑے پایہ کے عالم و فاضل ہوئے۔ ان تینوں نے اپنے باپ کے علاوہ شیخ تلنبی
بھی فیض علم پایا تھا۔ شیخ فتح اللہ تو اپنے استاد کے ایسے محبوب شاگرد تھے کہ
۹۲ھ میں ان کے انتقال کے بعد وہی ان کی مسند علم اور درس پر متمکن ہوئے۔ اس
نشینی نے شیخ تلنبی کے ذخائر کتب کو بھی شیخ فتح اللہ کے کتب خانے میں شامل کر دیا۔
یاں لاڈن (متوفی ۹۴۵ھ) نے بھی درس و تدریس کے سلسلہ میں بہت سی درسی اور
بھی کتابیں جمع کر لی تھیں۔ اس طرح مخدوم شیخ سماءالدین کے خاندان "زبیری کنبوہ"
تقریباً چالیس برس (شیخ سماءالدین تا میاں لاڈن) کے اندر بڑا اچھا کتب خانہ قائم
گیا تھا جس کا کچھ نہ کچھ فیض اٹھارھویں صدی عیسوی تک باقی رہا اس خاندان کے
فرد نواب مبارک علی خاں میرٹھی (متوفی ۱۸۷۶ء) نے اپنے رسالہ "مبارک" میں لکھا
کہ جب غلام قادر خاں کے خلاف مرہٹوں نے میرٹھ پر یلغار کی تو اس وقت خاندان
قدیم کتب خانہ بھی تباہ ہو گیا۔

---

[1] بحرہ سہروردہ کے مصنف میاں احمد خاں (اکبر شاہی) شیخ جمالی کے پوتے تھے ان کی تصنیف
معدن اخبار احمدی بھی ہے۔

[2] سلیم شاہ سوری کے زمانہ سے اکبر کے زمانہ تک مفتی دہلی رہے۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔
شرح عضدی، شرح مفتاح، شرح انوار فقہ وغیرہ۔

شیخ جمالی لودھی عہد کے ایک گوہر آبدار شیخ جمالیؒ (متوفی ۹۴۲ھ - ۱۵۳۵ء)
ہیں جن کو اس عہد کی بلند ترین ادبی شخصیت کہا جاتا ہے۔ انھوں نے
علوم ظاہری و باطنی اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ سماء الدینؒ[۲] سے حاصل کیے تھے وہ عالم، شاعر
اور مصنف ہونیکے علاوہ بہت بڑے سیاح بھی تھے ان اوصاف کی روشنی میں "شیخ جمالی کا
کتب خانہ" دیکھئے۔ اس میں عوارف المعارف کا وہ نسخہ بھی موجود تھا جو اس کے مصنف شیخ
شہاب الدین سہروردی کے مطالعہ میں رہ چکا تھا اور ان ہی کے سجادہ نشین نے یہ متبرک تحفہ
جمالی کو بغداد کے دوران قیام میں دیا تھا۔ عوارف جیسی اور بھی نایاب کتابیں شیخ کو اثنائے سفر
میں ملیں ہوں گی اور ان کے پاس بہت سے نوادر جمع ہو گئے ہوں گے اس سفر میں جمالی کی ملاقات
ملا جامی جیسے اکابرین سے ہوئی اور علمی مباحثے اور پُرلطف صحبتیں رہیں۔ حقیقت میں شیخ
جمالی کی سیر و سیاحت سے علم و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا ان کی سیاحت کی کئی یادگاریں ایسی ہیں
جو علمی دنیا میں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کی جائیں گی۔ ان میں ایک مثنوی "مہر و ماہ"[۳] ہے جو جمالی
نے تبریز کے قیام میں اہل تبریز کی فرمائش پر لکھی تھی اس سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے
مضمون[۴] (خسرو ثانی شیخ جمالی دہلوی) میں بڑی سچی بات کہی ہے کہ "اہل ایران کا کسی ہندوستانی
سے اس طرح فرمائش کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جمالی نے شعر و سخن کی دنیا میں کافی نام
پیدا کر لیا تھا۔" اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی طلب میں سکندر لودھی
نے شیخ جمالی کو ایک منظوم[۵] خط لکھا تھا جو شعری ادب میں خاصہ کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ شیخ

[۱، ۲] آپ کا نام حامد اللہ بن فضل اللہ اور تخلص جمالی تھا اور آپ شیخ سماء الدین کے چچازاد بھائی
اور داماد تھے [۳] اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہے۔

[۴] رسالہ اردو ادب انجمن ترقی اردو ہند جلد ۴ ص ۱۱۱

[۵] سلطان سکندر لودھی کا منظوم خط شیخ جمالی کے نام۔

اے مخفی گنج لایزالی ٭ دے سالک راہ دیں جمالی
در گرد جہاں بسے زدہ سیر ٭ در منزل خود رسیدہ بالخیر
بودی تو مسافر زمانہ ٭ الحمد کہ آمدی بخانہ۔ باقی بر صفحہ

جمالی کی تصانیف[1] میں مثنوی "مراۃ المعانی" "سیر العارفین" اور دیوان فارسی[2] قابل ذکر ہیں اس مثنوی کا ایک نہایت خوبصورت قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری (موجودہ اسٹیٹ لائبریری) حیدرآباد دکن میں ہے جس کے آخری عنوان کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

اے جمالی جملہ دریا نوش باش
چوں صدف پُر دُر شود خاموش باش

لیکن شیخ جمالی کا یہ شعر نعت کا بہترین شعر کہا جاتا ہے اس کی نسبت شیخ عبد الحق محدث نے لکھا ہے کہ بعض اولیار نے خواب میں اس شعر کی قبولیت کے متعلق بارگاہ نبوت سے بشارت پائی ہے۔

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پرتو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

کتب خانہ شیخ گدائی شیخ جمالی کا علمی فیض، ان کے بیٹوں حیاتی اور گدائی نے جاری رکھا ان دونوں کے فضائل علمی کا حال پڑھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے باپ کے کتب خانہ کی رونق قائم رکھی ہوگی بلکہ خود بھی کتابوں کے نہایت قیمتی ذخیرے جمع کئے ہونگے۔ میاں عبد الحی المتخلص حیاتی سلطان سلیم شاہ سوری کے مصاحب و ندیم تھے ان کی سخنوری، ظرافت طبع اور فیاضی کی شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور مصنف "مخزن افغانی" نے تعریف

(بقیہ صفحہ گزشتہ) باید کہ کتاب مہر و ماہم ÷ ارسال کنی چناں کہ خواہم
اے شیخ بما برس بزودی ÷ بسیار مسافرت نمودی
بکشا بسوئے درگہم گام ÷ تا دریابی زگل رخے کام
چشمم بہ جمال تو طپان است ÷ دل مرغ مثال درفغان است
من اسکندر و تو خضر مائی ÷ باشد کہ بسوئے ما بیائی

[1] ملاحظہ ہو "تصانیف شیخ جمالی" (مقالات شروانی ص ۲۱۲)
[2] دیوان کے قلمی نسخے حبیب گنج اور رام پور کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

کی ہے۔ عبد الصمد المتخلص بہ گدائی عہد اکبری میں پہلے شیخ الاسلام تھے ان کے کتب خانہ کی کتاب امیر خسرو کا ایک دیوان پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہے جس پر گدائی کی مہر بدیں الفاظ ثبت ہے۔

المفتقر الی الملک المتعالی
الحقیر گدائی بن جمالی

شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے

کتب خانوں کی تحریک کے جو پودے دہلی سلطنت میں لگائے گئے تھے۔ وہ مغلیہ عہد میں نشو و نما پا کرتناور درخت بن گئے۔ حقیقت میں مغل بادشاہوں کے ہندوستان پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ ان کے علمی ذوق اور جمالیاتی شعور ان کی ذہانت و ذکاوت، نفاست پسندی اور فیاضی نے ہندوستانی زندگی کے ہر گوشہ میں چار چاند لگا دیے تھے۔ علوم و فنون کے سارے شعبوں، ادب، خطاطی، مصوری، موسیقی، تعمیرات، صنعت و حرفت وغیرہ کی ان کے عہد میں ایسی تزئین اور پرورش ہوئی جس کی نظیر ہندوستان نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس عہد میں کتب خانوں کو بھی بڑا عروج حاصل ہوا اور کتابیں جمع کرنیکا ذوق بامِ کمال پر پہنچا۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ ہر علمی اور تعلیمی تحریک کو پھولنے پھلنے کے لئے پرسکون فضا درکار ہوتی ہے۔ مغل بادشاہوں کے حسن سیاست و تدبر اور ان کی رواداری سے ہندوستان کو ایسا قرار و امن ملا جو علم و ہنر کی ترقیوں کے لئے بڑا سازگار ہوا اور ملک بھر میں تعلیمی چرچے ایسے عام ہوئے کہ سماج اور علم کے رشتے گہرے اور مضبوط ہو گئے۔ ذوق کتب بینی ہر طرف پھیل گیا اور بے شمار کتب خانے منظر عام پر آ گئے جن کی رونق و ترقی کا خاص زمانہ اکبر سے لے کر عالمگیر تک ہے۔ ان بادشاہوں کا ذوق کتب بینی، ان کے عہد میں ارباب علم و اہل قلم کی کثرت اور مدرسوں کی بہتات کتب خانوں کے ترقی کرنے کا سبب بنی۔ بادشاہ کتابوں کے معاملے میں عہد جدید سے اتنے قریب تھے کہ اکبر نے معجم البلدان و مہابھارت وغیرہ کے ترجمے کرانے اور عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی تالیف کا کام ممتاز مولفین کی ایک جماعت کے سپرد کیا تھا غرض ہندوستان میں اجتماعی تالیف کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا مغلوں کے سر ہے۔

کیا خدا کی قدرت ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کا جانشین تیمور جس نے وسط ایشیا او
ہندوستان کے علاقوں میں انسانی خون کے دریا بہا دئے تھے اور جس نے بے شما
خلق خدا کی متاع عافیت کو لوٹ لیا تھا اسی کی پانچویں پشت میں انسانیت کا محاف
اور علم و ادب کا مربی بابر اٹھا جس کی اولاد میں علم سے وابستگی اور کتابوں سے شیفتگ
برابر منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ مغلوں کے دور زوال میں بھی شعر و شاعری اور کتاب
ذوق کے چرچے جاری رہے۔ انسان نہیں رہتا صرف اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ تیمور
سلاطین باقی نہیں رہے اور ان کی داستان ایک قصہ پارینہ بن کر رہ گئی لیکن علم
ثقافت اور کتب خانوں کی تاریخ میں ان کے نام زریں حروف میں ہمیشہ ثبت رہیں گ
اور کتابوں کی شکل میں انھوں نے جو خزانہ چھوڑا ہے وہ لازوال رہے گا۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔"

پہلا مغل کتب خانہ

اس کتب خانہ کی بنیاد مغلیہ سلطنت کے بانی محمد ظہیر الدین باب
نے ڈالی جو ایک زبردست فاتح اور عالم ہونے کے علاوہ کتابی
جمع کرنے کا بھی بڑا شائق تھا۔ وہ جب ہندوستان آیا تو اپنے اسلاف کے کتب خانوں
بہترین نوادر کو منتخب کر کے ساتھ لایا۔ بابر اپنے آبائی ملک کو چھوڑ سکتا تھا لیکن علو
فنون کے یہ ذخائر اسے چھوڑنے گوارا نہ ہوئے۔ ان ذخائر میں بیشتر مصوری اور نقاش
کے نوادر تھے جن کا بقول مارٹن ہندی آرٹ نے بہت گہرا اثر قبول کیا ان ہی قیمتی ذخا
سے شاہان مغلیہ کے پہلے کتب خانہ کی بنیاد رکھی گئی جس میں عہد بہ عہد اضافے ہوتے

تزک بابری کے اندراجات ظاہر کرتے ہیں کہ بابر کی کتابوں سے دلچسپی اتنی بڑھ
ہوئی تھی کہ وہ سفر اور حضر دونوں میں کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا اس کی عادت یہ
کہ مہمات کے دوران میں جب کوئی کتب خانہ ملتا تو وہ اس کی کچھ کتابیں اپنے بیٹوں
کے پاس بھی بھیج دیا کرتا تھا۔ چنانچہ فتح پنجاب کے وقت جب امیر غازی خاں کا کتب
اسے ملا تو اس کی کچھ کتابیں منتخب کر کے ہمایوں اور کامران کے پاس بھیج دیں۔ اس
بابر کا کتب خانہ دو قسم کی کتابوں پر مشتمل تھا ایک تو وہ جو بابر اپنے وطن سے لایا تھ

دوسری وہ جو اسے فتوحات میں دستیاب ہوئی تھیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کتب خانہ میں قرآن پاک، گلستانِ سعدی، شاہنامۂ فردوسی، خمسہ نظامی، مثنوی خسرو اور ظفرنامہ یزدی کے نسخے موجود تھے کیونکہ یہ ہی بابر کی پسندیدہ کتابیں تھیں۔

بابر اپنے کتب خانہ میں مغل خاندان کے اس پہلے بادشاہ کا ذوقِ کتب بینی تو دیکھئے طبیعت ناساز ہے مگر اپنے کتب خانہ میں کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ خود بابر کہتا ہے۔

"جمعہ کے دن تئیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی۔ ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا بہت دیر تک بے چینی رہی، دوسرے دن ہفتہ کو بخار ہوا کچھ جاڑا بھی چڑھا، سہ شنبہ ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبید کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مقبول ہو۔"

علمی و تصنیفی ذوق چنانچہ بابر نے ان مشہور صوفی کے اس رسالہ کا ترکی زبان میں ترجمہ کر دیا اور اس کمال کے ساتھ کیا کہ مصنف کا کوئی خیال ایسا نہ تھا جو پوری وضاحت اور نفاست کے ساتھ اس میں نہ آگیا ہو۔ بابر نے اور بھی کئی کتابیں لکھیں اس کو یہ علمی و تصنیفی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ علم دوست باپ شیخ مرزا نے اس کی تعلیم کے لئے شیخ فرید بیگ، بابا قلی علی اور مولانا قاضی عبداللہ جیسے متبحر علماء کو منتخب کیا جن کی صحبت نے بابر کی وہ فطری صلاحیتیں جو علم و ادب کی طرف راغب تھیں یک دم اُجاگر کر دیں بابر ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا بارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور جب تک زندہ رہا بے رحم رشتہ داروں اور ناسازگار حالات کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا لیکن پھر بھی علم و ادب کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں جب بھی فرصت ملی تو بیاض نکالی اور شعر پڑھنے بیٹھ گیا طبیعت کو موزوں پایا تو اس بیاض میں اور اضافہ کر دیا بابر کی مادری زبان تو ترکی تھی مگر وہ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی قادر تھا اور فارسی

ترکی میں بھی کہتا تھا اس کے دیوان کا ایک نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

تزکِ بابری بابر بہترین نثر نگار تھا اس نے علم عروض پر ایک رسالہ لکھا اور تزک بابری ترکی زبان میں لکھی جس میں اس کے بچپن سے لے کر آخری ایام تک کے حالات ہیں بابر کو کتابیں مزین کرانے کا بھی شوق تھا چنانچہ اس نے اپنی تزک کو خوب صورت تصاویر سے مزین کرا دیا تھا اس نے خط بابری بھی ایجاد کیا تھا اور اس خط میں قرآن کے کئی نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجے تھے۔

اسے یاد رکھیئے کہ یہ اس شخص کا علمی و تصنیفی ذوق تھا جس کو زندگی میں بہت کم دن ایسے ملے تھے کہ جب کسی دشمن کا مقابلہ کرنا یا اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنیکی کوشش کرنی نہ پڑی ہو۔

کھڑی بولی بابر ۱۵۲۶ء میں ایک فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا اس کے بعد وہ صرف چار برس زندہ رہا لیکن اس دوران میں اسے ہندوستان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اس نے یہاں کی زبان سیکھی اور اپنی تزک میں جا بجا ہندی کے الفاظ استعمال کر کے اردو زبان کے ارتقاء پر اپنا نقش ثبت کر دیا۔ بابر کا یہ شعر ملاحظہ کیجیئے اس میں ترکی الفاظ کے پہلو بہ پہلو کھڑی بولی[1] کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اس وقت اردو زبان کی ساخت میں بنیادی اہمیت حاصل کر رہی تھی بابر اپنے اس شعر میں کہتا ہے "مجھ کو منکا، موتی، لعل و گہر کی کوئی ہوس نہیں ہے۔ فقیر کے لئے ایک ٹکڑا روٹی اور تھوڑا سا پانی کافی ہے"۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی ؛ فقرا حلیفہ بس بولغوسیتو پانی و روتی۔

ہمایوں ہمایوں کو تخت نشین ہونے کے بعد بہت سے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا خصوصاً اس کے بھائیوں کی مسلسل بے وفائیوں اور بہادر شاہ (والئ گجرات) اور شیر شاہ سوری کی پیہم نبرد آزمائیوں نے اس کی زندگی وبال کر دی تھی۔ پھر بھی وہ

---

[1] کھڑی بولی نواح دہلی کی زبانوں میں سے تھی۔ ڈاکٹر مسعود حسن خان نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں لکھا ہے کہ نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصلی منبع اور سرچشمہ ہیں۔
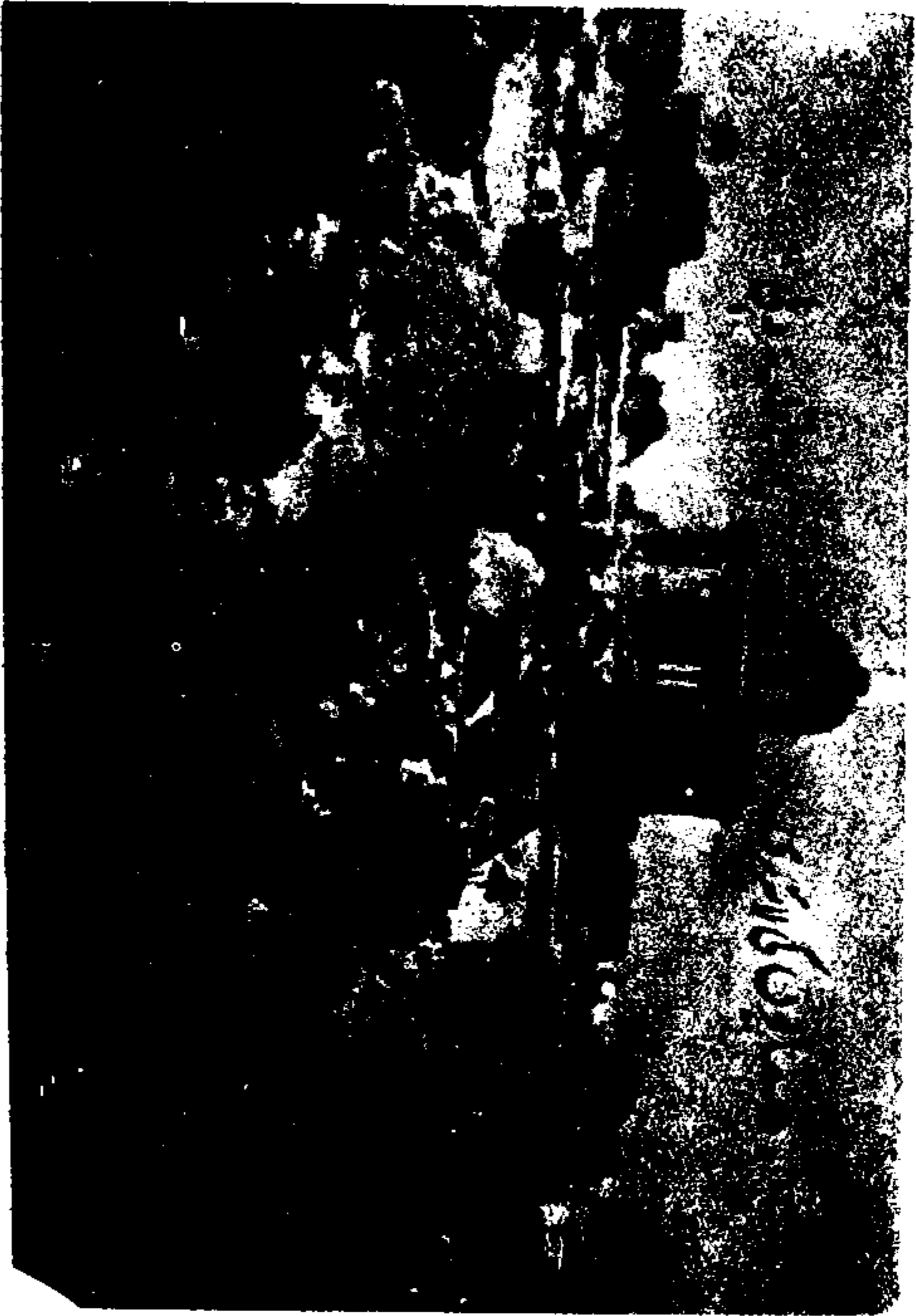
کتب خانوں کے سلسلے میں بڑا کام کرگیا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے اپنے سارے دشمنوں کو زیر کرکے دوبارہ ہندوستان کی عنانِ حکومت سنبھالی اور ۱۵۵۶ء میں اس کا انتقال ہوگیا

کتب خانہ ہمایوں

لیکن ایک سال کے مختصر عرصہ میں اس نے نہایت عمدہ کتب خانہ قائم کرلیا تھا اور اس کے لئے ریاضی و نجوم و ہیئت کی بہترین کتابیں فراہم کی تھیں ہمایوں کو علم ہیئت سے جو اُنس تھا اس کی مناسبت سے اس نے اپنے کتب خانہ کے لئے ایک بلند مقام یعنی شیر منڈل کی تیسری منزل منتخب کی تھی یہ سہ منزلہ عمارت دہلی کے پرانے قلعہ میں شیر شاہ سوری نے اپنے لئے بنوائی تھی۔ ہمایوں کے کتب خانہ کا مہتمم لال بیگ کا باپ نظام الملقب بہ باز بہادر تھا۔

حقیقت میں کتابیں جمع کرنے کے شوق کو فروغ دینے میں وہی صحیح رہبری کرسکتا ہے جو خود علم کا دلدادہ اور کتابوں کا شائق ہو۔ ہمایوں میں یہ دونوں باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان اوصاف جلیلہ کے علاوہ اس میں ہمت و استقلال کی خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں اس کی شہزادگی اور بادشاہت کا تقریباً سارا زمانہ مصائب و آلام میں گذرا مگر ہمایوں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور نہ وہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس ہوا اس کے علمی ذوق کا یہ حال تھا کہ جنگ و جدل کی مصروفیتوں اور الجھنوں سے جو وقت بھی ملتا وہ علمی مباحث اور مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ شاعری ہو یا ریاضیات و نجوم ہو اس کا ذہنِ رسا سب پر یکساں حاوی تھا۔ شاعری کے تمام اصناف پر اُسے قدرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں واقعات کی تصریح، خیالات کی سادگی و برجستگی اور مضمون آفرینی موجود ہے۔ ہمایوں صاحب دیوان بھی تھا۔ ابوالفضل کے قول کے مطابق اس کا دیوان اکبر کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اور اب اس کے دیوان کا ایک واحد قلمی نسخہ[1] کھجوا ضلع سارن (بہار) کے کتب خانہ میں ہے جس کی دریافت کا سہرا پروفیسر سید حسن عسکری (شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی) کے سر ہے۔

---

[1] اس نسخہ پر ایک مفصل مضمون پروفیسر حافظ شمس الدین احمد استاد شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۶ء میں رسالہ معیار پٹنہ میں لکھا تھا دیوان ہمایوں ڈاکٹر ہادی حسن (سابق پروفیسر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی تصحیح و تہذیب کے بعد حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

ہمایوں کے محبوب مشغلے

ہمایوں کے محبوب مشغلے دو تھے۔ مطالعہ کتب اور علم ہیئت وہ میدان جنگ میں ہو یا قسمت کے ہاتھوں پریشان پھر رہا ہو۔ ہر حال میں کتابیں اس کے ساتھ رہتی تھیں چنانچہ کھمبات کے محاصرے کے دوران ہمایوں کے پاس منجملہ اور کتابوں کے "تاریخ تیموریہ" کا وہ نایاب نسخہ بھی تھا جسے بہزاد نے مصور کیا تھا اور جب وہ شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا کر ہندوستان سے جا رہا تھا تو اس بے سروسامانی کے عالم اور یاس انگیز حالت میں اس کے کتب خانہ کا مہتمم مع کتابوں کے ساتھ تھا۔ اور اس کے استاد الیاس اردبیلی بھی موجود تھے جن سے وہ ہیئت و نجوم کا درس لے رہا تھا۔

ہمایوں کے اس علمی شغف نے اس عہد کے نامساعد حالات میں بھی کتب خانوں کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اسباب پیدا کر دئے تھے وہ شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد ایران چلا گیا تھا۔ جب پندرہ برس کے بعد وہاں سے ہندوستان واپس آیا تو میر علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیرازی اور بہت سے ایرانی علماء اور شعراء کو اپنے ساتھ لایا جنھوں نے ہندوستان کو کتابی دولت سے مالا مال کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ خود ہمایوں اپنی پریشان حالی میں بھی کتابوں کی طرف سے غافل نہیں رہا اسی کی فرمائش پر غیاث الدین محمد المعروف بہ خواندمیر[1] نے "قانون ہمایونی" لکھی۔ یوسف بن محمد ہروی نے "ریاض الادویہ" تصنیف کی اور مولانا محمد بن علی بن محمد المسکن القاضی السمرقندی نے مختلف علوم وفنون کی قاموس "جواہر العلوم ہمایونی" لکھی لیکن ہمایونی عہد کے متعلق تین کتابیں قابل ذکر ہیں۔ "ہمایوں نامہ" جسے ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے لکھا۔ "تذکرۃ الواقعات" جو ہمایوں کے انتقال کے بتیس برس بعد اس کے آفتابچی جوہر نے مرتب کیا اور "تاریخ ہمایوں" جو بایزید نے اکبر کی فرمائش پر لکھی تھی۔[2]

ہمایوں نے "علم ہیئت" اور "کتابوں" کا ایسا عاشق زار تھا کہ ان دونوں پر اس نے اپنی جان ہی نثار کر دی۔ ایک شام کو وہ اپنے کتب خانہ کی چھت پر ستارۂ زہرہ کا مشاہدہ

---

[1] خواندمیر بابر کے زمانہ میں ہرات سے آیا تھا اس کی تصنیف "خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخیار" کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

[2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "بزم تیموریہ" مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ص ۴۵ - ۴۶۔

کرتے گیا۔ مغرب کی اذان سن کر نیچے اُتر رہا تھا کہ سیڑھیوں پر سے پھسل کر گر گیا۔ اور
اسی صدمہ سے وفات پائی۔ قاسم کاہی نے یہ تاریخ کہی ؎

پۓ تاریخ او کاہی رقم زد ٭ ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد

مدرسہ مقبرہ ہمایوں ہمایوں عمر بھر علم کا شیدائی رہا مگر اس کو اطمینان کے ساتھ مدرسے قائم کرنے کا وقت نہ مل سکا پھر بھی اس کے عہد میں دہلی اور آگرہ میں مدارس قائم ہوئے۔ اس کا مقبرہ بھی ایک مدت تک علم کی نشر و اشاعت کا مرکز بنا رہا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ دہلی میں مقبرۂ ہمایوں کی چھت پر ایک زبردست مدرسہ تھا جس میں بڑے بڑے فاضل اساتذہ درس دیتے تھے۔ وہاں طلباء کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ مدرسے کے قریب چھوٹے چھوٹے کمرے طلباء کے رہنے کے لئے بنے ہوئے تھے اس بیان کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی بے محل نہ ہو گا کہ اس زبردست مدرسہ کا کتب خانہ بھی نہایت زبردست تھا۔

اکبر۔ اکبر کا عہد ہندوستانی کتب خانوں کی تاریخ میں نشانِ میل کی حیثیت ۱۵۵۶-۱۶۰۵ء رکھتا ہے۔ اس دور میں ان کے استحکام اور ان کی ترقی کے لئے بہترین اسباب فراہم ہوئے۔ اس علم دوست بادشاہ نے کتابی ذوق کو ہمہ گیر بنانے اور اسے فروغ دینے میں ایسا انہماک دکھایا کہ اس زمانہ کے کتب خانے علم پرور ادارے اور علمی تربیت گاہ بن گئے تھے۔ خود اکبر کا کتب خانہ اتنا قیمتی تھا کہ بقول مورخ اسمتھ (SMITH) اس سے پہلے اتنے قیمتی کتب خانہ کا وجود نہیں ملتا۔ اکبری دربار کے ایک رتن عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانہ کو علامہ شبلی نے ایک اکاڈیمی یا دارالحکمۃ بتایا ہے۔

اکبری عہد میں کتب خانوں کی ترقی کا سب سے بڑا سبب اکبر کا کتابوں سے ذاتی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کا بڑا دلدادہ تھا اور ان دونوں کے اشعار نہایت روانی کے ساتھ پڑھتا تھا اس کی علم نوازی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی مملکت کے تمام صوبوں کے لئے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ "جہاں تک ممکن ہو دنیا میں علم و ہنر کی اشاعت ہوتی رہے تا کہ اہل کمال دنیا سے معدوم نہ ہو جائیں اور ان کی یادگار

صفحہ ہستی پر باقی رہے" اس علم پروری کا شہرہ سُنکر ہندوستان اور بیرون ہند کے بہت
داغ دربار شاہی میں جمع ہوگئے تھے جو دن رات معدنِ علم (کتب خانوں) سے لعل وجو اہر
نکال لیتے اور شاہ کے حضور میں نذر کرتے تھے۔

اکبر کے اس کتابی ذوق کو دیکھ کر یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جاہل محض تھا بلکہ
وہ پڑھا لکھا انسان تھا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی[۱] میں "ظفر نامہ" کا ایک قدیم قلمی نسخہ
ہے جس کے سرورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ "فروردین" موجود ہے اس کے
نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرشِ آشیانی کا لکھا ہوا ہے اور پھر
اس کے نیچے شاہ جہاں کی تحریر ہے۔

اکبری کتب خانہ

اکبر کے ذوق مطالعہ اور اس کے کتب خانہ کے متعلق ابوالفضل
نے لکھا ہے[۲]۔

جہاں پناہ نے اپنے تبحر علمی سے کتب خانے کو چند حصوں میں تقسیم فرمایا
ہے۔ ایک شاخ قصر شاہی کے اندر ہے اور ایک باہر۔ ادران ہر دو شاخوں
کو مختلف شعبوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ہمیشہ تمام علوم وفنون کی کتب و
رسائل قیمت وفنون کی اہمیت کے اعتبار سے مختلف مدارج میں شمار
کئے جاتے ہیں، اور ہندی وفارسی ویونانی وکشمیری وعربی زبانوں کی
کتابیں نظم ونثر کے اختلاف کے لحاظ سے ترتیب وار پیشگاہ حضور میں
لائی جاتی ہیں۔ علماء وفاضلانِ آگاہ دل کتابوں کی نوعیت کے متعلق
جہاں پناہ سے عرض کرتے ہیں اور بادشاہ علم پرور ہر کتاب کو اول سے
آخر تک سنتے ہیں ہر روز جس صفحے یا سطر تک کتاب پڑھی جاتی ہے
حضرت خود اپنے قلم سے اس مقام پر ہندسہ شمار تحریر فرما دیتے ہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو "کیا اکبر محض امی تھا" از زبید احمد (رسالہ جامعہ ۱۹۲۹ء ص ۲ - ۱۱)
[۲] آئین اکبری جلد اول از علامہ ابوالفضل ص ۱۹۰ - ۱۹۱ (دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار
عالی حیدرآباد دکن) اردو ترجمہ۔

اور پڑھنے والے کو عدد اوراق کے مطابق زر سرخ و سفید بطور
انعام عطا ہوتا ہے۔"

"شاید ہی کوئی مشہور کتاب باقی رہ گئی ہو جو محفل شاہی میں پڑھی
نہ گئی ہو اور کوئی داستان قدیم و کلمات حکمت و عجائبات علوم ایسے
نہ ہوں گے جو اس پیشوائے عقلا کو یاد نہ ہوں۔ قبلۂ عالم کسی کتاب کو
مکرر سننے سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ بے حد شوق کے ساتھ کتابوں
کو بہ کرات سماعت فرماتے ہیں۔ اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت،
قابوس نامہ، مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقہ، مثنوی معنوی
جام و جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ شیخ نظامی، کلیات خسرو و مولانا
جامی، دیوان خاقانی و الوری و دیگر کتب تاریخ ہمیشہ محفل مبارک
میں پڑھی جاتی ہیں۔"

بزم تیموریہ کے مصنف کا بیان ہے کہ "قلعہ آگرہ میں ثمن برج کے بغل میں
[ایک] لمبا کمرہ ہے اس میں شاہی کتب خانہ تھا" اس میں کتابوں کی کل تعداد ۲۴ ہزار تھی
[ا]ن کی قیمت کا اندازہ ۶۵ لاکھ کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی باقاعدہ درجہ بندی کی گئی تھی۔
[پہ]لے حصہ میں شاعری، طب، نجوم اور موسیقی۔ دوسرے میں تصوف، فلسفہ، علم اللسان
[او]ر ہندسہ۔ تیسرے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اکبری کتب خانہ کے
[مشہ]ور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں علماء ماضی اور علماء عصر کی خود نوشت کتابیں
[کث]یر تعداد میں جمع تھیں۔

ان نایاب و نادر کتابوں کی نگرانی اور ترتیب و تنظیم کے لئے بہت بڑا عملہ مقرر
[تھ]ا جس میں نہایت لائق و فائق اصحاب شامل تھے مثلاً علامہ فیضی مہتمم کتب خانہ رہا
[تھ]ا۔ کتاب دار کی خدمت عنایت اللہ شیرازی کے سپرد تھی جس کو بہترین خوش نویس
[ہو]نے کی بنا پر مکتوب خاں کا خطاب ملا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی بھی کتب خانہ کے
[نگر]اں رہے تھے وہ منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ شہزادی سلیمہ سلطان بیگم کو کتاب

خرد افزا" کی ضرورت ہوئی۔ شاہی کتب خانہ میں اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ملا صاحب
اس وقت بدایوں میں تھے۔ شہزادی نے ان کو بلوایا اور وہ جب نہ آئے تو جائداد
ضبط کرنے کی دھمکی دی۔

اکبری کتب خانہ میں آئے دن نایاب و نادر کتابوں کے اضافے بھی ہوتے رہتے
اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ شاہی کتب خانہ میں ضرور بھیجتے۔ درباری مصنفین
کی تصانیف اور تراجم کے متعدد نسخے کتب خانے میں رکھے جاتے۔ فتوحات کے موقع پر جو
کتابیں ملتیں وہ کتب خانہ میں داخل کی جاتیں۔ ہندوستان سے جو قافلے حج کے لئے جاتے
ان کے سپرد بھی کتابوں کی فراہمی کا کام تھا۔ اکبر کے پاس تحفہ میں عرب سے بھی کتابیں آ
کرتی تھیں۔ ۱۵۷۲ء میں فتح گجرات کے موقع پر اکبر کو جو کتابیں ملیں انھیں شاہی کتب خانہ
میں داخل کیا گیا۔ ۱۵۹۵ء میں جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کی ۴۳۰۰ منتخب قلمی کتابیں
بھی شاہی کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں۔

کاتب اور مصوّر

ان اضافوں کے علاوہ اکبری کتب خانہ کی ترقی اور رونق کا
سبب وہ محکمہ بھی تھا جو کتابوں کے ترجمہ کرانے، انھیں
خوش خط لکھوانے اور ان کو نقوش و تصاویر سے مزین کرانے کے لئے قائم ہوا تھا۔ اس
محکمہ سے بادشاہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بقول ابوالفضل داروغہ محکمہ ہر ہفتہ ہر شخص کا
کام ملاحظہ عالی میں پیش کرتا اور ہر مصور اپنے کام کے مطابق انعام و اضافہ سے سرفراز
فرمایا جاتا۔ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ قبلۂ عالم خود جائے تصویر پر نشان بنا دیتے تھے اور
ہنرمند استاد اس مقام پر سحر کاری کرتے تھے۔ اس قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہوا
کہ عہد اکبری میں فن مصوری بام عروج پر پہنچا اور اس محکمہ میں یگانۂ روزگار فنکار جمع
ہو گئے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں ملازمت کے لئے مذہب و ملت کی کوئی قید نہ
تھی۔ قوم کہار کا لڑکا دسونت بھی یہاں ملازم تھا جو خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کی تعلیم
کی بدولت باکمال مصور بن گیا تھا۔ خواجہ عبدالصمد کو خطاطی اور مصوری میں یہ کمال حاصل

لہ سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اکبر کو بہت پسند تھی۔

تاکہ وہ خشخاش کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھ دیتا تھا اس نے کہانیوں کی کتاب "داراب نامہ" الفاظ کے بجائے تصاویر میں مرتب کر کے اکبر کے حضور میں پیش کی تھی۔ اس دور کے ایک تذکرہ نویس میر دوری کی نسبت لکھا ہے کہ خط نستعلیق لکھنے میں اس کا ہندوستان میں کوئی مقابل نہ تھا۔ اکبر نے اسے کاتب الملک کا خطاب عطا کیا تھا ایسے باکمال استادوں نے چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اکبر نامہ، رامائن، نل دمن اور کلیلہ دمنہ وغیرہ تصاویر اور نقش ونگار سے آراستہ کیں۔ "داستان امیر حمزہ" میں ایک ہزار چار سو تصویریں بنائیں۔ "تاریخ خاندان تیموریہ"[1] کو ساٹھ مصوروں نے ایک سو بارہ تصاویر سے آراستہ کیا۔ مہابھارت کا فارسی ترجمہ "رزم نامہ"[2] کے نام سے ہوا جس میں تمام معرکوں کی تصویریں بنوائی گئیں اس کی تکمیل میں پانچ برس لگے اور اس پر دس ہزار روپے صرف ہوئے۔ اسی طرح سنسکرت کی اور کتابوں کے بھی فارسی میں ترجمے ہوئے اور فارسی کی بہت سی کتابیں سنسکرت میں منتقل ہوئیں۔ یہ سب کتابیں عمدہ نستعلیق میں لکھی گئیں اور انھیں تصاویر و نقوش سے آراستہ کرا کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ اکبری کتب خانے میں پندرہ ہزار ایسے قلمی نسخے تھے جنھیں اکبر نے دوبارہ خوشخط لکھوایا تھا

علماء اور شعراء کتابوں کے معاملے میں اکبر کا ایسا انہماک کتب خانوں کی ترقی کا جتنا ضامن بنا ہوگا اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے، صرف درباری علماء کے کتب خانوں کی تعداد سینکڑوں تک شمار کی جا سکتی ہے۔ خواجہ نظام الدین احمد مصنف "طبقات اکبری" نے عہد اکبری کے علماء اور شعراء کی تعداد ۱۸۱ بتائی ہے[3] اور ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تصنیف "منتخب التواریخ" کی تیسری جلد میں ۲۲۵ علماء اور شعراء کا تذکرہ کیا ہے

[1] یہ نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں ہے (ایک مشرقی کتب خانہ۔ ص ۶۴)

[2] رزم نامہ کا یہ نسخہ جے پور میں ہے۔

[3] عہد اکبری سے شاہ عالم کے عہد تک کے امراء کا حال منشی کیول رام اگروال نے "تذکرۃ الامراء" میں لکھا ہے۔ "مآثر الامراء" (نواب شاہ نواز خاں صمصام الدولہ) میں اکبر سے لے کر محمد شاہ کے آخر عہد تک کے مشہور امراء کا تذکرہ ہے۔ سلطنت مغلیہ کے ہندو امراء کے حالات "امرائے ہنود" (سعید احمد مارہروی) میں درج ہیں مآثر الامراء کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے کیا ہے

ایسے ہی ارباب علم وفن ہر مغل بادشاہ کے عہد میں موجود تھے جو کتب خانوں اور درس گا
کے پھلنے پھولنے کا سبب بنے ہوتے تھے جہاں تک عہد اکبری کا تعلق ہے اس زمانہ میں
ابو الفتح گیلانی شیخ عبد النبی، میر فتح اللہ شیرازی، نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید، قاضی نور ا
شستری، خواجہ نظام الدین احمد، عبد الرحیم خانخاناں اور ملا عبد القادر بدایونی کے فضل
کمال اور تصنیفی وتعلیمی خدمات کا شہرہ ہندوستان بھر میں گونج رہا تھا۔ ملک الشعراء
فیضی کی انشاپردازی اور شاعری کے کمال کا ہر شخص معترف تھا۔ اس نے ایک سو ایک
کتابیں لکھیں۔ قرآن شریف کی ایک تفسیر سواطع الالہام (بے نقط) اور موارد الکلم
(اخلاق) اس کی یادگار ہیں۔ فیضی کے بھائی ابو الفضل کی علمی قابلیت کی تصدیق اس کی
تصانیف "آئین اکبری" اور "اکبر نامہ" کر رہی ہیں۔ ان کے والد شیخ مبارک ناگوری بھی بڑے
اہل قلم تھے انھوں نے قرآن شریف کی تفسیر چار جلدوں میں لکھی اور پانچسو ضخیم کتا
نقل کیں۔ اس زمانہ میں مذہب، اخلاق، فلسفہ، تاریخ، سوانح، نجوم، طب، جغرافیہ ا
افسانہ وغیرہ سب ہی پر کتابیں لکھی گئیں اور متعدد کتابیں اجتماعی طور پر بھی تالیف ہو
"تاریخ الفی" (مسلمانوں کی تاریخ) کئی اہل قلم نے مل کر لکھی۔ اسی زمانہ میں ہندی کے و
نامور شاعر سورداس اور تلسی داس بھی تھے جن کے کلام میں کہیں کہیں فارسی اور عر
کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ اکبری دور کا ایک ہندو شاعر مرزا منوہر توسنی ہے جسے س
عبد اللہ[1] نے ہندو قوم کا سب سے پہلا فارسی شاعر بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس
کے خیالات اسلامی تخیل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

درس گاہی کتب خانے اکبر اور اس کے جانشینوں کا عہد درس گاہی کتب خانوں کے لئے بڑ
سازگار تھا مغل سلطنت کا کوئی شہر اور قریہ مدرسوں اور کت
خانوں سے خالی نہ تھا۔ خود اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو بے نظ
کہا جاتا ہے تاریخ تعلیم نے "خلاصۃ التواریخ[2]" (سجان رائے) کے حوالے سے لکھا ہے کہ فتح

[1] "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" مرتبہ ڈاکٹر سید عبد اللہ ص ۳۸
[2] اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

[ا]بری کے مشہور مدرسہ کے علاوہ اس شہر میں اور بہت سے مدرسے تھے جو حسب الحکم [ب]نوائے گئے تھے۔ دہلی میں اکبر کی رضاعی ماں ماہم بیگم کا "مدرسہ خیر المنازل" بہت شہرت [ر]کھتا تھا اس عہد میں صرف مدرسوں کی تعداد ہی نہیں بڑھی بلکہ تعلیم کا معیار بھی بلند ہوا [حس]ب بیان علامہ ابوالفضل یہ مضامین نصاب تعلیم میں شامل تھے۔

دینیات، علم اخلاق، فلسفہ، منطق، سیاست، تاریخ، جغرافیہ، نجوم، حساب، اقلیدس، طبیعیات، زراعت، فلاحت، طب، ہندو یہ علوم بھی پڑھتے تھے۔ ویاکرن (قواعد) ویدانت اور پاتنجلی۔

چنانچہ درس وتدریس کی آسانی کے لئے مندرجہ بالا مضامین کے کئی کئی نسخے "درس گاہی کتب خانوں" میں رہتے تھے جس کی وجہ سے یہ کتب خانے مختلف علوم وفنون کے مخزن بن گئے تھے۔

[ج]ہانگیر جہانگیر کے عہد میں کتب خانوں کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا اکبر کی طرح وہ بھی کتابیں جمع کرنے کا ذوق اور مطالعہ سے دلچسپی رکھتا تھا [۱۶]۰۵ء - ۱۶۲۷ء۔ باپ کے کتب خانے کے علمی نوادر نے اس کے مذاق شاعری اور اس کی [تن]قیدی نگاہ کو اتنا اجاگر کر دیا تھا کہ وہ علم وسخن کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا ایک تنقید نگار [کی] حیثیت سے اس کی نظر اتنی صحیح اور معیاری تھی کہ بقول علامہ شبلی اس نے اپنی تزک[۱] میں [ا]ن شاعر کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ حرف آخر ہے۔

[تز]ک جہانگیری اس میں جہانگیر نے اپنے مشاغل وحالات اور ملکی واقعات تاریخ وا[ر] بیان کئے ہیں یہ اس کی انشاء پردازی اور قوت تحریر کا ایک نادر [نم]ونہ ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم وفنون کی سرپرستی کرنے میں وہ اپنے [با]پ سے پیچھے نہیں رہا اس نے کتب خانوں اور مدرسوں کے قیام کی طرف ذاتی توجہ دی [ا]س کے عہد میں بہت سے نئے مدرسے کھلے اور وہ قدیم مدرسے جو ویران پڑے ہوئے تھے

[۱] تزک جہانگیری کے علاوہ اقبال نامہ جہانگیری (محمد شریف معتمد خاں) اور مآثر جہانگیری (مرزا کامگار [حس]ینی) میں جہانگیر کے عہد کے حالات اور واقعات درج ہیں۔

از سر نو آباد ہو گئے اور یہ قانون بنا دیا گیا کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مر
تو اس کے مال ومتاع سے مدارس اور خانقاہیں بنوائی جائیں۔ اس طرح مدرسوں ا
ان کے ساتھ کتب خانوں کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔

کتب خانہ جہانگیر کو جو کتب خانہ وراثت میں ملا تھا اس کی امتیازی شان کو
صرف اس نے قائم رکھا بلکہ اس میں قابل قدر اضافے کئے۔ علم وادب
شعر وشاعری اور آرٹ کی کتابوں، تصویروں اور مرقعوں کا بیش بہا سرمایہ اس میں ج
کیا جس کی تعداد ۶۰ ہزار کے لگ بھگ تھی کتابوں کی فراہمی اور نگہداشت میں بھی جہانگ
اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا۔ اس نے مکتوب خاں کو کتب خانہ کا مہتمم مقرر کیا تھا۔

صاحبانِ علوم وفنون جس طرح جہانگیر کا کتب خانہ بیش قیمت نوادر سے پُر تھ
اسی طرح اس کا دربار شہرۂ آفاق عالموں، شاعروں، خطا
اور مصوروں سے بھرا ہوا تھا جن کے دم سے کتب خانوں کی روز افزوں ترقی ہو رہی تھ
امراء میں مرزا غازی خاں کا دربار اہل علم کا مرکز تھا۔ شاعروں میں طالب آملی نے ملک الشع
کا مرتبہ پایا۔ علماء اور فضلاء میں مولانا مرزا شکر اللہ شیرازی، مرزا غیاث بیگ، ملا مح
جونپوری اور مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی بہت مشہور ہوئے۔ مگر اکبری اور جہانگیری
کی بلند ترین ہستیاں دو تھیں، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴
۱۶۲۴ء) اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۵۵۱-۱۶۴۲ء) ان بزرگوں نے علم وعمل
ہم آہنگی پیدا کی اور کتب خانوں کی تحریک کو وسعت بخشی۔ حضرت مجددؒ کے فیض روحا
اور دینی ودرسی خدمات کا اندازہ آپ کے مکتوبات[1] سے ہوتا ہے جو آج تک شمع ہدایت
کا کام دے رہے ہیں۔ یہ حضرت ہی کی زندگی میں اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ ان کے نسخے ہندو
اور باہر کے ملکوں میں کتب خانوں کی زینت بن گئے تھے۔

شیخ عبد الحق نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ علم حدیث کو ہندوستان میں پھیلایا
اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ مختلف موضوعات پر آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے زیا

---

[1] یہ مکتوبات امام ربانی کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔

ے جن میں "لمعات (شرح مشکوٰۃ) اخبار الاخیار، جذب القلوب فی دیار المحبوب،
مدارج النبوت' اور مصنفین دہلی" بہت مشہور ہیں۔ "اخبار الاخیار" کو جہانگیر نے بڑی قدر
ی نگاہ سے دیکھا اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کی۔ کتابوں کے متعلق جہانگیر کی رائے اجتہاد
درجہ رکھتی تھی۔ میر عضد الدولہ کی "فرہنگ جہانگیری" پر اس نے جو رائے دی ہے اس سے
نر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا۔ جہانگیر کی خدمت میں عضد الدولہ نے جب یہ کتاب
بں کی تو بہت پسند فرمائی۔ ایک ہاتھی انعام میں دیا اور کتاب کو بے مثل بتاتے ہوئے کہا کہ[1] "قدما
اشعار سے سند لانے کا جو اہتمام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کسی فارسی
ت میں نہیں ملتا۔"

ذوقِ مصوّری جہانگیر کے اس تبحر علمی میں مصوّری کے ذوق نے بڑی دلکشی پیدا
کر دی تھی۔ وہ مصوری کا عاشق تھا اور اس عشق نے شاہی کتب خانہ
سن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ مصور کتابوں، مرقعوں اور تصویروں سے بادشاہ کی محبت
بہرہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گیا تھا چنانچہ ہر طرف
کتابیں اور تصویریں آتی رہتی تھیں۔ عبدالرحیم خانخاناں نے جہانگیر کے حضور میں یوسف
ا کا ایک مرصع نسخہ نذر کیا یہ وہی نسخہ تھا جسے خطاطوں کے بادشاہ میر علی نے ۱۵۲۳ء
لکھا تھا اور جس کی قیمت ایک ہزار طلائی مہر قرار پائی تھی[2] ایک عظیم مصور خلیل کا کھینچا ہوا
یور کے معرکہ جنگ کا مرقع اصفہان سے جہانگیر کے پاس آیا تھا۔ مقالات شبلی[3] میں ہے کہ
مرقع میں ۲۴۰ تصویریں تھیں اور یہ سب ان شہزادوں اور امرا کی تھیں جو اس معرکہ میں شریک
ہر تصویر کے نیچے صاحب تصویر کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ مرقع شاہ اسمٰعیل صفوی کے

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے "الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات
اشعار علما، قدما مستشہد آوردہ دریں فن کتابے مثل ایں نمی باشد، فیل خاصہ عنایت
م" (مقالات شبلی ۱۹۳۴ء) جلد ۴۔ ص ۱۱۳۔

کتاب خدابخش لائبریری بانکی پور پٹنہ میں ہے (ایک مشرقی کتب خانہ ص ۲۹)

مقالات شبلی (۱۹۳۴ء) جلد ۴ ص ۹۸۔

کتب خانہ سے شاہ عباس کے ہاتھ آیا تھا۔ شاہ عباس کے داروغہ کتب خانہ نے اس کو چوری سے بیچ ڈالا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جہانگیر نے خان عالم کو جب ایران بھیجا تو اصفہان میں یہ مرقع بازار میں بک رہا تھا خان عالم نے خرید لیا شاہ عباس کو خبر ہوئی تو خان عالم کو لکھ بھیجا کہ میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں بھیج دو۔ خان عالم نے بہت ٹالا لیکن شاہ عباس کے اصرار سے مجبور ہو گیا اور آخر بھیج دیا۔ شاہ عباس کو چونکہ جہانگیر کی تصویر دوستی کا حال معلوم تھا چند روز اپنے پاس رکھکر خان عالم کے پاس واپس بھیج دیا۔"

جہانگیر کے مجموعہ تصاویر میں ایک تصویر تھی جس کو اس نے پانچ ہزار روپیہ میں خریدا تھا اس تصویر میں ایک عورت غسل سے فارغ ہو کر بیٹھی ہے اور ایک خادمہ اس کے پاؤں کے تلوؤں سے میل صاف کر رہی ہے جہانگیر نے اپنی پسندیدگی کی وجہ یہ بتائی کہ اس عورت کے چہرہ پر اس کیفیت کے پورے آثار ظاہر ہیں جو تلوؤں کو کھجاتے وقت محسوس ہوتی ہے۔

تصویر شناسی[۱] میں بادشاہ کی اس مہارت نے فن مصوری کو عروج پر پہنچا دیا تھا اور اس کے دربار میں ایسے باکمال مصور جمع ہو گئے تھے جو یورپ کی بہترین تصویروں کی نقل نہایت کامیابی سے اتار سکتے تھے۔ انگلستان کا سفیر سر طامس رو جب ہندوستان آیا اس نے جہانگیر کو ایک نہایت عمدہ تصویر پیش کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی متعدد کاپیاں سر طامس کو دکھائی گئیں جو اس کی پیش کی ہوئی تصویر سے اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ وہ انکو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ جہانگیر کا ایک مصور منصور جسے نادر العصر کا خطاب دیا گیا تھا پرندوں اور پھولوں کی تصاویر بنانے میں بے نظیر تھا۔ ابوالحسن نے تزک کے لئے جہانگیر

---

[۱] جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ "اب فن مصوری سے میرے لگاؤ اور شناخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی تصویر میرے سامنے لائی جائے خواہ وہ کسی متوفی مصور کی ہو یا زندہ کی، اور مجھے اس کا نام نہ بتایا جائے تو میں ایک لمحہ میں بتا دوں گا کہ یہ فلاں مصور کے موقلم سے ہے اور اگر کسی تصویر میں بہت سی شبیہیں شامل ہوں اور ہر شبیہ کا چہرہ الگ الگ مصوروں نے کھینچا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ کونسا چہرہ کس مصور نے کھینچا ہے اور اگر کسی دوسرے مصور نے صرف چشم و ابروہی بنائے ہوں تو میں بتا دوں گا کہ اس تصویر کا چہرہ کس کے قلم سے ہے اور چشم و ابرو کس نے بنائے ہیں۔"
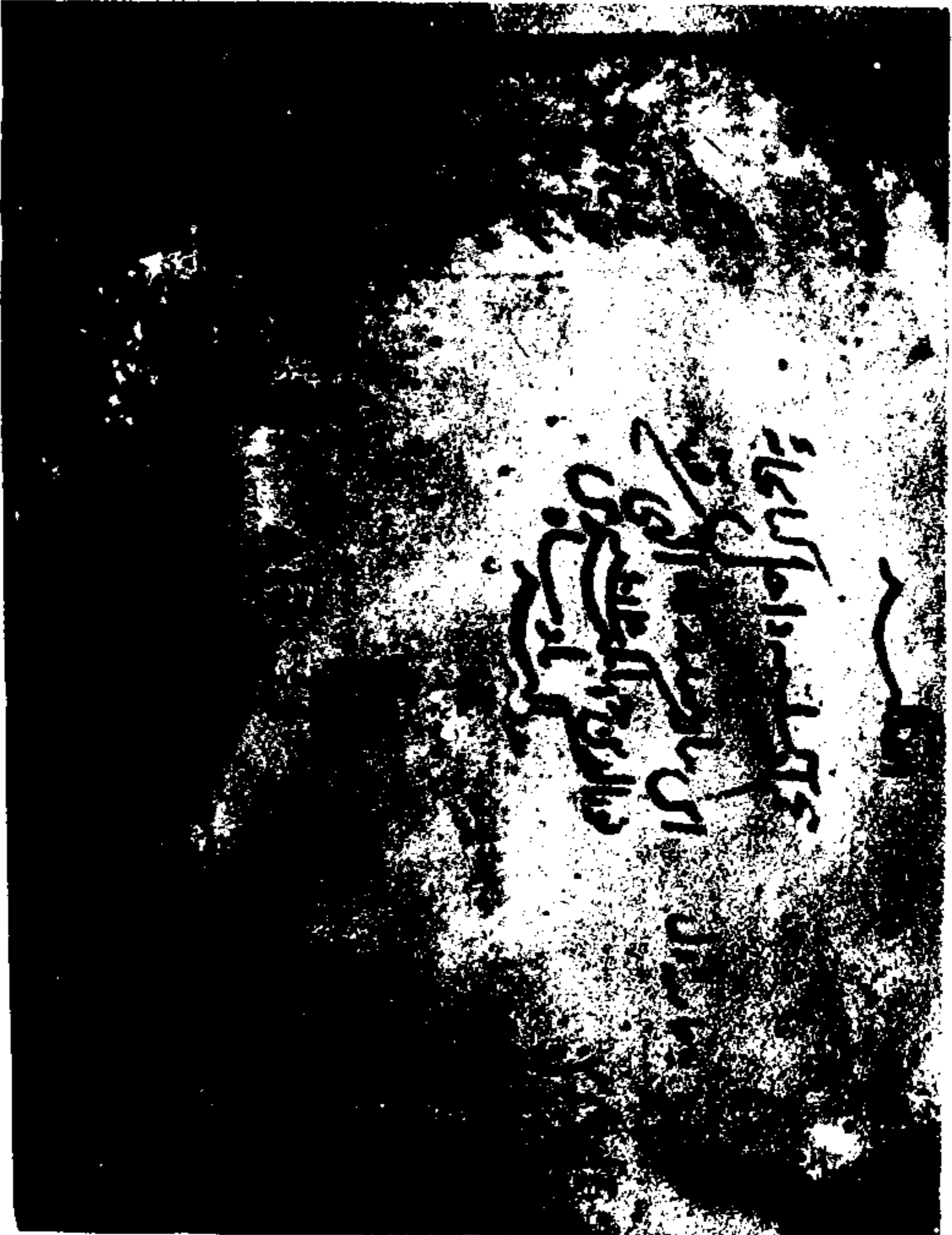
جلوس کا ایک مرقع تیار کیا تھا اور نادر الزماں کا خطاب پایا تھا۔ بشن داس جو شبیہ سازی میں کمال رکھتا تھا شاہ عباس صفوی اور اس کے دربار کی تصویریں بنانے کیلئے ایران بھیجا گیا تھا اس طرح جو تصویریں اور مرقعے جہانگیر نے تیار کرائے وہ شاہی کتب خانہ کی زینت کا سامان بنگئے تھے

کتابوں پر جہانگیر کی تحریریں

جہانگیر کا مصوری کے ساتھ کتابوں سے بھی محبت کرنا کتب خانوں کے لئے بڑا سود مند ہوا اسے کتابوں سے ایسا قلبی تعلق تھا کہ وہ سفر میں بھی اپنے کتب خانے کا ایک حصہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ گجرات پہنچا تو اس نے اپنے سفری کتب خانہ میں سے وہاں کے علماء اور مشائخ کو چند کتابیں عطا کیں اور ان پر گجرات پہنچنے اور کتابیں دینے کی تاریخ اپنے قلم سے تحریر کی تھی۔ ایسی ہی اور بہت سی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جن پر جہانگیر کی تحریریں موجود ہیں۔ کتب خانہ خدا بخش بانکی پور میں ہمایوں کے بھائی شاہزادہ کامران کا دیوان ہے جسکے پہلے صفحہ پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت موجود ہے۔

"اللہ اکبر۔ دیوان مرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار من است بخط محمود بن اسحاق شہابی حررہٗ نورالدین محمد جہانگیر شاہ سنہ جلوس موافق ۱۰۲۴ھ"

جہانگیر کو اپنے کتب خانہ سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ کتب خانہ کے کارکنوں کو کتابوں کی ترتیب و تنظیم کے متعلق بھی ہدایتیں دیدیا کرتا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں ترکی دیوان کا ایک سرورق ہے جس پر جہانگیر کی مندرجہ ذیل[1] تحریر کے علاوہ اسکے قلم کا "خاصہ اول" بھی لکھا ہوا ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ اس اہم کتاب کو درجہ اول کی کتابوں میں رکھا جائے

اللہ اکبر

بہجم آذر سنہ ۵ داخل کتاب خانۂ این نیاز مند درگاہ الٰہی شد حررہ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ ۱۰۱۵ھ

---

[1] جہانگیر نے یہ ہی عبارت اسی قلم میں "ترجیعات عراقی" کے پہلے صفحہ پر بھی لکھی ہے۔ یہ قلمی نسخہ جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے نہایت خوبصورت لکھا ہوا۔ اول سے آخر تک مُطلّا و مُذہّب ہے۔

(تذکرہ جواہر زواہر مرتبہ محمد ابرار حسین فاروقی صفحہ ن)

شاہجہاں
۱۶۲۷ - ۱۶۵۸ء

کتب خانوں کے معاملہ میں شاہجہاں نے اپنے علم دوست باپ دادا کی پیروی کی اگرچہ اس کی توجہ اور دلچسپیاں تعمیرات پر مذکور رہیں تاہم اس کا عہد علمی سرگرمیوں سے خالی نہیں رہا اس کے دربار میں بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود تھے جن کے مذاکراتِ علمیہ میں وہ خود شریک ہوتا تھا اس کا یہ علمی شغف، ارباب علم کے ساتھ اس کی فیاضیاں اور اس کا شوق مطالعہ کتب خانوں کے استحکام کا باعث ہوا۔ شاہجہاں نے جب اپنا پایہ تخت آگرہ سے دہلی منتقل کیا اور دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد جیسی رفیع الشان عمارتیں تعمیر کرائیں تو کتب خانوں کے ترقی کے لئے بھی نئے اسباب فراہم ہوئے۔

کتب خانہ

شاہ جہاں نے اپنے مذاق کے مطابق شاہی کتب خانے میں اضافے کئے تھے اس نے فن خوشنویسی سے خاص ذوق رکھنے کے باعث خوش خط کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ ایک جرمن سیاح سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ شاہی کتب خانہ میں چوبیس ہزار کتابیں ہیں جن کی جلدیں نہایت اعلیٰ ہیں چونکہ شاہجہاں فن خطاطی میں ایسا کمال رکھتا تھا کہ اسے فن خطاطی کا پیغمبر کہا گیا ہے اسی وجہ سے اس نے کتب خانہ میں اعلیٰ درجہ کے خوش نویس ملازم رکھے تھے جنہیں کبھی کبھی داروغہ (نگراں مہتمم) کے عہدہ پر بھی سرفراز کر دیا جاتا تھا اس خدمت پر عبدالرحمٰن شیدائی اور میر محمد صالح مشکیں رقم جیسے اعلیٰ خوش نویس یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ میر محمد صالح کو "مناقب مرتضوی" لکھنے کے سلسلہ میں بادشاہ نے ایک ہاتھی اور پانچہزار روپیہ انعام دیے تھے۔ ظفر احسن کا بیٹا مرزا محمد طاہر آشنا الملقب بہ عنایت خاں بھی شاہی کتب خانہ کا داروغہ رہا اسی زمانہ میں اس نے عہد شاہجہانی کی بعض تاریخوں کا خلاصہ مرتب کیا جو "ملخص" کے نام سے مشہور ہے۔

شوق مطالعہ

شاہ جہاں کا شوق مطالعہ بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ حکمرانی کے مشاغل کے باوجود وہ روزانہ کچھ وقت کتابوں کی صحبت میں گزارتا تھا۔ بزم تیموریہ

۱-۳- بزم تیموریہ ص ۲۲۰، ۲۲۰، ۱۸۶،

ں لکھا ہے کہ وہ جب تمام کاموں سے فارغ ہو کر رات کو سونے جاتا تو اس کے مقربان خاص
دہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے تھے۔ شاہجہاں کے ذوق مطالعہ کا اندازہ ان عبارتوں سے بھی
لتا ہے جو اس نے شاہی کتب خانہ کی مختلف کتابوں پر لکھی تھیں۔ مثلاً "مجالس خمسہ" کا وہ
سخہ جس پر شاہ جہاں کی تحریر ہے کتب خانہ خدا بخش بانکی پور میں محفوظ ہے ایشیاٹک سوسائٹی
نگال میں بھی ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہ جہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے
ے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی میں بادۂ علم سے سرشار تھا۔ تاریخ خاندانِ تیموریہ
سخہ خدا بخش) پر بھی شاہجہاں کی تحریر موجود ہے۔ دیوان مرزا کامران (نسخہ خدا بخش) پر جہانگیر
تحریر کے علاوہ شاہجہاں کی بھی مندرجہ ذیل تحریر ہے۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِہٖ الْكِتٰبَ حررہ شاہجہاں بن جہانگیر شاہ"

ارس اور ارباب علم

علم و ادب کے علاوہ شاہجہاں کی ذہنی ذکاوتیں فن تعمیر میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اس کا ذوق شاعری اس کے عشق
روایتیں کاغذ کے بجائے تاج محل کے گل بوٹوں میں اب تک نمایاں ہیں۔ شاہجہانی عہد کے فن تعمیر
بے مثل نمونہ تاج محل اور صنعتی کارنامہ تخت طاؤس ہے۔ ان نادر نمونوں کے ساتھ
دور میں ایسے مدرسے بھی ملتے ہیں جو ایشیا میں مشہور تھے۔ شاہ جہاں نے دہلی میں
مع مسجد کے قریب ایک مدرسہ "دار البقاء" کے نام سے تعمیر کرایا تھا جس کا ذکر سرسید
بھی آثار الصنادید میں کیا ہے۔ دہلی کے علاوہ جونپور، احمد آباد، لاہور اور سیالکوٹ بھی
کے مشہور مراکز تھے جہاں ہرات اور بدخشاں تک سے طلبا تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔
یہ مدرسے اور ارباب علم اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ شاہجہانی عہد میں کتنی علم کی
شرت تھی۔ بادشاہ کے بے مثل فیاضیوں نے بڑے بڑے علما اور فضلاء کو دربار میں
کر لیا تھا لکھا ہے کہ ملک الشعرا ابو طالب کلیم کو شاہجہاں نے ایک قصیدے کے
میں روپیہ کے برابر تلوا دیا تھا۔ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کو دو مرتبہ سونے چاندی
تلوایا تھا "عمل صالح" کے مصنف محمد صالح کنبوہ کو بھی دو بار سونے میں تلوا کر
دیا تھا۔ ایران کے خطاط میر عماد الحسینی کی خطاطی کا نمونہ جب کوئی شاہجہاں

کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ اس کو ایک صدی منصب عطا کر دیتا تھا۔ اسی طرح
محمد جان قدسی، ظفر خاں احسن، مرزا صائب، محمد امین[۱] قزوینی، مرزا جلال الدین[۲] طبا
عبد الحمید[۳] لاہوری، محمد وارث وغیرہ بھی شاہ جہاں کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتے ر
تھے شاہجہانی دربار کے ہندو فضلاء میں چندر بھان برہمن ممتاز درجہ رکھتا تھا اور ا
لیاقت کی وجہ سے وقائع نویسی کے عہدۂ جلیلہ پر مقرر ہوا تھا یہ داراشکوہ کا بھی ملا
رہا۔ اس نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں مثلاً گلدستہ، تحفۃ الانوار، مجمع الف
اور "منشات برہمن" جو اس کے رقعات کا مجموعہ ہے۔ چندر بھان فارسی اور اردو دونو
زبانوں کا شاعر تھا۔ اگرچہ اس وقت سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی مگر بعض ش
اردو میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ اسی عہد میں اردو کا لقب اردوئے م
ہوا تھا۔ اور اس نئی زبان سے شاہ جہاں کو بھی خاص اُنس ہو گیا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ا
نے اپنی اسیری کے دوران اپنے بیٹے داراشکوہ کو ایک خط اسی زبان میں لکھا تھا۔

عالمگیر
۱۶۵۹ - ۱۷۰۷ء

عالمگیر کے عہد میں بھی کتب خانوں کی کثرت رہی مگر ان کی نو
بالکل بدل گئی۔ اس بادشاہ کی فطرت صالحہ بچپن ہی سے علماء
فضلاء کی صحبت میں رہنے کی شائق تھی اور اسی زمانہ سے اس کو کتابیں جمع کرنے کا
ہو گیا تھا۔ بقول جادو ناتھ سرکار "اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت
تھا اور زندگی کے آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا" ظاہر ہے کہ کتابوں
محبت کتب خانوں کی ترقی کا سبب بنی اس سلسلہ میں یہ بات مدنظر رکھنی چاہ
قرون وسطیٰ میں بادشاہ کی ذات گرامی تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اسی لئے اس عہد کے کتب خا
بھی بادشاہ کے ذاتی ذوق و شوق کا عکس نظر آتا ہے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں مصوری سے لگا
چنانچہ ان کے کتب خانے مصور کتابوں اور اعلیٰ تصاویر سے پُر تھے اورنگ زیب کو مصوری س
رغبت نہ تھی۔ وہ احکام قرآن و حدیث کی ترویج و احیاء کی طرف زیادہ مائل تھا۔

[۱] تا [۳]۔ ان مورخین نے یہ تاریخیں مرتب کیں۔ بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی شاہجہاں نامہ ا
جلال الدین طباطبائی۔ بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری۔ بادشاہ نامہ از محمد وارث۔

کتب خانہ اسی لئے شاہی کتب خانہ اسلامی علوم و ادب کا ایک مخزن بن گیا تھا جس کے لئے اطرافِ عالم سے کتابیں حاصل کرنیکا اہتمام کیا گیا تھا اس کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد معاصر تاریخوں میں نہیں ملتی لیکن اس کی وسعت کا اندازہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے ہوسکتا ہے۔

کتب خانہ کا مہتمم شیخ ابوالوالی قابل خاں تھا سیّد علی جواہر رقم بھی کچھ عرصہ تک مہتمم رہا تھا اورنگ زیب نے فنِ خطاطی سید علی سے بھی سیکھا تھا شاہی کتب خانہ کی ایک کتاب "مثنوی گوئے چوگاں" پر قابل خاں کے نام کی یہ مہر موجود ہے "قابل خاں[5] خانہ زاد بادشاہ عالمگیر ۱۰۹۷ھ"

فتاویٰ عالمگیری یہ اورنگ زیب کے عہد کا ایک فقہی کارنامہ ہے جس کی تدوین کے لئے تقریباً پچاس علماء و فضلاء کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا تھا اور انھیں جن کتابوں کی ضرورت ہوتی وہ شاہی کتب خانہ سے مل جایا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب آٹھ سال میں مکمل ہوئی اور دو لاکھ روپیہ اس پر لاگت آئی۔ اس کی تالیف سے عالمگیر کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ فتاویٰ کا ہر صفحہ خود پڑھوا کر سنتا اور حوالوں کا اصل کتابوں سے مقابلہ کرتا اس سلسلہ میں حدیث و فقہ کی ان گنت کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا جو سب کی سب شاہی کتب خانہ میں موجود تھیں۔

عالمگیر کا فنِ خطاطی سے گہرا لگاؤ عالمگیر خود بھی حدیث و فقہ سے گہری واقفیت رکھتا تھا اسے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل تھا، حافظِ قرآن تھا فنِ خطاطی میں اچھی مہارت تھی۔ یہ فن اُس نے سید علی خان جواہر رقم اور عبدالباقی حداد سے سیکھا تھا جو اس زمانہ کے بہترین خطاط تھے حداد تو خطِ نسخ کا اتنا بڑا ماہر تھا کہ اس نے تیس اوراق پر پورے قرآن مجید کی کتابت کر کے اسے شاہجہاں کی خدمت میں پیش کیا اور یاقوت رقم کا خطاب پایا تھا۔

اس فن سے عالمگیر کے گہرے لگاؤ کا حال پچھلے اوراق میں آچکا ہے کہ وہ اپنی شہزادگی سے

---

[5] مجلہ علوم اسلامیہ جلد اول ص ۱۳۵ (ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)۔

لے کر آخری عمر تک فرصت کے اوقات میں صبح ۵ بجے سے ۷ بجے تک اور سہ پہر کو ۲ بجے سے ۵ تک قرآن کریم کی کتابت کیا کرتا تھا اس نے دو قرآن اپنے ہاتھ سے لکھ کر مدینہ منورہ بھی بھیجے تھے۔

مثنوی گوئے چوگاں عالمگیر کی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ جنگ و جدل کے ہنگاموں میں بھی اس کا کتابی ذوق قائم رہتا تھا۔ اس کی حکومت کے اڑتالیس سالہ دَور میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ اس نے فتح کی خوشی میں سرشار ہو کر کتابوں کو برباد کیا ہو بلکہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مہمات کے دوران میں کتابوں کا خاص خیال رکھتا تھا اور مالِ غنیمت میں جو کتابیں ملتیں انھیں شاہی کتب خانہ میں منتقل کرا دیتا تھا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں "مثنوی گوئے چوگاں" کا ایک نسخہ ہے جو عالمگیر نے فتح گولکنڈہ[1] کے مالِ غنیمت میں حاصل کیا تھا ملا عارفی کی یہ تصنیف خطاطی کے اُستاد میر علی نے ایسی نیک ساعت میں بمقام ہرات لکھی تھی کہ وقت تحریر سے لے کر آج تک چار سو پچپن برس کی طویل مدت میں اسے گردش زمانہ سے کوئی گزند نہیں پہنچا البتہ اس کی قیمت میں تغیرات ہوتے رہے بقول مولانا حبیب[2] الرحمن خاں شروانی عالمگیری کتب خانہ میں اس کی قیمت کا اندراج دو ہزار روپیہ ہے۔ عالمگیر کی وفات کے کوئی پچھتر سال بعد یہ دو سو دس روپیہ میں فروخت ہوئی۔ اس کے بعد ڈھائی سو روپے میں بکی۔ اور مولانا موصوف نے اسے ایک سو ستر روپیہ میں خریدا۔ یہ کتاب ہندوستان میں دکن کے کتب خانوں میں رہی پھر عالمگیری کتب خانہ میں داخل ہوئی اس کے بعد اِدھر اُدھر ہوتی ہوئی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں پہنچی اور اب کتب خانہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ حبیب گنج میں ہے اس کتاب پر متعدد تحریریں اور مُہریں ہیں ایک مہر پر ناظم کتب خانہ کا نام اور مثنوی گوئے چوگاں کے کتب خانہ میں داخلہ کا سن ۱۰۹۷ھ درج ہے۔

---

[1] فتح گولکنڈہ کے حالات "وقائع گولکنڈہ" از نعمت خاں عالی میں درج ہیں۔ عالمگیری عہد کے متعلق یہ کتابیں بھی ملاحظہ کیجئے۔ عالمگیر نامہ (مرزا محمد کاظم)، واقعات عالمگیری (میر محمد عسکری عاقل خاں رازی)، مآثر عالمگیری (محمد ساقی مستعد خاں)

[2] مقالات شروانی ص ۷۔۴۰۔

رقعات عالمگیری اور دیگر کتابیں

عالمگیر کی انشار پردازی کا اندازہ ان رقعات سے ہوتا ہے جو اس نے اپنے شہزادوں وغیرہ کو لکھے ہیں خطوط کو سوانح نگاری کی جان کہا جاتا ہے لیکن ان رقعات کو ایسے دلکش انداز میں لکھا گیا ہے کہ وہ فارسی کے شہ پارے بن گئے اُن سے عالمگیر کی ذہانت، بصیرت اور اس عہد کی سیاسی تصویر واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔

رقعات عالمگیری[1] اور فتاوئ عالمگیری کے سوا اس عہد کی یادگار اور بھی کتابیں ہیں ... یاس کہتا ہے کہ عالمگیری دور کے کتب خانوں میں اسلامی علوم اور ہندوؤں کے علوم ... ولوں کی کتابیں جمع تھیں اس زمانہ میں ہندوؤں کے فن بلاغت و عروض، ہیئت و نجوم ... رسوم وعقائد پر "تحفۃ الہند"[2] "نظام النجم" اور "مت اچھرا" جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ عالمگیر ... بار کے ہندو فضلاء، وامق کھتری، بھیم سنگھ کالیستھ (مصنف تاریخ دلکشا) ایشر داس ... صنف فتوحات عالمگیری) سجان رائے کھتری (مصنف خلاصۃ التواریخ) اور لعل بہاری (مصنف مت ... ا) صاف صاف بتارہے ہیں کہ عالمگیر اپنے آبا کی طرح ارباب علم کی سرپرستی کرنے میں مذہب و ملت کا کوئی لحاظ ... تا تھا اور مسلم علماء و فضلاء میر محمد قنوجی، شیخ نظام برہان پوری، قاضی محب اللہ بہاری، نعمت خاں ... ، شیخ وجیہ الدین گوپاموی اور شیخ احمد ملا جیون وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہندو فضلاء کو بھی ... سام واکرام سے نوازتا رہتا تھا۔

مدارس اور کتب خانے

عالمگیری عہد میں مدرسے اور کتب خانے بکثرت ملتے ہیں چونکہ اس باب میں عالمگیر کی ذاتی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ... لمگیر نامہ میں ہے کہ "علم و فضل کی تاسیس و ترویج کا اعلیٰ حضرت کو بے حد شوق ہے۔ اس ... اس وسیع ملک کے تمام شہروں اور قصبات میں فضلاء اور مدرسین کو مناسب وظیفے ... دیئے اور املاک عطا فرما کر علوم کی تعلیم و تدریس میں مشغول فرما رکھا ہے" اورنگ زیب ... اس شوق کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا کہ بقول پروفیسر کین بشمار دار العلوم اور مدارس قائم ہوئے

---

[1] ... قعات عالمگیری پر اردو میں مقدمہ و تفصیلی تبصرہ سید نجیب اشرف ندوی نے اپنی کتاب "مقدمات رقعات عالمگیر" ... ہے جو دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے [2] تحفۃ الہند (مصنفہ مرزا خان بن فخر الدین محمد) ... کا مضمون مقالات شبلی جلد دوم (ص ۹۲) میں ملاحظہ کیجئے۔

اس عہد کے مدارس میں احمد آباد کا "مدرسہ محمد اکرام الدین" نہایت عظیم الشان تھا
اس کی عمارت اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ میں بنوائی تھی اس کے اخراجات کے
لئے عالمگیر نے دو گاؤں وقف کر دیے تھے اور نادار طلبار کیلئے دو روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر کیا
تھا۔ دہلی میں "مدرسہ شاہ عبد الرحیم" اس زمانہ کا بے نظیر مدرسہ تھا۔ اس کے بانی حضرت شاہ
عبد الرحیم دہلوی کی نسبت بزم تیموریہ میں ہے کہ وہ اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے
ہندوستان کے مایہ ناز علمار میں سے تھے شاہ صاحب کے بعد ان کے لائق بیٹے اور پوتوں حضرت
شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبد العزیز وغیرہ نے اس مدرسہ کی عظمت کو برقرار رکھا
عالمگیر کی علم پروری کی ایک اہم یادگار "لکھنؤ کا فرنگی محل"[1] اب تک موجود ہے عہد عالمگیری کے
"دو پروانے"[2] دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں موجودہ دار العلوم کے قیام سے کئی سو
برس پہلے درس و تدریس کا سلسلہ عہد مغلیہ ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے یہاں ایک
خانقاہ کے اخراجات کے لئے کچھ جاگیریں عطا کیں تھیں اس خانقاہ سے متعلق ایک کتب
بھی تھا جس میں کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود تھا خانقاہ کی آتش زدگی کے وقت
ذخیرہ بھی برباد ہو گیا۔ عالمگیری عہد کی درس گاہوں سے جو کتب خانے منسلک رہے ان
فرنگی محل کے کتب خانے کی قیمتی و نایاب کتابیں راقم الحروف کی نظر سے گذری ہیں۔

بہادر شاہ اول سے بہادر شاہ ظفر تک ۱۷۰۷ء ـــــ ۱۸۵۷ء

عالمگیر کی رحلت کے بعد جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوا تو شاہان مغلیہ کے کتب خانوں میں بھی تاریکی چھا نے لگی۔ عالمگیر کا لڑکا بہادر شاہ اول اپنے باپ کی طرح عظیم بادشاہ
نہ بن سکا اگرچہ علم حدیث اور دوسرے علوم میں اس کا پایہ نہایت بلند تھا اور اپنے عہد

[1] دار العلوم فرنگی محل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی کے ایک عالم ملا قطب الدین کی شہادت پر عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ کا وہ محلہ دیدیا جو ایک فرانسیسی سوداگر کے قبضہ میں تھا اسی وجہ سے اس کا نام پڑ گیا۔ ملا قطب الدین سہالوی کی اولاد میں ملا نظام الدین (متوفی ۱۷۴۸ء) وہ نامور عالم تھے جن کے نام سے عربی مدارس کا نصاب درس نظامیہ منسوب ہے ملا نظام الدین کے صاحبزادوں میں ملا عبد العلی بحر العلوم بڑے عالم ہوئے۔ فرنگی محل کے علماء میں مولانا عبد الحی (متوفی ۱۸۸۶ء) بھی بڑے مشہور معروف عالم گذرے ہیں

[2] ملاحظہ ہو رسالہ برہان۔ دہلی۔ اگست ۱۹۵۵ء

مثلین نعمت خان عالی، مرزا عبدالقادر بیدل، میر جعفر زٹلی اور بندرابن (مصنف لب التواریخ) کی سرپرستی اور قدردانی کرنے میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ بہادر شاہ کے امرائیں امیر غازی الدین نے "مدرسہ غازی الدین" قائم کیا جو آج بھی دہلی میں اسی شاندار عمارت میں ہے جسے غازی الدین خاں نے تعمیر کرایا تھا مگر اب اس کا نام "دہلی کالج" ہو گیا ہے اس کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر اگلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

بہادر شاہ اول کے جانشینوں میں گو محمد شاہ، شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا درجہ اردو شاعری اور ادب میں بہت اونچا ہے لیکن عالمگیر کے بعد کوئی ایسا بادشاہ نظر نہیں آتا جو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے وسیع نظام کو سنبھالتا اور اس کو قائم رکھ سکتا۔ چنانچہ سلطنت میں زوال آنا شروع ہو گیا اور اس دور میں کتب خانوں کی بھی وہ حالت نہ رہی جو اکبر سے عالمگیر کے عہد تک تھی۔

محمد شاہ

البتہ محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) میں ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے جن سے کتب خانوں کی تحریک کو کچھ تقویت ملی اس زمانہ میں اردو زبان کی مقبولیت اور رواج بڑھ جانے اور علم ہیئت کے ترقی پانے سے علمی فضاؤں میں رونق و بہار آ گئی تھی ۱۷۲۲ء میں ولی اورنگ آبادی اپنا دیوان لے کر دکن سے دہلی آئے جو اتنا مقبول ہوا کہ اس کے اشعار محفلوں اور بازاروں میں گائے جانے لگے اور اردو شاعری کے چرچے دہلی میں عام ہو گئے محمد شاہ نے بھی اردو میں شاعری کی اور اس زبان کی مقبولیت بڑھانے میں حصہ لیا۔

اسی عہد میں اردو نثر کی تصنیف و تالیف کی باقاعدہ ابتدا[1] شمالی ہندوستان میں ہوئی فضلی نے ۱۷۳۱ء میں وہ مجلس یا کربل کتھا[2] (کربلا کی کہانی) لکھی جو ملا حسین واعظ کاشفی کی

[1] اسے داستان تاریخ اردو کے مصنف حامد حسن قادری نے اردو زبان کے ارتقار کی تاریخ کا دوسرا دور قرار دیا ہے اور اس کی مدت ۱۷۳۲ - ۱۷۹۹ء بتائی ہے۔ اس کا پہلا دور دکن میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی سرپرستی میں گذرا۔ [2] خیال کیا جاتا تھا کہ یہ کتاب دنیا سے فنا ہو گئی کیونکہ زمانہ حال کا کوئی تذکرہ نویس یا محقق اس کے دیکھنے کا مدعی نہ تھا اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ریڈر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ۱۹۵۸ء میں ٹوبنگن (جرمنی) کے کتب خانہ سے حاصل کر کے شائع کر دیا ہے۔

فارسی کتاب روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ ہے" وہ مجلس" اردو نثر کی وہ قدیم ترین کتاب ہے جو شمالی ہند میں لکھی گئی یہاں محمد شاہ کے عہد میں بڑے بڑے ارباب علم و فن جمع ہو گئے تھے۔ ایک مصوّر گوردھن تھا جو بقول انند رام مخلص (مصنف مراۃ اصطلاحات) نرگس کی ایک پتی پر پورے ایک شہر کی تصویر کھینچتا تھا[1] شاہی دربار کے متوسلین میں لال رام نے ایک کتاب "تحفۃ الہند" لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی تھی محمد شاہ کے ایک ندیم خاص امیر خاں (نواب عمدۃ الملک) نے بقول مصنف صحیفہ تاریخ اردو[2] "عمدۃ الملکی انجمن" بنائی تھی جسکے جلسوں میں اردو زبان کے مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔ امیر خاں خود بڑے پایہ کے شاعر اور شاعروں کے سرپرست تھے انجام تخلص کرتے تھے۔

علم ہیئت کی ترقیاں

محمد شاہی دور میں علم ہیئت اور نجوم کی جو ترقیاں ہوئیں ان میں راجہ جے سنگھ کا بہت بڑا ہاتھ رہا وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر تھا اور پھر جے پور کا راجہ ہو گیا تھا علم ہیئت سے محمد شاہ بھی خاص ذوق رکھتا تھا اسی کے حکم سے دہلی میں رصد خانہ تعمیر ہوا جس کا مہتمم مرزا خیر اللہ مہندس تھا دہلی کے نمونے پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں رصد خانے بنے اور علم ہیئت کی عربی اور فارسی کتابوں کے ہندی میں ترجمے ہوئے اسوقت علمائے ہیئت نے اس موضوع پر جو معلومات و تحقیقات حاصل کیں انکی یادگار "زیج محمد شاہی" ہے۔ کیا یہ سرگرمیاں اس بات کو ثابت نہیں کرتیں کہ عہد محمد شاہی میں کتب خانوں کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً "رصد خانوں کے کتب خانے" علم ہیئت اور نجوم کی بہترین کتابوں سے معمور تھے۔

محمد شاہ کی وفات کے گیارہ برس بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا وہ بادشاہ کی حیثیت سے تو بالکل ناکام رہا مگر شاعری کی دنیا میں نام پایا شاہ عالم فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ آفتاب تخلص کرتا تھا۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد" بڑا مشاق شاعر تھا جس کے چار دیوان اُردو میں موجود ہیں،" بابر کا آخری جانشین بہادر شاہ ظفر اُردو زبان میں اس پایہ کا شاعر ہوا ہے کہ اہل علم اسے آجتک اقلیم سخن کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ خود کہتا ہے۔

طرز سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے ٭ اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

---

[1] ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۳۶۔

[2] صحیفۂ تاریخ اردو مصنفہ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی ص ۱۳۳۔

قلعۂ معلّی کا شاہی کتب خانہ اگر زمانہ سازگار ہوتا تو ان بادشاہوں کا علمی ذوق کتب خانوں کی ترقی میں بڑی معاونت کرتا مگر اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہی غنیمت نظر آتا ہے کہ شاہی کتب خانہ کی بہت سی کتابیں تباہی سے بچ گئیں حالانکہ سے نادرشاہ کے حملہ اور مرہٹوں وغیرہ کے یلغار کے باعث بڑے صدمے اٹھانے پڑے تھے۔
اس طوائف الملوکی کے دور میں یہ بادشاہ شاہی کتب خانہ کی دل وجان سے حفاظت کرتے رہے سی وجہ سے مغلوں کے آخری ایام تک اس میں اچھی اچھی کتابیں باقی رہیں۔ مناظر احسن گیلانی لے لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کو جب "تفسیر فتح العزیز" لکھتے وقت امام رازی کی تفسیر کبیر ضرورت پڑی اور کہیں دستیاب نہ ہوئی تو بہ مشکل قلعہ معلّی کے شاہی کتب خانہ سے چند ن کے لئے عاریتاً ملی۔ بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص اور وزیر حکیم احسن اللہ خاں دہلوی کے خانہ کی ایک نادر کتاب رسالہائے بو علی سینا "نواب صاحب لوہارو کے پاس ہے اسے دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس قیامت خیز دور میں شاہی کتب خانہ کے علاوہ امراء کے نجی کتب خانے بھی موجود تھے۔

کتب خانہ دارا شکوہ مغل بادشاہوں کی علم پرور صحبت نے مغل شاہزادوں میں علمی مذاق اور کتابیں جمع کرنیکا شوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ثر نے شعر وسخن کی محفلیں سجائیں اور کتابوں کے ذخیرے جمع کئے مگر یہاں صرف دارا شکوہ متوفی ۱۶۵۹ء) کا ذکر کیا جا رہا ہے جو شاعر، مصنف اور خطاط کی حیثیت سے مغل شہزادوں کا سرسید کہا جاتا ہے شاہجہاں کا یہ بدنصیب لڑکا تخت وتاج کا مالک تو نہ بن سکا مگر علمی قلمرو میں وہ بادشاہی کر دارا کا کتب خانہ بھی بہت نفیس تھا جس کے آثار آج تک دہلی کے کشمیری دروازہ میں پائے جاتے ہیں اسنے تھانیسر ہاں) میں درگاہ شیخ چلی کے پاس ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو مدرسہ شیخ چلی" کے نام سے مشہور ہے۔
دارا شکوہ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں "سکینۃ الاولیاء، سفینۃ الاولیاء، حسنات العارفین مجمع البحرین" مشہور ہیں۔ پروفیسر محفوظ الحق (کلکتہ یونیورسٹی) نے مجمع البحرین کو مرتب کر کے کے دیباچہ میں دارا کی خطاطی کے بہت سے نمونوں کا ذکر کر دیا ہے۔

کتب خانہ زیب النساء مغل خاندان میں شاید ہی کوئی ایسی شہزادی ہو جو علم وادب سے لگاؤ اور کتابیں جمع کرنے کا شوق نہ رکھتی ہو۔ شہزادیوں میں گلبدن

بیگم سلیمہ سلطان بیگم، نورجہاں، ممتاز محل، جہاں آرا اور زیب النساء کے نام علمی حیثیت سے بہت نمایاں ہیں۔ گلبدن بیگم کی یادگار "ہمایوں نامہ" اور جہاں آرا کی یادگار "مونس الارواح" ہے جس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء کے حالات درج ہیں۔ یہ شہزادیاں اپنے علمی مذاق کی تکمیل کے لیے ذاتی کتب خانے بھی رکھتی تھیں۔ ان میں شہزادی سلیمہ سلطان بیگم اور زیب النساء کے کتب خانوں کی مورخین نے تعریف کی ہے مآثر عالمگیری کے مؤلف کا بیان ہے کہ "زیب النساء کا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا" اس میں بیشتر کتابیں مذہب اور اخلاق کے متعلق تھیں۔ کتب خانہ کا منتظم ملا شفیع الدین تھا۔

مغل شہزادیوں میں زیب النساء (متوفی ۱۷۰۲ء) کا مرتبہ علم وفضل میں بہت ملند تھا وہ نہایت عمدہ شاعرہ تھی مخفی تخلص کرتی تھی۔ خطاطی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا کتابیں جمع کرنے اور تصنیف وتالیف سے خاص شغف رکھتی تھی۔ چنانچہ ان مشاغل ہی نے اس کے کتب خانہ کو نادرالوجود بنا دیا تھا اس شہزادی کے دربار کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اکاڈیمی (بیت العلوم) تھا جہاں ہر فن کے علماء وفضلاء ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے۔ ان علمی کاموں کے سلسلہ میں جن کتابوں کی ضرورت ہوتی وہ شہزادی کے کتب خانہ سے بہ آسانی مل جاتی تھیں۔ اس کتب خانہ کے دروازے شائقینِ علم کے لئے کھلے ہوئے تھے۔

کتب خانہ عبدالرحیم خان خاناں۔ مغل عہد کے علماء اور امراء کی کثرت بتا رہی ہے کہ اس زمانہ میں کتب خانوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی لیکن افسوس ان سب علمی خزانوں کو تاریخ کے اوراق میں جگہ نہ مل سکی البتہ بیرم خاں کے لڑکے عبدالرحیم خان خاناں (متوفی ۱۶۲۷ء) کے کتب خانہ کا مورخین نے نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اس کی تعریف بھی کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس سے استفادہ کرنے کیلئے دور دراز ممالک سے علماء وطلبا آتے تھے۔ اکبری دربار کا یہ رتن خانخاناں عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کا عالم تھا اس نے تزک بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور بھاشا میں نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعری کی وہ جس طرح علمی قابلیت، سخن سنجی، علماء نوازی اور فیاضی میں بے مثل تھا

اسکا کتب خانہ بھی اس زمانہ میں بینظیر تھا اسے جو اہمیت اور خصوصیت حاصل تھی وہ علامہ شبلی نے یوں بیان کی ہے[۱]

"یہ کتب خانہ اس درجہ کا تھا اور اس قدر علمی ذخیرے اس میں مہیا کیے گئے تھے کہ بجائے خود ایک اکاڈیمی یا دار الحکمت کا کام دیتا تھا۔ عرفی نظیری ظہوری، شکیبی، غرض اکثر شعرائے اکبری نے اپنے دیوان خود اپنے ہاتھ سے لکھکر اس کتب خانہ میں داخل کئے تھے۔ دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی کتب خانہ کے ترقی یافتہ ہیں اکثر شعرا، خوش نویس، صناع، جنکو خانخاناں تربیت دینا چاہتا تھا کتبخانہ کے کام پر مقرر ہوتے تھے اور ترقی کرتے کرتے نادر روزگار ہوجاتے تھے۔"

عبدالرحیم خانخاناں نے اپنے کتب خانہ کی دیکھ بھال اور انتظام کے لئے بڑے بڑے ...باب علم و فن مقرر کئے تھے۔ ہندی کے بے نظیر شاعر شیخ عبدالسلام کتب خانہ کے داروغہ ...نتم) رہے۔ شجاع جو خط نسخ میں کمال رکھتا تھا کتب خانہ کا افسر مقرر ہوا۔ ان کے علاوہ ...سرے باکمال خوشنویس، مصور اور جلد ساز مثلاً ملا عبدالرحیم عنبریں قلم، مادھو، محمد امین ...مانی اور ملا محمد حسین وغیرہ کتب خانہ کے عملہ میں شامل تھے ملا محمد حسین کو جلد سازی اور ...سی کے فن میں کمال حاصل تھا اس نے بینتیس ۳۵ برس کتب خانے میں کام کیا تھا[۲] خانخاناں نے اپنے بیٹے ایرج کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اس کے اساتذہ میں مرزا خاں شیرازی کے علاوہ اور بڑے پایہ کے اُستاد تھے جو تینتیس ۳۳ سال تک احمد آباد کے مدرسہ[۳] اعلیٰ میں معلم رہے۔ ...یسے لائق و فائق بیٹے نے عبدالرحیم کے بعد ان کے کتب خانہ کو اور ترقی دی ہوگی۔

...الات شبلی ج ۴ ص ۲۰۷ ۔ [۲] خانخاناں کی زندگی کے حالات عبدالباقی کی مآثر رحیمی میں دیکھیے اسی کتاب کے مصور نسخے میں ...فاذ بیرم خاں کے وطن بدخشاں کے قریب) کے کتب خانہ کی تصویر ہے یہ ایک گول گنبد کے اندر ہے ...یں بہت سے چھوٹے چھوٹے طاق ہیں جن میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ کتب خانہ میں ایک شخص ...کو ہاتھ میں لئے ہوئے اسے بہ آواز بلند پڑھ رہا ہے اور دوسرے سن رہے ہیں خیال یہ ہے کہ کتب خانہ ...تابوں کی تعداد کم ہونے کے باعث ان سے استفادہ کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور الماریاں نہ ہونے ...سے کتابیں طاقوں میں رکھدی گئیں تھیں اس کتبخانے کی تفصیلات تاریخ تعلیم (ص ۲۰۳) میں ...ی ہیں [۳] مآثر رحیمی (عبدالباقی نہاوندی) ص ۸۰۴ بحوالہ تاریخ تعلیم ص ۲۰۳۔

چند مخصوص کتب خانے

کتب خانہ شاہ ولی اللہ یہ کتب خانہ دہلی میں ایک ایسا چراغ تھا جو اٹھارویں صدی کی تیرہ و تاریک فضاؤں میں بھی نہ صرف روشن رہا بلکہ اس سے بھی چراغ روشن ہوئے انگریزوں کی بربریت کے اس دور میں حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۲ء - ۱۷۶۲ء) نے مذہب اور علم کی جس شان و جرأت کے ساتھ خدمت کی وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے اپنے باپ حضرت شاہ عبدالرحیم کے "مدرسۂ رحیمیہ" کی علمی عظمت کو قائم رکھا اور درس و تدریس کی دولت سے طالبانِ علم کو مالا مال کر دیا۔ اسلامی تعلیم کے احیاء اور مسلمانوں کی فلاح و اصلاح کے لئے بڑی جد و جہد کی اور ان مقاصد کی تکمیل کی خاطر متعدد کتابیں بھی لکھیں جن میں ازالۃ الخفاء اور حجۃ اللہ البالغہ سب سے زیادہ مقبول ہوئیں۔

کتب خانہ شاہ عبدالعزیز حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ان کے عالی مرتبہ بیٹوں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی نے اپنے مقتدر باپ کے دینی، تدریسی اور تصنیفی کاموں کو جاری رکھا شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا ترجمہ آسان اور سادہ اردو میں کر کے قرآن کے مطالب کو عوام تک پہنچانے کا سامان فراہم کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز نے "سر الشہادتین، بوستان محدثین، تحفۂ اثنا عشریہ" جیسی کتابیں تصنیف کیں اور علم حدیث کی ترویج دل سے عمر بھر کرتے رہے ان چاروں بھائیوں کے کتب خانوں میں شاہ عبدالعزیز کا کتب خانہ بہت بڑا تھا لکھا ہے کہ اس میں[1] پندرہ بیس ہزار کتابیں تھیں اور ان سب کا آپ نے مطالعہ کیا تھا شاہ صاحب کی وفات (۱۸۲۳ء) پر مومن خاں دہلوی نے جو تاریخ کہی

---

[1] مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، حاشیہ ص ۳۲۔

یں آپ کی زندگی کی پوری تصویر پیش کر دی ہے سے

بیدادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے ٭ فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

خانہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی

جیسا نفیس کتب خانہ حضرت نظام الدین اولیاء کا تھا ایسا ہی حضرت کی خانقاہ کا کتب خانہ تھا کیونکہ وہ علوم باطنی و ظاہری کا ایک اہم مرکز تھی اس کے علاوہ ان کا ایک مدرسہ بھی تھا. خود ایک بلند پایہ عالم و مصنف تھے. شاہ صاحب کے کتب خانہ کے اعلیٰ ہونے کی شہادت کی خانقاہ دے رہی ہے جس کے متعلق لکھا ہے کہ "خانقاہ کیا تھی علم و معرفت، حکمت، احسان و سلوک، کا سرچشمہ تھی، ہزاروں تشنگانِ معرفت اپنی روحانی بجھانے کے لئے وہاں آتے تھے شائقین علم و فضل ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونا فخر و مباہات تصور کرتے تھے"۔

حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (متوفی ۱۷۲۹ء) چشتیہ سلسلہ کے نہایت ہی ممتاز تھے. ان کا مدرسہ دہلی میں جہاں تھا وہاں اس زمانہ میں دہلی کا سب سے بارونق بازار قائم" تھا. جامع مسجد اور لال قلعہ کی عالیشان عمارات کے درمیان شاہ صاحب سے واقع تھا وہ بازار تو نہیں رہا مگر یہ علاقہ دہلی میں اب بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے وسیع میدان ہے جس کے ایک جانب ایڈورڈ پارک ہے. یہاں ہی حضرت شاہ کلیم اللہ ہے جو دہلی کی مشہور زیارت گاہ ہے اسی کے قریب ہندوستان کی دو عظیم ہستیوں مولانا ...م اور مولانا شوکت علی کی آخری آرام گاہیں موجود ہیں۔

...ہ صاحب کی یادگار ان کی تصانیف اور ان کے مکتوبات ہیں. تصانیف کی تعداد بتیس ... ہے جن میں "کشکول کلیمی" نے سب سے زیادہ شہرت پائی ہے ان کے مکتوبات کا مجموعہ ...ت کلیمی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے. مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ...ب "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" (نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا) کے خدائی فرمان ...نے کی بڑی جدوجہد کرتے رہتے تھے وہ اپنے مکتوبات میں مریدین کو اعلائے کلمۃ الحق

...شائخ چشت از خلیق احمد نظامی ص ۳۶۸ ۔ سورت ۳ - آیت ۱۱۰

کی ہدایات ان الفاظ میں فرماتے تھے۔"اپنے جان و مال کو اسی کام میں صرف کردو۔ دینی
فیض دنیا کو پہنچاؤ اپنا عیش و آرام اور راحت انسانوں پر فدا کردو[۱]"

کتب خانہ شاہ فخرالدین

اس دور ابتلاء و مصیبت میں اس کتب خانہ نے بھی بڑا فیض
اس کے مالک حضرت شاہ فخرالدین (متوفی ۱۷۸۵ء) بڑے خدا
بزرگ اور صاحب درس عالم تھے۔ اجمیری دروازے کے مدرسہ
درس دیا کرتے تھے بقول مصنف مشائخ چشت"اس مدرسہ میں دور دور سے طلبا
تھے اکثر مشہور مریدین آپ کے مدرسہ کے طلبا ہی تھے[۲]"۔ اسی مصنف نے یہ بھی لکھا ہے
صاحب نے نہایت اعلیٰ علمی ذوق پایا تھا۔ بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا کتا
حاصل کرنے اور جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ حد یہ تھی کہ اگر قرض سے بھی ہاتھ آجاتی تھیں
لیتے تھے آپ کا نہایت عمدہ کتب خانہ تھا[۳]"

شاہ صاحب کے شوق مطالعہ کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ"کوئی نہ کوئی کتاب
سامنے رہتی تھی، کبھی حدیث بیان فرماتے، کبھی عوارف المعارف سناتے۔ فوائد
(حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات) سے تو اتنا عشق تھا کہ ہر وقت سینے
رہتی تھی" انھیں تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا وہ تین کتابوں (نظام العقا
رسالہ مرجیہ اور فخر الحسن) کے مصنف تھے۔

حضرت کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا حال 'مناقب فخریہ'[۴] اور 'فخر الطالب
مذکور ہے ان کے اخلاق حمیدہ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی ا
کتب خانہ سے چرائی ہوئی کتابیں فروخت کرنے کے لئے ان ہی کی خدمت میں آتا تو کبھی
یہ نہ پوچھتے کہ یہ کتاب تمھیں کہاں سے ملی۔ اس خوش اخلاقی کی وجہ سے لوگ ان کے گرد
شاہ صاحب کے مریدین کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا سرسید نے لکھا ہے" جتنے

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۰۹۔ [۲] و [۳] تاریخ مشائخ چشت ص ۴۷۷۔ ۴۷۸۔

[۴] ان دونوں کتابوں کے علاوہ یہ مضمون بھی لائق ذکر ہے۔ حضرت شاہ فخرالدین دہلوی
خلیق احمد نظامی (رسالہ برہان دہلی فروری ۱۹۴۷ء)

اقتدار اور سلطان عہد تھے آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاکِ در کو آبرو اور آپ ہی کے غبار آستاں کو تاج عزت و اعتبار سمجھتے تھے۔" اکبر ثانی" بادشاہ اور شاہ ظفر کو بھی آپ سے بڑی گہری عقیدت تھی. چنانچہ ظفر کے کلام میں یہ عقیدت جھلک رہی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھکو جو کچھ ہوں سو ہوں

لیکن اپنے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

کتب خانہ مدرسہ ضیاء العلوم

حضرت شاہ فخر الدینؒ نے اپنے مریدوں کی ایسی اصلاح و تربیت فرمائی تھی کہ وہ ان کے نقش قدم پر بڑے خلوص کے ساتھ چلا کرتے تھے اسی اتباع کی نشانی یہ مدرسہ اور کتب خانہ ہے۔ حضرت کے ایک مرید مولانا ضیاء الدین نے جے پور میں قائم کیا تھا۔ وہ اپنے پیر و مرشد کے حکم سے وہاں ارشاد و تلقین کا کام کرنے گئے تھے انھوں نے یہ خدمات اس خوبی سے انجام دیں کہ ان کا عمل ثوابِ جاریہ ثابت ہوا تاریخ مشائخ چشت میں ہے کہ "آج تک ان کا قائم کیا ہوا "مدرسہ ضیاء العلوم" کے نام سے جاری ہے اس مدرسہ کے کتب خانہ میں حدیث کی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے"۔

کتب خانہ مفتی صدر الدین

مرحوم دہلی کے صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ (متوفی ۱۸۶۸ء) کا کتب خانہ تین لاکھ روپیہ کی مالیت کا تھا۔ آزردہ نہایت ذی علم انسان اور مقتدر شاعر تھے. تین زبانوں (اردو، فارسی اور عربی) میں شعر کہتے تھے آزردہ تخلص کرتے تھے درس و تدریس میں بھی مشغول رہتے تھے نواب یوسف علی خاں (والی رام پور) نواب صدیق حسن خاں (رئیس بھوپال) اور سر سید ان کے شاگردوں میں تھے ان کے مدرسہ کی نسبت لکھا ہے کہ "شاہجہانی مدرسہ دار البقاء کو مفتی صاحب نے دوبارہ مرمت کرا کر آباد کیا۔ خود درس دیتے اور تمام اخراجات کے کفیل تھے"۔

آثار الصنادید ص ۳۲ بحوالہ مشائخ چشت ص ۵۰۲۔

مشائخ چشت ص ۵۲۶۔

مفتی صاحب کے مدرسہ کی وجہ سے ان کے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد بہ
گئی تھی لیکن یہ نفیس کتب خانہ بھی غدر میں نہ بچ سکا۔ مفتی صاحب پر غدر کے فتوی پر
کرنے کے اتہام میں مقدمہ چلایا گیا۔ جائداد ضبط ہوگئی چند ماہ کی نظر بندی کے بعد وہ
ہو گئے مگر انکی نایاب و نادر کتابوں کو رہائی نہ ملی۔

کتب خانہ رخشاں عجب اتفاق ہے کہ رخشاں کے زمانہ میں مغل سلطنت کی شوکت و عظمت تو بالکل سرد پڑ گئی تھی مگر دلی میں شعر و شاعری او
ادب کی محفلیں گرم تھیں اور یہ شہر شیخ نصیر، مومن، غالب، ذوق جیسے شعرائے کامل
بنا ہوا تھا ان فضلائے روزگار کے کتب خانوں میں غالب کے محبوب شاگرد نواب ضیا
خاں رئیس لوہارو (متوفی ۱۸۸۳ء) کا کتب خانہ نہایت نفیس تھا اس سے مشہور مو
الیٹ نے اپنی انگریزی کتاب تاریخ ہندوستان کی تیاری میں بڑی مدد لی تھی۔ نواب صا
شاعری اور فن نقادی میں نہایت بلند درجہ تھا۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص
انھوں نے اپنی علمی اور دنیوی وجاہت کی وجہ سے تاریخ اور شعر و شاعری کی بہت سی
جمع کرلی تھیں جن میں اکبر کے رضاعی بھائی مرزا عزیز کوکہ کے کتب خانے کا ایک مخطوطہ (ح
ناصر خسرو بلخی کے سفرنامہ کا قلمی نسخہ) بھی تھا جس پر مرزا کی ایک قلمی سطر موجود ہے یہ
ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں ہے۔

کتب خانہ دلّی کالج اس کالج نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور جدید علوم و فنون کی اشاعت میں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں ان میں
کے کتب خانہ کا بھی بڑا حصہ رہا جب ۱۸۴۲ء میں کالج کے ساتھ ایک علمی انجمن" ورنہ
ٹرانسلیشن سوسائٹی[1] قائم ہوئی اور سائنس، ہیئت، جغرافیہ اور ریاضیات کی کتابیں
کا جامہ پہن کر یہاں سے نکلنے لگیں تو کالج اور اسکے کتب خانہ کی اہمیت و افادیت بہت بڑھ
یہ کالج "دلی کالج"[1] کے نام سے ۱۸۲۵ء میں "مدرسہ غازی الدین" کی عمارت
گیٹ دہلی) میں کھولا گیا تھا جسے عالمگیر اور بہادر شاہ اول کے ایک علم دوست امیر

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "مرحوم دلی کالج" از مولوی عبدالحق۔

غازی الدین (متوفی ۱۷۰۱ء) نے تعمیر کرایا تھا یہ ۱۸۵۷ء کے بعد "اینگلو عربک کالج" کہلایا لیکن آزادی کے بعد پھر اپنے قدیم نام "دلی کالج" سے موسوم ہو گیا اور آج کل دہلی کی مشہور درس گاہوں میں شمار ہوتا ہے۔

یہاں ۱۸۲۸ء میں انگریزی کلاسیں کھول دی گئیں۔ کالج کے پرنسپل تو اُس زمانہ میں انگریز رہے مگر یہاں کے اساتذہ میں مشرقی علوم کے عالم و فاضل حضرات شامل تھے ان میں مولانا امام بخش صہبائی[۱] اور ماسٹر رام چندر بہت مشہور ہوئے اول الذکر فارسی اور عربی کے زبردست عالم اور محقق تھے کئی کتابیں لکھیں۔ سرسید کو "آثار الصنادید" لکھنے میں بڑی مدد دی انھوں نے شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا عربی سے اردو میں ترجمہ کر کے فن بلاغت کی ایک مستند کتاب کا اس زبان میں اضافہ کر دیا۔ اس جید عالم کو انگریزوں نے بغاوت کے الزام میں پھانسی کر قتل کر دیا تھا۔

جہاں تک ماسٹر رام چندر کا تعلق ہے انھوں نے ایک پندرہ روزہ باتصویر علمی تاریخی اخبار بھی جاری کیا تھا۔ ماسٹر صاحب کی "اصول علم ہیئت، عجائب روزگار اور تذکرۃ الکاملین"، نے کافی شہرت پائی۔ ان کی ذات سے اردو کو جو فائدہ پہنچا اس کا اندازہ اس تحریر سے ہو جائیگا کہ "انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جن لوگوں نے اپنی انتھک کوششوں سے زمین اُردو کو آسمان کا ہم پلہ بنا دیا ان کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو ماسٹر رام چندر کا نام سرفہرست ہوگا"[۲]

اُردو ادب کے کئی اکابر نے اسی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ، ان بزرگوں میں آخر الذکر کی ۱۴۳ تصانیف تاریخ، جغرافیہ، طبعیات، ہیئت، سیاسات، ریاضیات، علم و ادب اور علم اخلاق پر مشتمل تھیں، انھوں

---

[۱] صہبائی کو سرسید سے اتنی محبت تھی کہ جب وہ آثار الصنادید (دہلی کی قدیم عمارات اور وہاں کے مشاہیر وغیرہ سے متعلق کتاب) لکھنے کے دوران قطب صاحب کی لاٹ کے کتبے پڑھنے کے لئے گھنٹوں چھینکوں میں لٹکے رہتے تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ [۲] ہندوستانی اخبار نویسی از محمد عتیق صدیقی ص ۲۳۱

نے بے شمار مضامین بھی لکھے ان کا ایک مضمون "کتب کا مطالعہ (بیکن کے ایک انگریزی
مضمون کا ترجمہ) بیکن اور مولوی صاحب کے علمی مرتبہ کی نشاندہی کر رہا ہے۔ مولوی صاحب
کی تصانیف اور ان کے مضامین کی کثرت دیکھ کر مولانا الطاف حسین حالی نے ایک بڑا مزیدار
فقرہ کہہ دیا تھا کہ "مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیئے کی دوکان ہے جس میں ہر قسم کی
جنس رہتی ہے"۔ مختصر یہ کہ دلی کالج کے اساتذہ اور طلباء کی تصانیف وغیرہ سے دو بڑے بڑے
فائدے ہوئے ایک یہ کہ اردو زبان کا دائرہ وسیع ہو گیا اور وہ علمی زبان کا روپ اختیار کرنے
لگی۔ دوسرا فائدہ یہ پہنچا کہ درس و تدریس کے نصاب اور کتب خانوں کے ذخائر کو مستند سرمایہ مل گیا۔

مدارس کی کثرت

اسے یاد رکھیئے کہ یہ ادارے جس زمانہ میں تھے وہ عالمگیر کے بعد اور
غدر سے پہلے کا پرآشوب زمانہ تھا مغل سلطنت کے زوال، ۱۷۵۷ء
کی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست اور ۱۷۹۹ء کی جنگ میسور میں سلطان ٹیپو
کی ناکامی نے مسلمانوں کو بڑا ہراساں و پریشاں کر دیا تھا اس پر مستزاد یہ کہ انگریز، مرہٹے، سکھ
اور جاٹ انھیں تباہ و برباد کر دینا چاہتے تھے اور ان کی زندگیاں ہر وقت خطرے میں گھری
رہتی تھیں مگر نیرنگیٔ زمانہ دیکھیئے کہ اس تاریک دور میں ایسے یگانہ روزگار علماء و فضلاء اور
شعرا دہلی میں موجود تھے جنھوں نے مدرسوں، کتب خانوں اور شعر و شاعری کی شکل میں علم
و ادب کی شمعیں روشن کر دی تھیں۔ بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ "دہلی میں جس طرف نکل
جائیے مدارس نظر آئیں گے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگا"۔ اسلامی کتب خانوں
اور مدرسوں کی تاریخ کا سب سے اہم باب یہ ہے کہ مسلم حکومت کے دور زوال میں بھی ان اداروں
کی کثرت رہی اور ان کی ترقیاں عوام کے ہاتھوں ہوتی رہیں۔ مشائخ چشت (ص ۲۴۴) میں ہے:

> "اورنگ زیب کی وفات سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک ان مدرسوں سے علم و عرفان
> کے چشمے اُبلتے تھے یوں تو دہلی میں سینکڑوں درس گاہیں تھیں۔ لیکن ان تینوں
> مدرسوں کو امتیازی شان حاصل تھی۔ "مدرسۂ رحیمیہ" میں شاہ ولی اللہؒ مسندِ
> درس پر متمکن نظر آتے تھے تو بازارِ خانم کے مدرسہ میں شاہ کلیم اللہ کے جانشین
> اجمیری دروازے کے مدرسہ میں شاہ فخر الدین کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا

مسلمانوں کی دینی زندگی سنوارنے میں ان مدرسوں کا خاص حصہ تھا مدرسہ رحیمیہ سے علوم اسلامی کو زندہ کرنے کی عظیم الشان تحریک اٹھی آج ہندوستان میں علوم دینی کی جتنی درس گاہیں ہیں وہ سب مدرسہ رحیمیہ کے چشمۂ فیض کا نتیجہ ہیں جب مسلمانوں کی دینی زندگی بے روح ہو رہی تھی تو اسی مدرسہ کے معلموں نے ان کے دینی احساس کو بیدار کرنے کی سعی کی شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ محمد اسمٰعیلؒ کے وعظ اسی مدرسہ میں ہوتے تھے۔"

کتب خانوں کی بربادی

یہ فیض رساں مدرسے اور کتب خانے بالآخر انقلابات و حوادثاتِ زمانہ کی نذر ہو گئے جس طرح بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کے مدرسے اور کتب خانے اپنی اپنی سلطنتوں کے ساتھ نیست و نابود ہوئے اسی طرح مغلوں اور دیگر مسلم حکومتوں کے یہ ادارے بھی انکے ساتھ فنا ہوتے چلے گئے۔

بے شمار کتابیں ضائع ہو گئیں

عالمگیر کے بعد سلطنت مغلیہ کا ایسا انحطاط ہوا کہ اس کے جانشین صرف نام کے بادشاہ رہ گئے جو فکرِ فردا سے بے نیاز ہو کر اپنے شب و روز عیش و عشرت اور شعر و شاعری کی دنیا میں گذارتے تھے اور ذہنی و سیاسی پستی کا یہ عالم تھا کہ حملہ آوروں کی نقل و حرکت کی خبر سن کر بزم عیش و طرب منعقد ہو جاتی تھی۔ اصل میں قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ

"شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رُباب آخر"

غرض شاہانِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ان کے کتب خانوں کی رونق بھی ماند پڑ گئی اور ان کی بربادی کے سامان فراہم ہونے لگے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے جب دہلی میں خون ریزی اور غارت گری کی تو وہ تخت طاؤس اور کوہ نور کے ساتھ ہندوستان کی معنوی دولت یعنی کتب خانوں کے بہترین نوادر بھی ایران لے گیا۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی کو لوٹا۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں اور قرآن کے بہت سے نسخے اور بہت سی نادر کتابیں بھی کتب خانہ شاہی سے لوٹیں اور ۱۸۵۷ء کی

خوں ریزیوں کے ساتھ جو غارت گری ہوئی اس میں بے شمار کتابیں ضائع ہوگئیں۔ دہلی کے کتب خانوں کی جیسی بربادی ہوئی اس کی ایک جھلک شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ دہلوی کی اس تحریر میں دیکھئے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں[1]۔

"بارہ بجے کالج کے کتب خانے لٹنے شروع ہوئے لٹیرے عربی، فارسی اردو وغیرہ کی کتابوں کے گٹھر باندھ کر کتب فروشوں، مولویوں اور طالب علموں کے پاس بیچنے کے لئے لے گئے۔ بعض طلبا بھی کتابوں کے شوقین خود شریک ہو کر اچھی اچھی کتابیں لے گئے، لوگوں نے کتابوں کے اچھے اچھے پٹھے اتار لئے کہ جلد سازوں کے ہاتھ بیچیں گے باقی کو پھاڑ کر پھینک دیا اور احاطہ میں کئی انچ موٹا فرش ردی کا بچھا دیا غرض کالج میں سوائے ردی کے کچھ نہ تھا۔"

اس طرح دہلی کے کتب خانے لوٹے اور جلائے گئے، جو کتابیں بچ رہیں وہ کوڑیوں کے مول بکیں کچھ انگلستان وغیرہ بھیج دی گئیں۔ مغلوں کے علاوہ سلطان ٹیپو وغیرہ کے کتب خانوں کی بہت سی کتابیں انگلستان بھیجی گئی تھیں۔ ان کو جب علامہ اقبال نے یورپ میں دیکھا تو فرمایا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی۔
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد دہلی میں ہزاروں مسلمان قتل ہوئے اور ہزاروں کتابیں برباد ہوئیں۔ دہلی کے صدر الصدور مفتی صدرالدین اور محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر کے قیمتی کتب خانے بھی اسی زمانہ میں برباد ہوئے۔ عجب طوائف الملوکی کا عالم تھا آئے دن قتل و غارتگری کا بازار گرم رہتا تھا اور آزادیٔ ہند کے شیدائی غدار اور باغی قرار دے کر پھانسیوں پر لٹکائے اور گولیوں کا نشانہ بنائے جا رہے تھے غرض شاہجہاں اور عالمگیر کی دہلی کو بقول میر تقی میر فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا تھا۔ علم کے اس معدن اور سخنورانِ باکمال کے اس مسکن کی بدحالی کا ماتم حالی نے اس طرح کیا ہے ؎

---

[1] تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند۔ ص ۶۲۶

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ؛ نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک ؛ دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

بہت سی کتابیں منتشر ہوگئیں

جو کتابیں دست برُد زمانہ سے محفوظ رہ گئیں وہ اس طرح منتشر ہوگئیں جیسے مالا کے ٹوٹنے سے دانے بکھر جاتے ہیں ان سب کے ذکر کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے تاہم چند کتابوں کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے پہلے اکبر کے رتن فیضی کے کتب خانہ کی کتاب "موارد الکلم" ملاحظہ کیجئے جو نہ معلوم کہاں کہاں ہوتی ہوئی برلن کے کتب خانہ میں پہنچ گئی ہے۔ موارد الکلم کا یہ نسخہ فیضی نے مولانا صدر الدین شیرازی کو پیش کیا تھا اس کے سرورق پر فیضی نے اپنے قلم سے یہ عبارت[1] لکھی ہے۔

"جعلت ھٰذہ الرسالۃ تذکرۃ للاخ الاعزالاجل صاحب النثر الفائق والنظم الرائق الغابر بالسلوک الحقیقی والمجازی مولانا صدر الدین محمد الشیرازی سلمہ اللہ وابقاہ نمقہ العبد ابو الفیض فیضی فی ربیع الاول لازال مخضراً کاول الربیع سنۃ ثمان وثمانین وتسع مائۃ"

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے۔

"صنفہ العبد الاقل ابو الفیض فیضی أفاض اللہ علیہ فیوضہٗ"

علامہ فیضی کے کتب خانہ کی ایک کتاب "تاریخ گزیدہ" سرسید کے ذاتی کتب خانہ میں تھی جواب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اس پر فیضی کے دستخط، مہر اور اس کے ہاتھ کی یہ تحریر ہے۔ مالک ھذا التاریخ النجیب العجیب بالھبۃ الصحیحۃ الصریحۃ ابو الفیض فیضی

بعض علم دوست حضرات کے پاس بھی مغل عہد کی کتابیں موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ہمایوں کے کتب خانہ کا ایک قرآن مجید[2] ڈاکٹر محمد یار خاں جے پوری کے پاس

[1] فیضی کی دو تحریریں از ڈاکٹر مختار الدین احمد رسالہ "آجکل" دہلی اکتوبر ۱۹۵۶ء [2] روداد کل راجستان اردو کانفرنس جے پور مرتبہ احترام الدین احمد شاغل ص۔ ۱۰۲

ہے شہنشاہ ہمایوں کی اس پر مہر ہے اس کا ہر ورق مُطلّا اور دیدہ زیب ہے اور باوجود سینکڑوں برس گذر جانے کے اُس کی آب و تاب قائم ہے۔ جے پور میں احترام الدین احمد شاغل کے پاس "دیوانِ فیضی"[1] کا ایک مُطلّا نسخہ ہے جس پر اکبر کے کتب خانہ میں رہنے کا نوٹ درج ہے۔ مولوی منظر علیم مرحوم (سفیر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ) نے الذہبی کی "الکاشف"[2] کا نسخہ ڈھاکہ میں دیکھا تھا جس کی کتابت ۹۴۷ھ میں خط کوفی میں ہوئی تھی۔ ایک نسخہ "منطق الشفا"[3] ابن سینا ۱۰۹۷ھ کا مکتوبہ عالمگیری کتب خانہ کا تھا کمیلا (مشرقی بنگال) کے ایک رئیس حسام حیدر نے "قرآن مجید"[4] کا ایک نسخہ مولوی منظر علیم کو دکھایا یہ خاص داراشکوہ کی تلاوت میں رہتا تھا۔ اس پر اس کی مہر موجود ہے۔ نواب صاحب نے اسے ایک یورپین لیڈی سے لیا تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ اس مُذہّب و مُطلّا نسخہ کی آب و تاب کا یہ عالم تھا کہ اس کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔

---
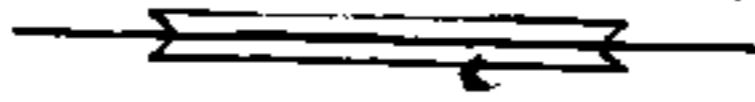
[1] روداد کل راجستان اردو کانوکیشن جے پور مرتبہ احترام الدین احمد شاغل ص ۱۰۲۔

[2] [3] [4] سفرنامہ منظری بحوالہ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ ص ۴۷۔

دکنی سلطنتیں اور کتب خانے

سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے جہاں کہیں اپنی آزاد سلطنتیں قائم کیں وہاں بھی کتب خانوں کا قیام عمل میں آیا اور علم وفن نے فروغ پایا۔ چودھویں صدی عیسوی میں دہلی سلطنت کے جو چند صوبے خود مختار بن بیٹھے تھے ان میں پہلے صوبہ دکن کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں بہمنی اور دوسری سلطنتیں ۳۰۰ برس تک علم وادب کی خدمت اور سرپرستی کرتی رہیں اس طویل مدت میں علم وفن کی ترویج واشاعت جن ذرائع سے کی گئی ان میں کتب خانوں کو اتنا اہم مقام حاصل ہے کہ ان کا ذکر دکن کی پہلی خود مختار سلطنت بہمنی میں ہی ملتا ہے۔

بہمنی سلطنت
۱۳۴۷ - ۱۵۲۷ء

یہ سلطنت ۱۳۴۷ء میں قائم ہوئی اور گلبرگہ اس کا پایہ تخت قرار پایا پھر احمد شاہ بہمنی نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنا دارالخلافہ بنایا اس سلطنت کا بانی علاؤالدین حسن بہمن شاہ علم دوست بادشاہ تھا اس نے مدرسے قائم کئے جن کے اساتذہ اور طلباء کو وظیفہ دئے جاتے تھے "علاؤالدین کا کتب خانہ" اتنی اعلیٰ کتابوں سے پُر تھا کہ عہد تغلق کے ایک مورخ عصامی[1] نے فتوح السلاطین[2] لکھتے وقت اس سے استفادہ[3] کیا تھا اس کتب خانہ کو بہمن شاہ[4] کے جانشین ترقی دیتے رہے۔ ان میں سے اکثر ذی علم اور کتابوں کے شائق تھے۔ مثلاً محمود شاہ (۱۳۷۸ - ۱۳۹۷ء) کو اس کے تبحر علمی اور تدبر کے باعث "ارسطو زماں[5]" کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس نے اہل علم

[1] عصامی حسب بیان نصیر الدین ہاشمی محمد تغلق سے ناراض ہو کر دکن آ گئے تھے۔ [2] یہ تاریخ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے بہمن شاہ کے عہد تک ہے [3] آب کوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ ص ۴۹۔

[4] سلاطین بہمنی کے حالات "برہان المآثر (علی بن عزیز اللہ طباطبائی) میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

[5] فرشتہ جلد دویم ص ۳۴۹ - ۳۵۰ بحوالہ تاریخ تعلیم ص ۱۲۰۔

کی بڑی قدردانی کی، مدرسے قائم کیے اور یتیموں کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی اس کے عہد میں عرب اور ایران وغیرہ سے جو علما گلبرگہ آئے انھیں اکرام وانعام سے نوازا۔ اس کے بعد فیروز شاہ بھی بڑا علم پرور بادشاہ ہوا۔ تفسیر، حدیث فقہ اور دیگر علوم پر کافی عبور تھا کئی زبانوں کا بھی ماہر تھا اس کے مذہبی اور علمی ذوق وشوق کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ ہر چوتھے روز کاروبار مملکت شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کے سولہ صفحہ نقل کرتا تھا اس کے بعد کوئی اور کام کرتا تھا" اس نے ہفتہ میں تین دن طلباء کو درس دینے کے لئے بھی مقرر کر رکھے تھے۔

ایسے علم دوست بادشاہوں کے عہد میں دکنی اردو خوب پھولی پھلی، کتابوں کا سرمایہ جمع ہوا اور کتب خانوں کی ایسی ترقی ہوئی کہ شاہانِ بہمنی کا ایک "کتب خانہ"[1] احمد نگر میں بھی تھا جسے مورخ ابوالقاسم (مصنف تاریخ فرشتہ) نے دیکھا تھا۔

تصنیفات وتالیفات اسے یاد رکھیئے کہ اردو میں تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغاز بھی بہمنی دور میں ہوا اور اس کی ابتداء صوفیائے کرام[2] کی ان کتابوں سے ہوئی جو انھوں نے تبلیغ دین کی خاطر لکھی تھیں اس سلسلہ میں پہلا نام ایک بلند پایہ صوفی شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۱۳۹۳ء) کا آتا ہے جو سلطان محمد تغلق کے دور میں دولت آباد آئے اور کئی بہمنی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا انھوں نے فارسی میں کتابیں لکھنے کے علاوہ دکنی اردو میں بھی مذہبی مسائل سے متعلق چند رسائل لکھے جن میں کے تین رسالے سینٹ[3] جارج کالج کے کتب خانہ میں ہیں۔

ایک اور ممتاز شیخ طریقت حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ حضرت سید محمد گیسو دراز (متوفی ۱۴۲۲ء) دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو پانچ[5] بتائی جاتی ہے ان میں "معراج العاشقین" اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اسے اردو نثر کی وہ قدیم ترین کتاب کہا جاتا ہے جو شائع ہو کر عہد حاضر تک پہنچی ہے۔ دکنی اردو میں

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۲۹۷ بحوالہ تاریخ تعلیم ص ۱۳۱
[2] تفصیل کے لئے دیکھیے "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (مولوی عبدالحق)۔
[3] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری (ارباب نثر اردو، سید محمد۔ ص۔ ۴)

لکھی ہوئی یہ کتاب بھی مذہبی احکام و مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔

خواجہ صاحب کے نواسے سید عبداللہ حسینی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے رسالہ "نشاط العشق" کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا اور شرح لکھی جس کا ایک نسخہ سلطان ٹیپو کے کتب خانہ میں تھا۔ بہمنی عہد کی ایک کتاب مشکوٰۃ المصابیح، مسلم یونیورسٹی لائبریری کے حبیب گنج کلیکشن میں محفوظ ہے اسے محمود شاہ بہمنی (متوفی ۱۵۱۷ء) کی خدمت میں نذر کیا گیا تھا۔

مدرسہ احمد شاہ بہمنی یہ مدرسہ سلطان احمد شاہ بہمنی نے حضرت خواجہ گیسو دراز کے لئے تعمیر کرایا تھا جن سے اس کو بڑی عقیدت تھی۔ غور کیجئے کہ وہ درس گاہ کتنی بلند پایہ ہوگی جس کے معلم حضرت جیسی اعلیٰ شخصیت ہوں ان کا علم و فضل اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اتنا بلند مرتبہ تھا کہ انھیں چشتیہ سلسلہ کا "سلطان القلم" کہا گیا ہے۔ درس و تدریس ان کے پروگرام کا خاص جز تھا وہ نماز ظہر کے بعد طلباء اور مریدوں کو علم تصوف اور حدیث وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ان تدریسی کاموں کے لئے انھوں نے بہترین کتابیں جمع کر لی ہوں گی چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "خواجہ گیسو دراز کا کتب خانہ" دکن کے کتب خانوں میں نہایت ممتاز تھا۔

کتب خانہ درگاہ خواجہ گیسو دراز اور آج گلبرگہ میں حضرت کا مقدس مقبرہ علم اور کتابوں کا مرکز و مخزن بنا ہوا ہے ان کی عالی شان درگاہ کے ساتھ ایک کتب خانہ اور ایک مدرسہ منسلک ہے۔ کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون بالخصوص مذہب اور تصوف کی کتابیں موجود ہیں جن سے بہ آسانی استفادہ کیا جا سکتا ہے اس مدرسہ میں دینی اور دنیوی علوم کی تعلیم دیجاتی ہے۔

مدارس بہمنی سلطنت کے مدارس کا ذکر پڑھتے وقت درس گاہی کتب خانے بھی تصور میں آجاتے ہیں اس سلسلہ میں محمد شاہ بہمنی (ارسطو زماں) خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے

---

[۱] مقالات شروانی ص ۴۰۹ [۲] تاریخ تعلیم ص ۱۱۳ [۳] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج ۶۰ ص ۲۵۶ [۴] [۵] آب کوثر (شیخ محمد اکرام ص ۴۲۲)۔

گلبرگہ بیدر، اور دولت آباد وغیرہ میں مدارس قائم کئے تھے اور ان کے اخراجات کے لئے اوقاف مقرر کر دیئے تھے۔ اس بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یتیموں کی تعلیم کا خاص اہتمام کرتا تھا ان کے لیئے اس نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا اور پڑھانے کے لئے قابل اساتذہ مقرر کئے تھے۔ یہاں یتیم بچوں کے قیام اور طعام کا بھی انتظام تھا مدرسے کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔[۱]

کتب خانہ محمود گاوان بہمنی خاندان کے علم نواز بادشاہوں کے عہد میں کتب خانوں کی جو ترقیاں ہوئیں اس کے ثبوت میں محمد شاہ کے وزیر محمود گاوان کے کتب خانہ کا ذکر کر دینا کافی ہے جس میں پینتیس ہزار کتابیں تھیں غور کیجئے جب ایک وزیر کے کتب خانہ میں اتنی کثیر کتابیں تھیں تو پھر بہمنی بادشاہوں کے کتب خانوں میں تو اس سے کہیں زیادہ کتابیں ہوں گی۔

خواجہ جہاں المعروف بہ محمود گاوان کا شمار چوٹی کے علماء میں ہوتا تھا وہ نظم و نثر لکھنے میں بڑا ماہر تھا اس کے مکتوبات کا مجموعہ "ریاض الانشاء" کا ایک قلمی نسخہ جو ہر میوزیم اٹاوہ میں رہنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں آگیا ہے۔ یہ نسخہ محمود گاوان کی شہادت کے سترہ سال بعد لکھا گیا تھا۔[۲]

مدرسۂ بیدر بیدر میں محمود گاوان نے ایک نہایت عالی شان مدرسہ قائم کیا تھا اور اساتذہ و طلباء کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی کھولا تھا جس میں تین ہزار کتابیں جمع تھیں۔ یہ مدرسہ اس عہد کا ایک بے نظیر مدرسہ تھا۔ مولوی ابوالحسنات کا بیان ہے کہ "تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ عظیم الشان اور وسیع سلسلہ عمارت درس گاہ کے لئے کبھی اور کسی دور میں نہیں بنا۔" لیکن افسوس کہ اس علم دوست وزیر کو بادشاہ نے ۱۴۸۱ء میں قتل کرا دیا۔ اس کے ۴۶ سال بعد بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد پانچ نئی خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں جن میں گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین نے نہایت شاندار علمی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

---

[۱] تاریخ تعلیم ص ۱۱۸ ۔ [۲] تذکرۂ جواہر زواہر ص ۱۶۵

اور کتب خانہ بیدر۔ ۱۴۶۹ء

قطب شاہی سلطنت
۱۴۹۰ — ۱۶۹۰ء
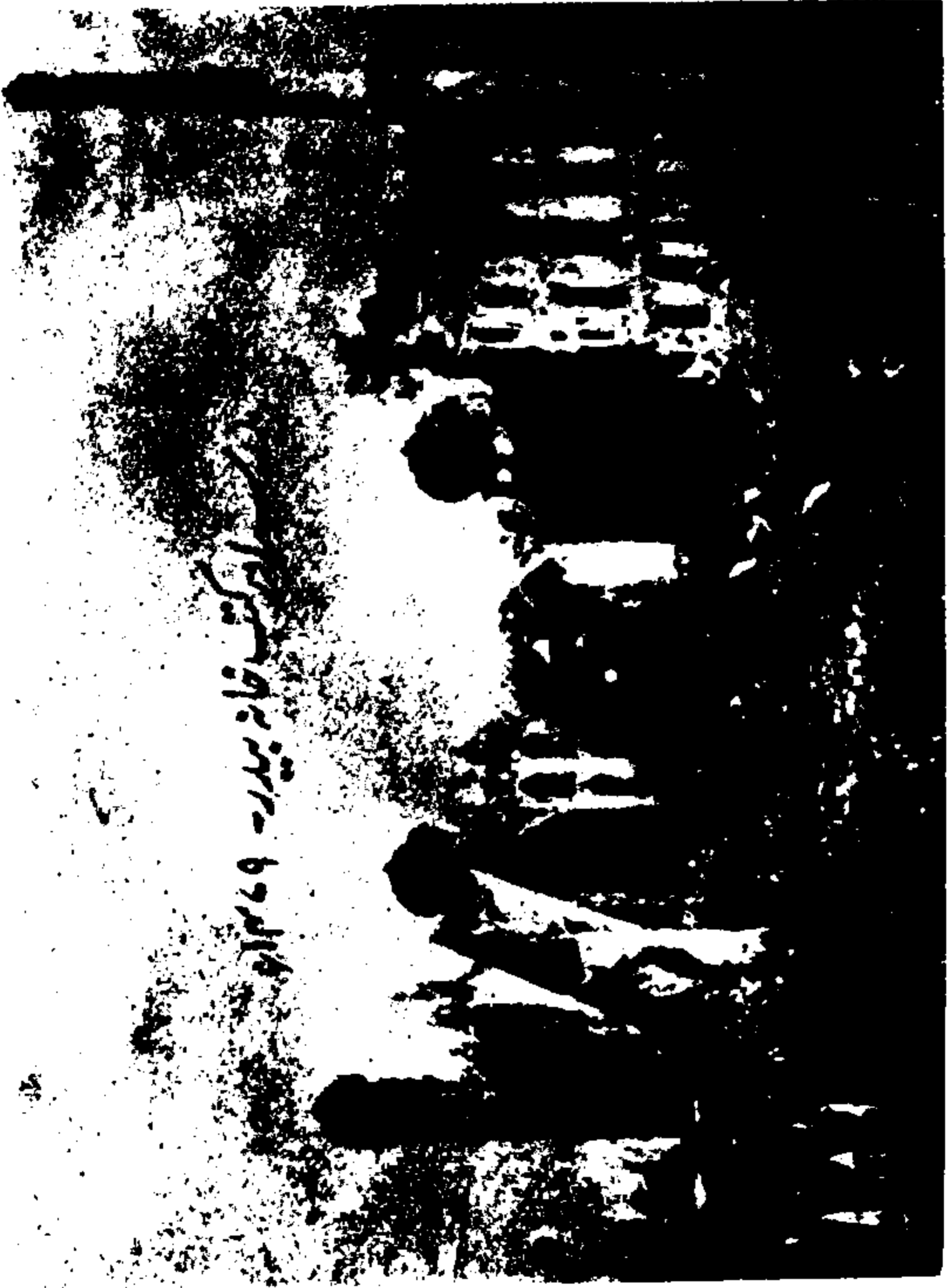
اس سلطنت کے بادشاہ علم وادب کی سرپرستی کے لئے مشہور رہیں ان کے عہد میں بھی بہترین کتابیں تصنیف ہوئیں اور نہایت اعلیٰ کتب خانے قائم ہوئے۔

کتب خانہ گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ نے اپنے دارالخلافہ میں یہ کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ، قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اپنے مذاق کے مطابق شعر وادب کی نفیس کتابیں جمع کرتے رہے۔ یہ تینوں بادشاہ شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے خصوصاً محمد قلی قطب شاہ بڑے پایہ کا شاعر اور بہت اچھا خوشنویس تھا۔ اس کی کلیات پچاس ہزار فارسی اور دکنی اشعار پر مشتمل ہے جس میں سارے اصنافِ سخن مثنویاں، قصیدے، مرثیے، غزل، اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی "کلیات" اور ملا وجہی کی "سب رس" نظم ونثر کی یہ دو کتابیں قطب شاہی دور کی شاہکار کہی جاتی ہیں۔ اس عہد کے شاعروں میں ابن نشاطی، غواصی، جنیدی اور تحسین الدین بھی بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

سب رس اس موقع پر "سب رس" کا مختصر تعارف کرا دینا ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ اردو نثر کی تاریخ ارتقا میں ایک سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے اس سے پہلے جو کتابیں وغیرہ لکھی گئیں ان کا موضوع مذہب وتصوف تھا لیکن سب رنگ میں مذہبی موضوعات سے ہٹ کر تصوف کے مسائل کو ایک تمثیلی قصہ کی شکل میں مقفیٰ اور مسجع عبارت میں پیش کیا گیا ہے بقول مولوی عبدالحق "سب رنگ" اردو نثر میں پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے" اسے قطب شاہی دور کے مشہور شاعر اور ادیب ملا وجہی نے ۱۶۳۵ء میں لکھا تھا اس کی یہ چند سطور پڑھیئے تا کہ سترھویں صدی عیسوی کی نثر کا رنگ ڈھنگ معلوم ہو جائے۔

قطب شاہی سلاطین کے حالات، ان کتابوں میں بھی درج ہیں" تاریخ سلطان محمد قطب شاہ" (ملا عبد اللہ) "حدیقۃ السلاطین" (ملا نظام الدین احمد شیرازی) "تاریخ ظفرہ" (لالہ گردھاری لال احقر) یہ کتاب مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ کے شائع کرائی تھی۔

عابد کوں کیا نسبت جو عاشق کی بات میں آکر دخل کرے، جیوں اپنے کام میں خلل کیا، تیوں دوسرے کے کام میں خلل کرے، عاشق بلند، عابد پست عابد ہوشیار عاشق مست، عابد دین خاطر جنم کھویا ہے، عاشق خدا خاطر دین و دنیا تی ہاتھ دھویا ہے اس بات کا کون پایا کھوج کہاں گنگا تیلی کہاں راجہ بھوج"

مدارس قطب شاہی سلطنت میں مدارس کی کثرت کی وجہ سے کتب خانوں کی بھی کثرت ہو گئی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس خاندان کے سلاطین نے اپنے دار الخلافہ گولکنڈہ اور دیگر شہروں میں بکثرت مدارس قائم کرائے۔ بڑے بڑے مدرسوں کے علاوہ بیشمار مکتب بھی تھے جن میں فارسی زبان کے علاوہ وہ مقامی زبانوں کی تعلیم بھی دیجاتی تھی مسلم طالب علموں کو قرآن مجید بھی پڑھایا جاتا تھا۔ مورخ شابرل (SHOBERL) نے لکھا ہے[1]

"ان مدارس میں لڑکے آلتی پالتی مارکر بنچ یا چٹائی پر بیٹھتے تھے سرکنڈے یا واسطین قلم سے کاغذ پر لکھتے تھے۔ کاغذ زیادہ تر چین سے درآمد کیا جاتا تھا لیکن وہ یورپی کاغذ کے مقابلہ میں اچھا نہ ہوتا تھا۔ یورپ کا کاغذ صاف اور پتلا تھا۔"

مدرسۂ چارمینار سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ - ۱۶۱۱ء) نے حیدر آباد بسایا تھا وہاں چارمینار کی بلند و بالا شاندار عمارات تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے اس میں ایک نہایت عالی شان مدرسہ تھا یہ ظاہر ہے کہ اس کتب خانہ بھی مدرسہ کی شان ہی کے مطابق ہوگا۔

پانچ مشائخ کرام۔ جن مشائخ[2] نے دکنی زبان میں نظم و نثر کی مذہبی کتابیں لکھ کر اردو زبان

---

[1] لا کی انگریزی کتاب پروموشن آف لرنگ ان انڈیا۔ ص ۹۶ [2] ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔ میراں جی خدانما کی شرح تمہیدات عین القضاۃ، رسالۂ وجودیہ اور بشارت الانوار۔ میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا (مصنفہ برہان الدین اورنگ آبادی) کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا۔ میراں جی شمس العشاق کی جل ترنگ، گل باس، شرح مرغوب القلوب اور شہادت الحقیقت، شاہ برہان الدین جانم کی بشارت الذکر، رمز الواصلین، وصیت الہادی اور ارشاد نامہ امین الدین اعلیٰ کی کلمۃ الاسرار کلمۃ التوحید اور گنج مخفی۔ یہ کتابیں آج بھی پاک و ہند کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ابتدائی نشوونما اور کتب خانوں کی ترقی میں حصہ لیا تھا ان میں میراجی خدا نما (متوفی ۱۰۶۹ھ)
عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں ملازم تھے مگر شاہ امین الدین اعلیٰ سے مرید ہو جانے کے
بعد ملازمت چھوڑ کر تبلیغی اور تصنیفی کاموں میں مشغول ہو گئے تھے ان کے بارے میں کہا گیا
ہے کہ "وہ اردو کے قدیم نثر نگاروں میں ہیں جنھوں نے اپنی کاوشوں سے اردو نثر کا معیار
قائم کیا"۔ ان کے مرید میراں یعقوب بھی بڑے پایہ کے صوفی اور مصنف تھے۔

جب شاہ امین الدین اعلیٰ کا ذکر آیا ہے تو ان کے دادا میراں جی شمس العشاق (متوفی
۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) کا ذکر بھی یہیں کر دینا مناسب ہوگا وہ پیدا تو مکہ معظمہ میں ہوئے تھے مگر بیجاپور آکر
وطن اختیار کر لیا تھا ان کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم بھی اپنے باپ کی طرح بلند پایہ
صوفی اور مصنف ہوئے۔ میراں جی کے خاندان کی نسبت بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے
"اسی خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اس قدر فروغ ہوا اور وہاں ایسے ایسے خوش بیان
بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے"۔

کتابیں جو محفوظ رہ گئیں قطب شاہی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد اس عہد کے کتب خانے
ایسے برباد ہوئے کہ تاریخ میں ان کا نام و نشان بڑی مشکل سے ملتا
ہے۔ لیکن اُن کا پتہ اس عہد کی وہ کتابیں بتا رہی ہیں جنھیں اب تک
زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رکھا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ کے "دیوان" کا ایک
بہترین نسخہ قطب شاہی کتب خانہ کا حیدرآباد کے "کتب خانہ آصفیہ" میں موجود ہے
خدا بخش لائبریری بانکی پور میں "دیوان حافظ" کا ایک نسخہ سلطان محمد قطب شاہ کے شاہی
کتب خانہ کا ہے اور سلطان محمد قطب شاہ کے ہاتھ کی تحریر اس پر ثبت ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ نسخہ حیدرآباد دکن میں سلطان کے لئے محمد محسن نے ۱۰۲۳ھ میں لکھا تھا اس
کا پہلا صفحہ بڑا مرصع ہے اور اس پر نیلی زمین میں طلا کاری کی گئی ہے جس کاغذ پر یہ لکھا گیا
ہے اس کا رنگ گہرا بادامی ہے۔ عنوان سفید سے، سرخی سے اور سونے سے لکھے گئے ہیں

[1] تاریخ زبان اردو از حکیم سید شمس اللہ قادری ص ۵۹۔
[2] اس کی تفصیلات "ایک مشرقی کتب خانہ" سے لی گئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بھی دکن کے قطب شاہی خاندان پر فتح پانے کے بعد اورنگ زیب
کے قبضہ میں آیا تھا" جہانگیر نامہ" (نسخہ خدابخش لائبریری) پر اورنگ زیب کے سب سے
بڑے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت درج ہے کہ یہ کتاب شہزادہ
محمد سلطان کے قبضہ میں گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے کتب خانہ سے آئی تھی۔
مخطوطہ ۱۰۲۰ھ کا مکتوبہ ہے اور اس پر سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ
قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں۔[1]

قطب شاہی کتب خانوں کی یہ دو کتابیں جے پور میں ہیں "خمسہ نظامی"[2] اور جواہر التفسیر
اول الذکر پر سلطان قطب شاہ کی مہر کے علاوہ کفایت اللہ کے نام کی بھی چار مہریں ہیں
میں ۱۱۱۷ھ کی مہر ہے جس پر حافظ محمد محسن بندۂ عالمگیر ثبت ہے۔ جواہر التفسیر (مصنفہ ملا حسین
واعظ کاشفی) پر سلطان عبداللہ قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کی مہریں ہیں۔

مثنوی "مجمع البحرین" کا یہ نسخہ بھی دیکھئے جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے
حبیب گنج کلیکشن میں ہے اس پر سلطان محمد قطب شاہ، محمد ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ
کی مہریں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان تینوں سلاطین کے کتب خانوں میں رہ چکی
یہ ہیں وہ کتابیں جو کئی صدیوں سے برابر قطب شاہی کتب خانوں کی آئینہ داری کر رہی ہیں۔

عادل شاہی سلطنت
۱۴۹۰ — ۱۶۸۶ء

اس سلطنت کے فرماں رواؤں نے علم و فن کی ایسی فیاضی کے ساتھ
سرپرستی کی کہ ان کے دامن دولت سے ابوالقاسم فرشتہ، نورالدین
ظہوری، مُلا ملک قمی، نصرتی، ہاشمی، اور ملک خوشنود جیسے اہل
علم و ادب وابستہ ہو گئے اور ان کی وجہ سے کتب خانے بھی خوب چمکے۔ دارالخلافہ "بیجاپور"

[1] روداد کل راجستھان اردو کنونشن (منعقدہ ۲۹-۳۰-۳۱ مارچ ۱۹۵۶ (بمقام جے پور) مرتبہ
احترام الدین احمد شاغل ص ۱۰۹، ۱۱۲۔

[2] خمسۂ نظامی کا اس سے بہتر نسخہ (مکتوبہ حسین عبداللہ ۸۶۳ھ مطابق ۱۴۶۸ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
لائبریری میں ہے اور اس سے بھی قدیم نسخہ (مکتوبہ ۷۱۱ھ) جواہر میوزیم اٹاوہ کی ملکیت میں تھا
اور اب مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔
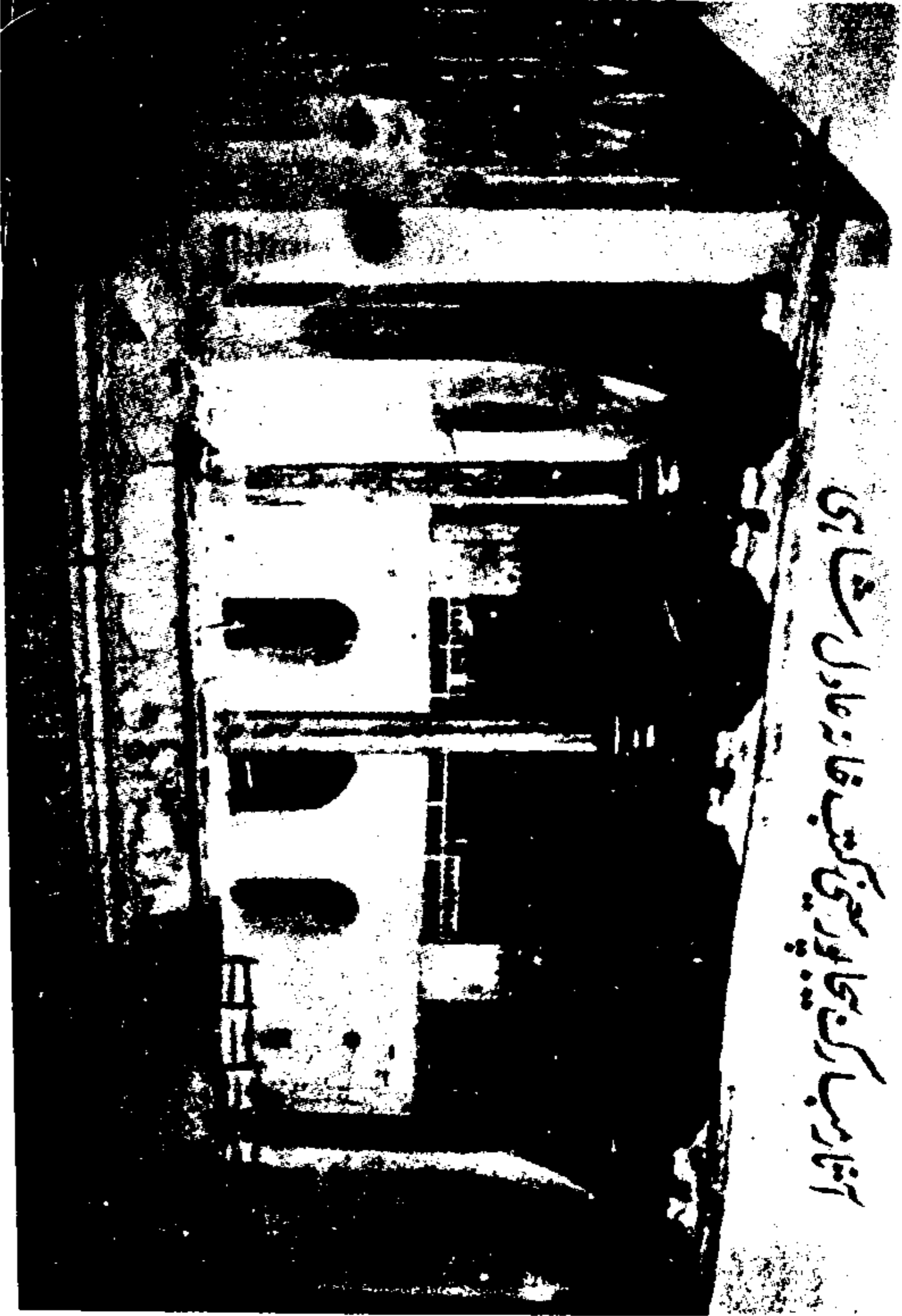
آثار مبارک بیجاپور یعنی کتب خانہ عادل شاہی

شاہی کتب خانہ کے علاوہ اور بھی کتب خانے تھے یہ کہا گیا ہے کہ تمام ممالک محروسہ کی مسجدوں میں مدرسے قائم تھے جن میں طلبار کے اخراجات کی کفالت حکومت کی طرف سے کیجاتی تھی۔

کتب خانہ عادل شاہی

یہ کتب خانہ عادل شاہی[1] سلطنت کی ایک بے نظیر یادگار ہے اس میں عربی، فارسی اور دکنی اردو وغیرہ کی بڑی نایاب کتابیں جمع تھیں اسے فرگوسن[2] نے دیکھا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے اس کتب خانہ کو تو علم و ثقافت کا ایک مرکز کہنا چاہیئے۔ کتابوں سے متعلق تمام امور (کتابت، نقاشی، مصوری اور جلد بندی وغیرہ) انجام دینے کے لئے ساٹھ[3] آدمی ملازم تھے۔ یہ کتب خانہ قائم ہوئے تقریباً پونے چار سو برس گذر گئے ہیں مگر اس کی کچھ کتابیں اب تک محفوظ ہیں۔

علی عادل شاہ کا ذوقِ کتب بینی

اس ذی علم بادشاہ کے ذوق کتب بینی کی یہ کیفیت تھی کہ سفر میں بھی کتابوں کے چار سو[4] صندوق اس کے ساتھ رہتے تھے اس کے عہد (۱۵۵۷ء-۱۵۸۰ء) میں علوم و فنون کی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ بہت سے علمار عرب، ایران اور عراق سے بیجاپور آئے اور یہ شہر علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ اس بادشاہ کے متعلق لکھا ہے کہ "اس کے دربار میں اکثر علمی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ درس و تدریس کے علاوہ اسلامی تبلیغ کا کام بھی جاری تھا ان علمار کی موجودگی کی وجہ سے عوام اور خواص کی ذہنی سطح بلند ہوتی گئی، بازاروں اور فقیروں کی خانقاہوں میں اردو کا چلن شروع[5] ہوگیا۔"

علی عادل شاہ کو علمی و ادبی ذوق اپنے باپ ابراہیم عادل شاہ سے ورثہ میں ملا تھا وہ علمار فضلار کی قدردانی اور سرپرستی بڑی فراخدلی سے کیا کرتا تھا اس کے عہد میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اردو (یعنی دکنی اردو) سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ خیال رہے کہ اس وقت تک شمالی ہندوستان میں سرکاری زبان فارسی تھی۔

---

[1] سلاطین عادل شاہی کے حالات "بساتین السلاطین" (محمد ابراہیم زبیری) میں دیکھئے [2] فرگوسن عمارات بیجاپور ص ۵۷، بحوالہ تاریخ تعلیم ص ۱۳۷۔

[3] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۲۰ ص ۱۶ [4] دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) ص ۱۷۷۔

[5] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج ۶۔ ص ۳۴۴۔

نورس اس کتاب کو عادل شاہی عہد کی ایک قیمتی یادگار کہیئے۔ اس میں ابراہیم عا
شاہ ثانی کا ذوقِ موسیقی آج تک جھلک رہا ہے وہ موسیقی کا صرف دلدا
ہی نہ تھا بلکہ اس فن میں اس کو اتنی زبردست مہارت تھی کہ لوگ اسے جگت گرو کہتے تھے۔ اس
نے فنِ موسیقی پر ہندی نظم میں کتاب نورس لکھی جس کے دس[1] نسخوں کا پتہ ڈاکٹر نذیر احمد کو ملا
ہے ان کی تحریر کے مطابق نسخہ مملوکہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن بہت قدیم اور مُطلاّ
مُذہب ہے سرورق کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۶۲۶ء) کے عہد میں موسیقی کے علاوہ دیگر علو
و فنون نے بھی ترقی پائی۔ اس کے دربار سے جو ارباب علم منسلک تھے ان میں ابوالقاسم
(مصنف تاریخ فرشتہ) اس لئے قابل ذکر ہے کہ اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے نام پر
گلشنِ ابراہیمی، لکھی جسے ہندوستان کی مستند تاریخ اور دکن کے حالات معلوم کرنے کا
ایک گراں بہا خزانہ کہا جاتا ہے۔

اب سلطنتِ عادل شاہی، قطب شاہی اور بہمنی کی علم پروری کی طویل داستان کو
مختصر کرتے ہوئے یہ کہا جارہا ہے کہ اس زمانہ میں علوم و فنون کی ترقیوں کے ساتھ ایک قابل ذ
کام یہ بھی ہوا کہ اردو سرکاری زبان بن گئی اور اس دور کے اہل علم اور اہل قلم کی بدولت کتب خان
کی بھی ترقی ہوئی ان میں دکنی نظم و نثر کا شاندار ذخیرہ جمع ہو گیا تھا اور مثنویوں کی تو کو
انتہا نہ تھی کیونکہ دکن میں شاعری کی اس صنف کو بڑا فروغ ملا۔ اس دور کے شاعروں میں شا
ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے مثنوی نہ لکھی ہو۔ ابن نشاطی کی ایک مثنوی "پھول بن"[2] ا
مرصّع ہے کہ علم معانی کے اصول کے موافق اس میں انتالیس قسم کی خوبیاں پیدا کی گئی ہیں
تحسین الدین کی مثنوی "کامروپ کلا" اتنے اعلیٰ پایہ کی مثنوی ہے کہ جرمن شاعر گوئٹے[3] نے
اسے بہت پسند کیا تھا۔ ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" ا

---

[1] ان کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو "کتاب نورس"، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد (پروفیسر فار
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) [2] یہ فارسی کتاب "بساتین" کا منظوم ترجمہ ہے

[3] اردو ادب کی تاریخ (نسیم قریشی) ص ۴۰ ۔

گلدستۂ عشق" ملک خوشنود کی مثنوی "ہشت بہشت[1]" اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

غرض دکن کے اہلِ قلم اپنی تصانیف سے کتب خانوں کی آبیاری کر رہے تھے کہ اورنگ زیب فتح و نصرت کا پرچم لہراتا ہوا دہلی سے دکن آ پہنچا اس نے ۱۶۸۶ء میں عادل شاہی اور ۱۶۹۰ء میں قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا مگر اپنی علم دوستی کی بنا پر اس نے ان کتب خانوں کی نادر اور بیش بہا کتابوں کو برباد نہیں کیا بلکہ ان میں کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے گیا کچھ کتابیں سلطان ٹیپو کے کتب خانہ اور دیگر کتب خانوں میں پہنچ گئیں۔ کتب خانہ عادل شاہی کا کچھ حصہ بیجاپور کے "آثار مبارک" میں اب تک محفوظ ہے۔

---

[1] یہ مثنوی حضرت امیر خسرو کی "ہشت بہشت" کا منظوم ترجمہ ہے۔

سلطنتِ خداداد

اس سلطنت کے حکمراں فتح علی معروف بہ ٹیپو کو خدا نے شجاعت و بہادری کے سا
علم دوستی کے جوہر بھی عطا کئے تھے۔ وہ ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا لیکن اجل نے اسے کل سترہ
(۱۷۸۳ء - ۱۷۹۹ء) حکومت کرنے کی مہلت دی اور اس زمانہ میں بھی وہ مبتلائے آلام رہا۔ ای
طرف انگریز اسے صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے دوسری طرف خود اس کے ملازم حق نمک
ادا کرنے کے بجائے اپنے ولی نعمت کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ ایسے سخت اور نازک د
میں بھی اس نے علم و فن کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ مدرسے کھولے کتب خانے قائم کئے اس
کے عہد کی عظیم الشان درس گاہ دار الخلافہ سرنگا پٹم کی یونیورسٹی "جمع الامور" تھی اس کے
علاوہ ایک "فوجی مدرسہ" بھی تھا جو فوجیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

کتب خانہ سلطان ٹیپو یہ کتب خانہ اس پر آشوب دور میں امن و سکون کا ایسا گہوارہ ت
کہ جب سلطان جنگ کی الجھنوں اور اپنے ساتھیوں کی کم ظرفی سے
کبیدہ خاطر ہونے لگتا تو وہ علم کے اس معبد میں آکر سکون قلب محسوس کرتا اور ٹیپو کی محبو
کتابیں اس کی سچی مونس و ہمدم ثابت ہوتیں۔ اس کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد دو ہزا
تھی۔ شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے کتب خانوں کے کچھ ذخائر بھی اس میں محفوظ تھے ادھو
کی فتح کے وقت جب سلطان نواب بسالت جنگ کا کتب خانہ ملا تو اس کی کتابیں بھی اس کتب خا
میں داخل ہو گئیں یہاں وہ کتابیں بھی داخل ہوتی رہتی تھیں جو وقتاً فوقتاً سلطان کی زیر سرپرستی لکھی جا
تھیں اس طرح جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں ان میں "مفرح القلوب" اور "تحفۃ المجاہد
قابل ذکر ہیں۔ تحفۃ المجاہدین کو فتح المجاہدین بھی کہتے ہیں اسے سلطان نے اپنے فوجی محکمہ کے
لئے لکھوایا تھا اس میں فوج کے لئے قواعد و ضوابط درج ہیں۔ اس کتاب پر حسب بیا
مصنف سلطنت خداداد سلطان کی مہر ثبت ہے اور ہر مضمون کے آخر میں اس کے دستخط ہیں۔

سلطان نے اپنے کتب خانہ کے لئے کتابوں کی فراہمی کا خاص اہتمام کیا تھا اس کی یہ تحریر ظاہر کرتی ہے کہ وہ یورپ تک سے کتابیں منگایا کرتا تھا۔ ۲۹ دسمبر ۱۷۸۶ء کو اس نے لکھا کہ "یورپ سے ایک کتاب ابھی آئی ہوئی ہے جس میں "آلہ مقیاس الحرارت" کے متعلق معلومات درج ہیں۔ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے حضوری میں پیش کیا جائے"۔[1]

کتابوں کی جلد بندی، کتابت اور نقاشی کا بھی اسے خاص خیال تھا اور اس سلسلہ میں وہ برابر ہدایتیں جاری کیا کرتا تھا۔ جلد ساز اپنے سلطان کی خوشنودی کی خاطر بہترین جلدیں باندھتے کتابوں کا حسن و وقار بڑھانے کے لئے اللہ، محمدؐ، علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کے نام لکھتے۔ جلد کے چار کونوں پر خلفائے اربعہ کے نام کندہ کرتے۔ بعض پر لفظ ٹیپو سلطان بھی منقش کر دیتے تھے۔ سلطانؒ کی شہادت کے بعد جب شاہی محلات کی تلاشی لی گئی تو بعض کتابیں ایسی بھی نکلیں جن کی جلدیں ہیرے اور جواہرات سے مرصع تھیں۔

تین خطوط کتب خانہ کے کاموں میں سلطان کی خصوصی توجہ کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی یہ تحریریں پڑھیئے۔ ۱۷ جولائی ۱۷۸۶ء کو اس نے لکھا تھا۔[2]

"کتاب فخر الشیوخ" ایک جلد بذریعہ ڈاک بھیجی جاتی ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ کاتبوں سے اس کتاب کی ۱۰ نقلیں نہایت خوشخط کرائی جائیں پھر آگے اور پیچھے پندرہ پندرہ سادہ ورق لگا کر جلد بندی کرائی جائے۔ تاکید ہے کہ یہ کام جلد کرا کر نقلیں یہاں حضوری میں بھیج دیں اور اپنے محکمہ کے رجسٹر میں اس امر کا اندراج کر لیا جائے چند دن پہلے تم کو یہاں سے کتابیں اور ایک فہرست بھیجی گئی تھی۔ فہرست کے مطابق جائزہ لیکر انھیں ہمارے کتب خانے میں داخل کر لیں اور اس محکمہ کے رجسٹر میں انکے نام درج کئے جائیں ان کتابوں میں سے سات کتابیں ہمارے پاس ہیں"۔

۱۷ اگست ۱۷۸۶ء کو سلطانؒ نے تحریر کیا تھا۔[3]

---

[1] تاریخ سلطنت خداداد از محمود خان محمود بنگلوری۔ ص ۳۲۹۔

[2] صحیفہ ٹیپو سلطان از محمود خان محمود بنگلوری حصہ اول ص ۳۶۹

[3] صحیفہ ٹیپو سلطان از محمود خان محمود بنگلوری حصہ دوم ص ۱۷۔

"حکم دیا جاتا ہے کہ کتاب" مفرح القلوب" کی دس نقلیں روانہ کیجائیں ان میں پانچ نقلیں مفصل ہوں ان کی جلدبندی کرتے ہوئے اوپر لکڑی قفل لگائے جائیں اور باقی پانچ نقلوں میں اس کتاب کا صرف اقتباس ہو ان پر قفل لگانے کی ضرورت نہیں"

سلطان ٹیپو کی لنسبت میجر اسٹورٹ نے لکھا ہے[1]

"کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کے لئے ایک مہتمم مقرر تھا. سلطان کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا. سلطان کے حکم اور فرمائش سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں. یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات سے متعلق ہیں، سلطان نے اپنے فرامین کے متعدد مجموعے تیار کرائے تھے جو اس وقت بھی یورپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں. سلطان جو کتاب مطالعہ کرچکتا تھا اس پر مہر لگا دیتا تھا اس طرح اکثر کتابوں پر مہر ثبت تھیں"

سلطان کی شہادت کے بعد اس کے کتب خانہ کا یہ حشر ہوا کہ سرنگا پٹم کی لوٹ غارتگری کے وقت سینکڑوں کتابیں تباہ و برباد ہوگئیں جو بچ رہیں ان کی کسی نے چ[illegible] برس تک خبر نہ لی اس کے بعد ان کی دیکھ بھال کرنل کرک پیاٹرک کے سپرد ہوئی پھر میج[illegible] اسٹورٹ نے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی جو ۱۸۰۸ء میں کیم[illegible] سے شائع ہوئی اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزوں نے ٹیپو کی علمی دول[illegible] کو ہندوستان میں رکھنا گوارا نہ کیا. چند کتابیں تو کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی بنگا[illegible] کو دے دیں باقی سب انگلستان بھیج دیں. سلطانی کتب خانہ کی جو کتابیں برباد ہو[illegible] سے بچ رہی تھیں ان میں ۷۸۶ کتابیں نہایت قیمتی بتائی جاتی ہیں جن کی فن وار تعداد یہ ہے[2]

قرآن	۴۴	تفسیریں	۴۱	کتب و وظائف	۳۵	کتب احادیث	۴۲	الہیات	[illegible]
تصوف	۵۶	علم الاخلاق	۲۴	فقہ	۹۵	آرٹس	۱۹	فلسفہ	[illegible]

[1] سلطنت خداداد ص ۵۹۴ [2] اس تعداد کو "تاریخ سلطنت خداداد" سے لیا گیا

نجوم	۲۰	ریاضی	۷	طب	۶۲	تحقیق زبان	۴۵	فرہنگ و لغات	۲۹
نظم کی کتابیں	۱۹	ہندی وغیرہ	۲۳	ہندی اور دکنی انشاء	۴	ترکی نثر	۴	قصص وحکایات	۱۸

لیکن مقام شکر ہے کہ سلطانی کتب خانہ کے قرآن مجید کا ایک نایاب نسخہ تباہی سے بچ گیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ خط نسخ کا اعلیٰ نمونہ اور جلد بندی کا بہترین شاہکار۔ جلد سازوں نے اسے طرح طرح سے سجایا ہے۔ نازک نازک طلائی پھولوں اور رنگ برنگ کے بیل بوٹوں نے اس کی تقدیس میں ایک دلکشی پیدا کر دی ہے، اس کی زیب و زینت پر نو سے ہزار روپیہ صرف ہوا تھا اسے سلطانی کتب خانہ کا ایک انمول موتی سمجھیے۔ صد حیف کہ بادِ مخالف کے جھونکوں نے اسے ہندوستان سے لندن پہنچا دیا اور اب وہاں ونڈسر کیسل (WINDSOR CASTLE) کے کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔[۱]

یہ کتابیں سلطان کے علمی ذوق کی روشن یادگاریں ہیں جنھیں دیکھ کر اس کی حب الوطنی اور علمی قابلیت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین یہ واقعہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ جب تک ٹیپو زندہ رہا انگریز ہندوستان میں اپنی سلطنت غیر مستقل اور ناپائدار سمجھتے رہے اور جس دن اس نے جامِ شہادت پی لیا جنرل ہارس پکار اٹھا "آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

جہاں تک ٹیپو کی علمی قابلیت کا تعلق ہے اس کے دشمن بھی اسے ایک بلند پایہ انشا پرداز تسلیم کرتے ہیں کیمبل نے لکھا ہے[۳] کہ "سلطان نہایت آسانی سے نثر و نظم لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک شان پائی جاتی ہے۔" کرنل کرک پیاٹرک نے کہا ہے[۴] کہ "سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی۔ اس قدر مختصر اور پُر معنی ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ سے کئی معنی نکلتے تھے تحریر کا وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے۔"

سلطان ٹیپو کے یہی وہ کارہائے نمایاں ہیں جن کا ذکر آج تک فخر و احترام کے ساتھ۔

---

[۱] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۲۲۔ ص ۴۔

سلطنت خداداد (محمود خاں محمود) ص ۴۹۲۔ ۴۹۳۔

کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی نے اسے خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "اس کے کار[نامے اور]
زندگی کی یاد دل کے اندر خوشی اور مسرّت کا طوفان پیدا کر دیتی ہے[۱۰]" علّامہ اقبال نے اس
عظیم شخصیت کو آبروئے ہند و چین و روم و شام قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے ؎

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ اُو در دکن باقی ہنوز

---

[۱۰] ٹیپو سلطان مرتبہ ایم عبداللہ بٹ ص ۸۵۔

چند دیگر علاقوں کے کتب خانے

کشمیر

کشمیر جنت نظیر میں جو کتب خانے مسلمانوں نے قائم کیے ان کا پہلا نقش حضرت بلبل شاہ یا بلال شاہ کی خانقاہ میں ملتا ہے۔ ان بزرگ کا اصلی نام شرف الدین سید عبد الرحمن ترکستانی تھا اور انھیں کشمیر میں اسلام کا پہلا کامیاب مبلغ کہا جاتا ہے ان ہی کی توجہ سے ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں کشمیر کا راجہ رنجن دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ اور سلطان صدر الدین[1] کا لقب اختیار کر کے کشمیر کا پہلا مسلم بادشاہ بنا۔ اسی نے آپ کے لئے ایک خانقاہ اور ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی تھی۔ گو اس خانقاہ کے مدرسہ اور کتب خانے کا ذکر نہیں ملتا لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت نے ان دس ہزار آدمیوں کے لئے جو آپ کے روحانی فیض سے مسلمان ہوئے تھے تعلیم اور کتابوں کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ لہذا یہ قیاس کر لینا بجا ہوگا کہ اس خانقاہ سے متعلق ایک مدرسہ بھی تھا اور کتب خانہ بھی۔ حضرت بلبل شاہ اہل کشمیر کو رشد و ہدایت سے فیضیاب کرنے کے بعد ۷۲۷ھ (۱۳۲۶ء) میں انتقال فرما گئے۔ ایک شاعر نے سال وفات کا یہ قطعہ کہا ہے ؎

سال تاریخ وصل بلبل شاہ   بلبل قدس گفت ' خاص اللہ '
۷۲۷ھ

کتب خانہ سید ہمدانی امیر کبیر سید ہمدانی جیسے عالم فاضل شخص کا یہ کتب خانہ ان ہی کے مرتبہ کے مطابق تھا اس کے تحویلدار[2] آپ کے خلیفہ

---

[1] صدر الدین کے بعد میر شاہ نے ۷۴۲ھ (۱۳۴۲ء) میں سلطان شمس الدین کا نام اختیار کر کے عنان حکومت سنبھالی اس کا خاندان "شاہ میری" کہلایا جو ۱۵۶۱ء تک حکومت کرتا رہا اس کے بعد چک خاندان نے ۱۵۸۹ء تک حکومت کی اسی سال اکبر نے کشمیر فتح کر لیا۔ [2] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۴۳۲۔

محمد کاظم (سید قاضی) تھے۔ سید ہمدانی بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں وہ چودھویں صد
عیسوی میں ایران سے کشمیر تشریف لائے اور اپنی مساعی جمیلہ سے ۳۷ ہزار کشمیریوں کو
مسلمان کیا۔ کشمیر میں ان کی خانقاہ اشاعت اسلام اور اشاعت علم کا سب سے بڑ
مرکز تھی۔ انھوں نے متعدد کتابیں بھی لکھیں جن میں "مجمع الاحادیث"، شرح فصوص الحکم
اور ذخیرۃ الملوک" مشہور ہیں۔ سید ہمدانی کی وفات (۱۳۸۴ء) کے بعد ان کے صاحبزا
میر محمد ہمدانی کشمیر آئے اور اپنے سینکڑوں رفقاء کی مدد سے سارے کشمیر کی مذہبی او
علمی زندگی کو متاثر کر دیا جس کی وجہ سے علم کی اشاعت اور زیادہ ہوئی اور کشمیر کے
کونے کونے میں کتب خانے پھیل گئے۔

سلاطین کشمیر اور کتب خانے

سلاطین کشمیر نے بھی مدرسے اور کتب خانے قائم کر کے ہر شخص کو
علم سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔ ان سلاطین نے علم و فن کی حم
اعلیٰ پیمانہ پر سرپرستی کی اور اس مد پر جو بے دریغ روپیہ صرف کیا
اس کا ذکر صوفی کی تاریخ کشمیر[۱] اور دوسری کتابوں[۲] میں وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے مگر
کتب خانوں کے ذکر میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے گذشتہ صفحات میں متعدد جگہ کہ
جا چکا ہے کہ اس زمانہ میں ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی ہوتا تھا اس لئے یہ کہنا حقیقت
کے خلاف نہ ہوگا کہ سلاطین کشمیر کے قائم کئے ہوئے مدارس سے بھی کتب خانے ملحق تھے ا
میں مندرجہ ذیل ممتاز مدارس کے کتب خانے بھی نہایت ممتاز تھے۔

تین ممتاز مدارس

جو مدارس میری خاندان کے سلطان شہاب الدین نے قرآن وحد
کی ترویج واشاعت کے لئے قائم کئے تھے ان میں "مدرستہ القرآ
نہایت ممتاز تھا ایک نومسلم کشمیری ابوالمشائخ شیخ سلیمان اسی مدرسہ سے تعلیم پا کر م
قاری بنے اور رام القرٰی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ شہاب الدین نے ۱۳۷۶ء میں انتقال ک
اس کے بعد قطب الدین تخت نشین ہوا اس کے دور حکومت میں قطب الدین کالج اس عہ

---

[۱] ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کی انگریزی کتاب موسومہ کشمیر (ہسٹری آف کشمیر)۔
[۲] "واقعات کشمیر" (ملا محمد اعظم)

بہترین کالج تھا جو سکھوں کے عہد تک جاری رہا وہ کشمیر کی تعلیمی تاریخ کا ایک نشان منزل تھا یہ پہلی اقامتی درس گاہ تھی جو کشمیر میں قائم ہوئی تھی۔

سلطان سکندر، بت شکن (متوفی ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء) کے عہد میں ایک مدرسہ ایسا اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اسے ایک دارالعلوم کہنا چاہیئے جہاں عراق و خراسان تک سے علماء و فضلا آیا کرتے تھے ایک نہایت جید عالم قاضی میر محمد علی بخاری اس کے پرنسپل تھے۔ اُستادوں میں محمد افضل بخاری ملا محمد یوسف، ملا صدرالدین کاشی اور سید حسین منطقی علی الترتیب حدیث، فلسفہ، ریاضی اور منطق و مابعدالطبیعات کا درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کے ساتھ سلطان نے ایک بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرایا تھا جس کے مصارف کیلئے اس نے ایک وقف قائم کر دیا تھا۔

بڈشاہ ان تعلیمی ترقیوں کے ساتھ کشمیر میں کتب خانوں کا دائرہ بھی بڑھتا رہا یہاں تک کہ سلطان زین العابدین المعروف بہ بڈشاہ تخت نشین ہوا یہ بڑا صاحب علم بادشاہ تھا کشمیری، فارسی، عربی، ہندی، تبتی اور سنسکرت میں اسے مہارت حاصل تھی اس کا دربار ارباب علم و فن کا مرجع بنا ہوا تھا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ایک ضابطہ قانون بنایا اور خاص خاص قوانین پیتل کی پتریوں پر کندہ کروا کر مختلف شہروں اور دیہات میں لگوا دیئے تھے۔

بڈشاہ اپنی علم دوستی اور رعایا پروری کی وجہ سے کشمیر کا اکبر کہلاتا تھا اس کے عہد (۸۲۶ھ/۱۴۲۲ء — ۸۷۶ھ/۱۴۷۰ء) میں علم و ادب اور صنعت و حرفت کی جو ترقیاں ہوئیں ان سے کشمیری کتب خانوں کو بڑا فروغ ملا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بڈشاہ کے پاس تحفوں میں کتابیں بھی آیا کرتی تھیں اور وہ بھی اپنے گماشتے کتابوں کی فراہمی کے لئے دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجا کرتا تھا۔

بڈشاہ کا کتب خانہ اس بادشاہ کے عہد میں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں خود بڈشاہ کا کتب خانہ نہایت نفیس اور وسیع تھا۔ اس کے بارے میں مورخین کہتے ہیں کہ اس کا شمار

بڈشاہ کے دربار کے مسلم اور ہندو فضلاء کے حالات ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کی انگریزی کتاب "کشیر" کی جلد ایک ص ۱۶۲ پر درج ہیں۔

دنیا کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا تھا اس کی افادیت کا دائرہ بھی نہایت وسیع تھا
دارالعلوم نوشہرہ کے اساتذہ اور طلباء بھی اس سے استفادہ کر سکتے تھے اس کتب خانہ کے
سلسلہ میں یہ یاد رکھیئے کہ بڈشاہ کے ساتھ یہ فنا نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد بھی ایک عرصہ
تک قائم رہا اور بعض اقوال کے مطابق اس کا فیض سو برس تک جاری رہا۔

دارالعلوم نوشہرہ عہد بڈشاہ کی درس گاہوں میں یہ دارالعلوم نہایت ممتاز تھا
سلطان نے اس کے اخراجات کے لئے کئی گاؤں کی آمدنی وقف کردی
تھی اور درس و تدریس کے لئے نہایت لائق و فائق اساتذہ مقرر کئے تھے۔ دارالعلوم کے
مہتمم اعلیٰ ملا کبیر نحوی تھے۔ اساتذہ میں ملا احمد کشمیری، ملا حافظ بغدادی، ملا پارسا بخاری
ملا جمال الدین خوارزمی، میر علی بخاری اور ملا یوسف رشیدی جیسے ممتاز علماء و فضلا شامل تھے

مدرسہ سیر اس زمانہ کا ایک اور مدرسہ بھی قابل ذکر ہے جسے بڈشاہ نے اسلام آباد
کے قریب "سیر" میں قائم کیا تھا اس مدرسہ کو علم و فضل کا بہت بڑا
مرکز کہا جاتا ہے اس کے مدرس اعلیٰ ملا غازی خاں تھے۔

تصنیفات و تالیفات بڈشاہ نے تاریخ نویسی اور تراجم کے محکمے بھی قائم کئے جن سے
کتب خانوں کی ترقی میں اور مدد ملی۔ اس محکمہ کی سرپرستی میں بہت سی
کتابیں تصنیف و تالیف کی گئیں مثلاً دارالترجمہ کے افسر اتھا سومہ نے کشمیری زبان میں بڈشاہ
کی سوانح "جینا چرت" لکھی۔ بوذی بھاٹ نے موسیقی کی ایک کتاب لکھ کر سلطان کے نام معنون
کی۔ ملا احمد کشمیری نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا اور تاریخ "وقائع کشمیر" لکھی، شری
نے جامی کی یوسف زلیخا کا فارسی سے سنسکرت میں ترجمہ کیا اور اس کا "کتھا کوتوکا" نام رکھا
کشمیر کی مشہور تاریخ "راج ترنگینی" کشمیری زبان میں لکھی گئی جس کا فارسی میں ترجمہ ملا احمد
کشمیری نے کیا اور اس کا بحر الاسمار نام رکھا۔ جب اکبر کشمیر گیا تو یہ کتاب اکبر کی خدمت
میں پیش ہوئی اس نے دوبارہ فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا چنانچہ مولانا شاہ محمد شاہ
آبادی نے اس کا ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کا انتخاب ملا عبدالقادر بدایونی نے کیا۔

چک سلاطین کے تین مشہور مدارس ان سلاطین کے عہد میں بھی کتب خانے ترقی کرتے رہے اور

انہ میں اشاعت تعلیم کا جوش و خروش اتنا پھیل گیا تھا کہ سلطان حسن شاہ کی ماں گل خاتون
بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس سلطان کے عہد میں ایک "مدرسہ دار الشفا" تھا حسن شاہ
اپنے قائم کئے ہوئے مدرسوں میں اس مدرسہ سے اتنا لگاؤ تھا کہ اس نے اپنے روحانی پیشوا
خ الاسلام بابا اسمٰعیل کبروی کو اس کا صدر مقرر کیا تھا۔ اس سلطان کا جانشین حسین شاہ
مدارس قائم کرنے میں اپنے پیشروں سے پیچھے نہیں رہا۔ اس کے قائم کئے ہوئے مدرسہ موسومہ
مدرسہ حسین شاہ" کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مدرسہ تھا جس کے ساتھ ایک کتب خانہ
ی منسلک تھا۔ مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبا مفت رہتے تھے۔ مدرسہ کے اخراجات
ر کتب خانہ کی توسیع و ترقی کے لئے سلطان نے کئی گاؤں کی آمدنی وقف کر دی تھی۔ اس
رسے کے معلمین اور منتظمین شیخ فتح اللہ حقانی اور اخوند ملا درویش کی سرپرستی
نگرانی میں تعلیم و تدریس کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ یہاں سے شیخ حمزہ مخدوم جیسے
علم درویش تعلیم پا کر نکلے تھے۔

شمیر پر مغلوں کا قبضہ جب ۱۵۸۷ء میں اکبر نے کشمیر فتح کر لیا تو مغلوں کے حسن مذاق نے اس جنت ارضی کو مدرسوں، کتب خانوں اور باغوں
آراستہ و پیراستہ کر دیا ان کے عہد میں نسیم باغ، شالامار باغ اور نشاط باغ کے ساتھ
وفضل کے ایسے روح افزا چرچے ملتے ہیں جن کے ذکر سے آج بھی شعر و ادب اور کتابی ذوق
کی تقویت ملتی ہے۔ اکبری عہد میں جب حسین خاں کشمیر کا صوبہ دار ہوا تو اس نے کشمیر
ئی مدرسے کھولے۔ جہانگیری دور میں علامہ ملا حیدر نے "درس گاہ ملا حیدری" قائم کی
جہانی عہد میں خواجہ اخوند محمود نقشبندی نے "مدرسہ خواجگان نقشبندی" قائم کیا ان
رس کے کتب خانوں کے ساتھ یہ یاد رکھیئے کہ اکبری دور میں یہاں چھاپہ خانہ قائم ہو جانے
کتب خانوں کی ترقی کے لئے راہیں فراخ ہو گئی تھیں۔

مالوہ

شب مالوہ کا ذکر تو آج بھی بڑے مزے لے کر کیا جاتا ہے مگر یہاں کے مدر
اور کتب خانوں کا کوئی نام بھی نہیں لیتا حالانکہ ان ہی کی بدولت یہ خطہ شیراز و سمر ق
ہمسر بن گیا تھا۔ مالوہ میں دلاور خاں غوری نے ۱۴۰۱ء میں خود مختار حکومت قا
اس کے جانشین ہوشنگ نے مانڈو (شادی آباد) کو پایہ تخت بنایا یہاں ایک شاند
تعمیر کرائی اور مدرسہ قائم کیا لیکن سلطان محمود خلجی اور اس کے بیٹے سلطان غیا
خلجی کے زمانہ میں تعلیمی ترقیوں کے باعث بہت سے کتب خانے موجود ہونیکے امکانات پل
سلطان محمود خلجی (۱۴۳۶ - ۱۴۶۹ء) بڑا علم دوست بادشاہ تھا اس نے ک
مدارس و مکاتب قائم کرائے جن میں شادی آباد (مانڈو) اور سارنگ پور کے مدر
مشہور تھے۔ شادی آباد کے عظیم الشان مدرسہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ جامع م
ہوشنگ شاہی کے مقابل تھا۔ غرض سلطان کی علم نوازی کے اثر سے بقول مولوی ال
ندوی "ملک میں علم و فن کی یہ گرم بازاری ہوئی کہ ملک مالوہ یونانِ ثانی کہلانے لگا"
سلطان غیاث الدین (متوفی ۱۵۰۰ء) کے قائم کئے ہوئے مدارس میں مدر
نعلچہ اور مدارس نسوان نے خاص شہرت پائی اس سلطان نے تعلیم نسواں کی طرف
طور پر توجہ کی تھی۔ اس کے محلات میں بقول مورخ فرشتہ ایک ہزار عورتیں حافظ ق
مذہبی تعلیم کے علاوہ اس نے عورتوں کو مختلف ہنر مخمل بافی، خیاطی اور کوزہ گر

لہ حوالوں میں جہاں مولوی صاحب کا نام آئے وہاں ان کی کتاب "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں"
یہ کتاب اور این۔ این لا کی انگریزی کتاب "پروموشن آف لرننگ انڈر دی محمڈن ر
سولہ سترہ سال قبل راقم کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں۔ اس زمانہ میں یہ خاکسار علی گڑھ مسلم یونی
منسلک تھا۔ جب کراچی میں زیر نظر کتاب کے ضمن میں ان دونوں کتابوں کی ضرورت

[کت]ھانے کا خاص اہتمام کیا تھا انھیں حکیم، مفتی اور مدرس کے عہدوں پر مقرر کیا جاتا تھا یہ [با]دشاہ انسانی ترقی کی تکمیل کیلئے عورتوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا نہایت ضروری سمجھتا تھا۔

صوبہ مالوہ میں اُجین بھی اتنا اہم تعلیمی مرکز تھا کہ وہاں کے مدرسہ

[ا]یک عالیشان مدرسہ کو ایک عالیشان مدرسہ کہا گیا ہے جس کی عمارت انیسویں صدی [تک] باقی تھی لیکن اس مدرسہ کے کتب خانہ کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ایسا [عم]دہ مدرسہ کتابوں کی سہولتوں سے کیسے محروم رہ سکتا ہے۔

مالوہ ۱۵۳۱ء میں سلاطین خلجی کے قبضہ سے نکل گیا اور گجرات کے بادشاہ سلطان بہادر شاہ نے اس پر قبضہ کر کے اسے گجرات میں شامل کر لیا اس کے بعد وہ ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے قبضہ میں بھی رہا۔ پھر ۱۵۶۰ء میں اکبر کی سلطنت میں شامل ہوجانے کے بعد مالوہ میں کتب خانوں کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔

گجرات

کتب خانوں کے اعتبار سے قرونِ وسطیٰ کے گجرات کو بڑی فضیلت حاصل تھی یہاں کتب خانوں اور مدرسوں کے قیام کی ابتدا علاؤالدین خلجی کی فتح گجرات سے ۲۵۹ برس پہلے ایک بزرگ باوا ریحان کے ہاتھوں ہوچکی تھی۔ جو اشاعت اسلام کی خاطر چالیس فقراء کے ساتھ بغداد سے بھروچ آئے تھے۔ انھوں نے ۴۳۰ھ (۱۰۳۸ء) میں یہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر کی تھی۔ ظاہر ہے کہ موصوف نے درس و تدریس کی خاطر کتابوں کا کچھ ذخیرہ بھی جمع کیا ہوگا جسے گجرات کے کتب خانوں کی بنیاد کہا جاسکتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کی تعمیر و ترقی میں ان بزرگوں کا بھی ہاتھ ہے جو گجرات کی بندرگاہوں سورت،

[بسلسلہ] صفحہ گزشتہ پیش آئی تو بڑی کوششوں کے بعد مولوی صاحب کی کتاب اسوقت دستیاب ہوئی جب اس کتاب کے مندرجات دو سو صفحات سے گزر کر مالوہ کے قریب پہنچ گئے تھے اور جب لائی کتاب نہ مل سکی تو اس کے دو ترجموں (عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی اور مسلمانان ہند پاکستان [کی] تاریخ تعلیم، (سلمان اکیڈمی، کراچی) سے استفادہ کیا۔

آبِ کوثر، شیخ محمد اکرام ص ۳۷۵۔

کھمبانت وغیرہ سے مکہ مدینہ اور مصر و ایران وغیرہ آیا جایا کرتے تھے۔ ان تعلقات نے خطہ کو ارباب علم وفضل کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب علاؤ الدین خلجی کے سپہ سالار الغ خاں نے ۱۲۹۷ء گجرات فتح کر کے اسے دہلی سلطنت کا صوبہ بنایا اس وقت دہلی میں علم وفضل کے موجزن تھے جن سے اب گجرات کی سرزمین بھی سیراب ہونے لگی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ سلاطین گجرات کے عہد میں ان علمی سرگرمیوں کو اور ترقی ملی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ خطہ میں تحصیل علم اور کتابیں جمع کرنیکا شوق دن بدن ترقی کرتا رہا یہانتک کہ گجرات خود مختار سلطنت کے دوسرے سلطان احمد شاہ اول کے عہد میں ہی کتب خانوں کا قیام عمل میں آگیا

احمد شاہ اول سلطان کے دادا مظفر شاہ اول نے اس خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اس کا جانشین احمد شاہ ہوا اس نے اپنے عہد (۱۴۱۱-۱۴۴۲ء) میں بڑے قیمتی کام انجام دیئے شہر احمد آباد بسایا، مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں اس کے کتب خانے بھی قائم ہوئے۔ علماء و فضلاء اور کتابوں کے ذخیرے باہر سے آئے خود اس کی سرپرستی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں اسی کی فرمائش پر امام بدرالدین عینی نے صحیح اور مغنی اللبیب کی تعلیقات لکھیں یہ بزرگ ۸۰۰ھ میں مصر سے گجرات آئے تھے ان کے اور بہت سے علماء و محدثین احمد شاہ کے سایۂ عاطفت میں اطمینان و فراغت کے ساتھ تصنیفی کاموں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔[1]

احمد آباد کے متعلق لکھا ہے کہ شاہان گجرات کے عہد میں یہاں بزرگان دین اور علماء و فضلاء کثرت سے جمع ہو گئے تھے کہ ایک زمانہ میں تو علم و فضل کے لحاظ سے احمد آباد کو دہلی پر فضیلت حاصل ہو گئی[2]

کتب خانہ شاہی ابھی گجرات کی خود مختار سلطنت کو قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ احمد شاہ اول کی علم نوازی کی بدولت شاہی کتب خانہ میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا لیکن سلطان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد شاہ نے اس کتب خانہ کی بہت سی کتابیں شیخ محمد عثمان کے مدرسہ کو اسلئے دیدیں کہ اسے شیخ سے بڑی گہری عقیدت

---

[1] ان حضرات کے مفصل حالات کیلئے دیکھئے "یاد ایام" [2] آب کوثر ص ۳۷۴-

[سل]طان محمود بیگڑہ اس سلطان نے شاہی کتب خانہ میں کتابوں کا کافی اضافہ کرایا اس کے ترقی پانے کی وجہ یہ ہوئی کہ محمود بڑا علم پرور بادشاہ [تھا ا]س نے باون برس (۱۴۵۸ - ۱۵۱۱ء) نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی اسے [گجرا]ت کا سب سے بڑا بادشاہ کہا جاتا ہے اس کے عہد میں بقول مصنف "یادِ ایام"[1] سارا ملک [سرسب]زی و شادابی میں باغ بہار نظر آنے لگا۔ دیہات اور قصبے آباد و معمور ہو گئے۔ احمد آباد [صنع]ت و حرفت کا مرکز بن گیا، ہر ایک جگہ مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کی گئیں" ایسے علم نواز [سلاط]ین کے دور میں احمد آباد، سورت، نہروالا پٹن، ماہم، بھروچ، کھمبات، چمپانیر وغیرہ میں [کتب] خانہ قائم ہو گئے تھے ان میں سے چند کتب خانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

[کتب خ]انہ شاہ عالم یہ بھی گجرات کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کی سرزمین پر مشائخ اور علماء کثرت سے جمع ہو گئے تھے انھوں نے مذہب اور علم کی [اشا]عت کے سلسلے میں جو مدرسے اور کتب خانے قائم کیے ان سے گجرات کا علمی وقار بہت [بڑھ گ]یا تھا۔ ایک بزرگ باوا ریحان کے گجرات آنے اور خانقاہ و مدرسہ قائم کرنے کا ذکر [ہو] چکا ہے ۸۰۳ھ۔(۱۴۰۰ء) میں ایک اور بزرگ سید برہان الدین الملقب بہ قطب عالم[2] [گج]رات کی دینی اصلاح و تربیت کے لئے پٹن شریف لائے تھے اور جب سلطان احمد اول نے [احمد آ]باد بسایا تو وہ پٹن سے احمد آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے ان کا وصال ۱۴۵۳ء میں ہوا [۵]۲ سال کے عرصے میں حضرت قطب عالم نے اپنے تبلیغی مشن کی خاطر کتابوں کے جو [ذخی]رے جمع کئے تھے ان کی تفصیلات نہیں ملتیں۔

---

[1] "یادِ ایام" مصنفہ سید عبدالحی اس کتاب کے علاوہ گجرات کی تاریخ کے متعلق یہ کتابیں بھی دیکھئے [مرا]ت سکندری" (سکندر بن محمد عرف شیخ منجھو) "مراۃ احمدی" (شاہ ابوتراب ولی) "خاتمہ [مراۃ] احمدی" مصنفہ مرزا محمد حسن علی محمد خاں بہادر بہ تصحیح سید نواب علی۔

[2] سید قطب عالم سلسلہ سہروردیہ کے نامور بزرگ تھے انھیں اہل گجرات کی اصلاح کے لئے ان کے [دادا] سید صدرالدین المعروف بہ راجو قتال) نے مامور فرمایا تھا شاہ راجو قتال، سید جلال الدین [مخدوم] جہانیاں جہاں گشت بخاری کے حقیقی بھائی تھے۔

البتہ قطب عالم کے فرزند اکبر سید سراج الدین محمد الملقب بہ شاہ عالم کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا کتب خانہ بہت بڑا تھا[1] جس میں نادر اور نایاب کتابیں بھی تھیں اور جس شاہ عالم کے جانشین برابر ترقی دیتے رہے یہاں تک کہ گیارھویں صدی ہجری میں انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا[2]۔

حضرت شاہ عالم درویش کامل اور عالم متبحر تھے اور ذوق کتب بینی بھی رکھتے تھے آپ کے ملفوظات کا ایک قلمی نسخہ جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے جو غالباً دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔ اس میں آپ کے اقوال و کرامات اور اس زمانہ کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ حضرت کا وصال ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں ہوا اور احمد آباد میں دفن ہوئے۔

کتب خانہ شیخ محمد طاہر پٹنی یہ مشہور و معروف کتب خانہ نہروالا پٹن میں تھا۔ جس کے لئے شیخ موصوف[3] نے عرب اور ایران تک سے کتابیں فراہم کی تھیں[4]۔ گجرات کے یہ جلیل القدر محدث قوم کے بوہرے اور پٹن کے باشندے تھے علم حدیث کی ترویج میں نہایت سرگرم رہے۔ حدیث کا درس بھی دیا کرتے تھے اور مرشد کی ہدایت کے مطابق اپنے طالب علموں کے لئے سیاہی بنایا کرتے تھے۔ اور درس کے دوران میں سیاہی گھسنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا ان علمی کاموں کے علاوہ شیخ موصوف نے اُن بدعتوں کو مٹانے کی بھی سخت کوشش کی جو اُن کی قوم میں پھیلی ہوئی تھیں اور بالآخر اسی سلسلہ میں ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں شہادت پائی۔

اب محدث پٹنی کی نسبت عبداللہ نوردلی کی یہ تحریر بھی ملاحظہ کریجئے[5] وہ لکھتے ہیں:

"پٹن میں ان کی ذات مرجع خلائق بنی تھی۔ دور دور سے طالبانِ علوم دینیہ

---

[1] [2] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) جلد ۱۹۔ ص ۱۴۱، ۲۴۳۔ [3] شیخ محمد بن طاہر کے متعلق مولانا حبیب الرحمن شروانی کا ایک مضمون "مقالات شروانی" (ص ۳۹۵) میں بھی ہے۔
[4] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) جلد ۱۹ ص ۲۴۳ [5] تفصیل کے لئے دیکھئے "منہ حضرت علامہ محمد ابن طاہر گجراتی المعروف بہ محدث پٹنی" مرتبہ محمد ولی عبداللہ نوروتی (ساکن جدہ)

پٹن کا رخ کرتے اور آپ سے فیض حاصل کرتے آپ کے شاگردوں اور فیض یافتہ طلبا میں بہت سے حضرات آگے چل کر یگانۂ روزگار ثابت ہوئے تھے۔ علم الٰہیات میں بھی آپ کو کامل دست گاہ حاصل تھی فقہی جزئیات اور فروعات میں آپ کا ذہن اور حافظہ واقعی حیرت انگیز تھا جب بھی کوئی مسئلہ موضوعِ بحث بنتا تو آپ فوراً کتاب کا نام صفحہ اور سطر تک کا حوالہ دیدیتے اور پھر اسی کے ساتھ مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف بیان کر کے یہ بھی بتا دیتے کہ فتویٰ اس قول پر ہے۔ اب تمھیں اختیار ہے جس قول کو چاہو اس پر عمل کرو تمام ائمہ برحق ہیں۔"

کتب خانہ شیخ عبدالقادر خضرمی بقول مصنف یاد ایام یہ نہایت عالیشان کتب خانہ تھا شیخ عبدالقادر بن شیخ خضرمی اپنے عہد کے جید علما میں سے تھے۔ انھوں نے بہت سی مفید کتابیں لکھیں جن میں "الحدائق الخضرہ" (سیرت آنحضرت صلعم) "النور المسافر فی اعیانِ القرنِ العاشر" (تاریخ) نہایت مشہور ہیں ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں ان کا انتقال ہوا۔

کتب خانہ شیخ علی مہائمی یہ نہایت عظیم الشان کتب خانہ تھا جس کی ندرت شیخ موصوف کے تبحر علمی سے ظاہر ہوتی ہے ان کی نسبت لکھا ہے[1] کہ "ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں"۔ ۸۳۵ھ (۱۴۳۱ء) میں انھوں نے وفات پائی۔ بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ مثلاً محی الدین ابن عربی کی "فصوص الحکم" اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف" پر شرحیں بھی لکھیں مگر ان کی تصانیف میں قرآن مجید کی تفسیر تبصیر الرحمٰن نہایت مشہور ہے۔ بقول مصنف یاد ایام "تفسیریں تو سینکڑوں لکھی جا چکی ہیں مگر جس بات سے ان کی تفسیر کو امتیاز و خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ قرآن پاک کی آیات کریمہ کو باہم دگر مربوط ہونے کو ایسے دل نشین طریقے سے بیان

[1] مولانا عبدالحی مرحوم (ناظم ندوہ لکھنؤ) بحوالہ آبِ کوثر ص ۵۱۱

کیا ہے جس کو پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے اور بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے۔"

کتب خانہ مفتی رکن الدین اس کتب خانہ کے وجود اور اس کی وسعت کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ مفتی صاحب نے اپنی کتاب "فتاویٰ حمادیہ" دو سو چار کتابوں کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کی تھی مفتی رکن الدین بن حسام الدین ناگوری نہروالہ کے مفتی تھے اور علم حدیث وفقہ میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔

کتب خانہ اعتماد خاں گجراتی گجرات کا یہ بھی وہ بلند پایہ کتب خانہ تھا جس میں نہایت نفیس نادر کتابیں جمع تھیں اور جو اکبر کی فتح گجرات تک موجود تھا۔ اکبر نے اس کتب خانہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی کچھ کتابیں شاہی کتب خانہ میں داخل کر دیں اور کچھ ارباب علم کو دے دیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ "انوار المشکوٰۃ" کا نسخہ ان کے حصہ میں آیا تھا۔

کتب خانہ مدرسہ عثمان پور یہ وہی کتب خانہ ہے جس کے لئے سلطان احمد شاہ اول کے صاحبزادے محمد شاہ نے شاہی کتب خانہ کی کتابیں عنایت کی تھیں اس مدرسہ کے بانی شیخ محمد عثمان (متوفی ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء) تھے انھوں نے ہی یہ شہر اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ ان کو اپنے مدرسہ کے کتب خانے سے ایسی دلچسپی تھی کہ ایک عرصہ تک وہ خود اس کے نگراں رہے۔

مدرسہ عالیہ علویہ علامہ وجیہ الدین متوفی ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء کا یہ مدرسہ بقول مصنف یاد ایام احمد آباد میں سب سے زیادہ مشہور تھا اس کا کتب خانہ[1] بھی بہت بڑا تھا جس میں مختلف مضامین کی بہت سی کتابیں تھیں۔ علامہ صاحب نے اس مدرسہ میں تقریباً پینسٹھ ۶۵ برس تک درس دیا" ان کے بعد بھی اس کا فیض ایک عرصہ تک جاری رہا۔ وہ علمائے گجرات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں[2] بھی لکھیں ان کے شاگرد جس طرح احمد آباد سے لاہور تک پھیلے ہوئے تھے اسی

---

[1] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۱۹۔ ص ۲۴۳۔

[2] ان کتابوں کے نام یاد ایام کے ص ۸۵ پر درج ہیں۔

طرح ان کے مدرسہ اور کتب خانہ کا شہرہ بھی ان علاقوں میں گونج رہا تھا۔

مدرسہ شیخ الاسلام یہ مدرسہ اکرام الدین خان المعروف بہ شیخ الاسلام نے احمد آباد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے میں تعمیر کرایا تھا اور اس کی عمارت نو سال (۱۱۰۲ - ۱۱۱۱ھ) میں مکمل ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مدرسہ مولانا نور الدین کے لئے تعمیر ہوا تھا جنھوں نے اپنی زندگی علم کی خدمت میں صرف کر دی تھی اور علامہ وجیہ الدین کے بعد گجرات میں باعتبار درس و تدریس وکثرت تصانیف کے ان سے بڑھ کر کوئی اور عالم نہیں[۱] ہوا انھوں نے ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں وفات پائی اور اسی مدرسہ میں دفن ہوئے۔

مدرسہ سرخیز اور شیخ احمد کھتو کے کتب خانے مولوی ابوالحسنات ندوی نے لکھا ہے کہ سرخیز میں جہاں احمد کھتو کا مزار ہے وہاں ایک بہت بڑا مدرسہ تھا یاد ایام[۲] میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ شیخ احمد (متوفی ۸۴۹ھ / ۱۴۴۵ء) کا شمار اولیائے کرام میں ہوتا ہے وہ حضرت برہان الدین قطب عالم کے خاص خلیفہ تھے یہ خیال ہے کہ شیخ صاحب اپنا ذاتی کتب[۳] خانہ بھی رکھتے تھے۔

مدرسۃ العلماء اس کو صوبہ دار گجرات سیف خان (محمد صفی) نے ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) میں بمقام احمد آباد قائم[۴] کیا تھا جس کی عمارت عظیم الشان اور خوش منظر کہی جاتی ہے۔

سورت کے مدارس یہ شہر بھی مدارس کے اعتبار سے ممتاز تھا۔ یہاں کے مدارس میں "مدرسہ حاجی زاہد بیگ اور مدرسہ مرجان شاہی" بہت مشہور تھے اس طرح سورت اور دیگر شہروں کی بہت سی مسجدوں میں درس کے حلقے اور کتابوں کے ذخیرے طالبانِ علم کو فیض پہنچا رہے تھے۔

چند دیگر کتب خانے مندرجہ بالا کتب خانوں اور درس گاہوں کے علاوہ یہ آٹھ کتب[۵] خانے بھی دیکھ لیجئے۔

---

[۱] [۲] یاد ایام ص ۳۳، ۶۲۔ [۳] رسالہ اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) ج ۱۹ ص ۲۴۱، ۲۴۱۔ [۴] ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں (مولوی ابوالحسنات ندوی) ص ۷۵۔ [۵] ان کے نام "تاریخ تعلیم (۳۲۲) میں گجرات کی تمدنی تاریخ (مولوی ابوظفر ندوی) کے حوالوں کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔

کتب خانہ مسند عالی، گجرات (بانی شیخ داؤد قریشی) کتب خانہ احمد بن سلمان گجرات (۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ء تک قائم تھا) کتب خانہ مخدوم ابراہیم کتب خانہ عبداللطیف دیوان، کتب خانہ حکیم روح اللہ، کتب خانہ محکمہ قضا دیہ جیار دن احمد آباد میں تھے[۱] کتب خانہ مومن خاں کھنبایت (نواب مومن خاں اول نے قائم کیا تھا) کتب خانہ محکمہ قضا، بھروچ۔

خانقاہیں مدرسوں اور کتب خانوں کے علاوہ گجرات میں سہروردیہ اور چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں بھی تھیں ان میں سے یہ دو اس وقت دیکھ لیجئے چشتیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ یعقوب (متوفی ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء) کی خانقاہ نہروالہ میں رشد و ہدایت کا مرکز تھی اسی سلسلہ کے دوسرے بزرگ شیخ کبیر الدین ناگوری (متوفی ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء) کی خانقاہ بھروچ میں تھی جہاں بقول پروفیسر نظامی ہزاروں گمراہانِ بادیۂ ضلالت روشنی حاصل کرتے تھے[۱]۔ ان بزرگوں کے علاوہ چشتیہ سلسلہ کے اور بھی مشائخ یہاں تشریف لائے حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک ممتاز خلیفہ شیخ حسام الدین ملتانی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء میں پٹن آئے اور اکتالیس برس تک رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔ یہ خیال رہے کہ ان بزرگانِ دین کا کچھ ذکر یہاں بھی اس لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان صاحبِ علم و فضل بزرگوں نے کتب خانوں کو استحکام بخشنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔

گجرات کی مغلیہ سلطنت میں شمولیت اور تعلیمی ترقیاں بالآخر ۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا لیکن اس کے بعد بھی یہاں اتنی علمی اور تعلیمی ترقیاں ہوئیں کہ عالمگیر اس کو "زیب و زینتِ ہندوستان" کہا کرتا تھا اس حکمران نے گجرات میں بھی تعلیم کو بے حد ترقی دی۔ صوبہ گجرات کے دیوان عکرمت خاں کے نام یہ فرمان جاری کیا کہ مملکت میں مدارس قائم کئے جائیں اور تعلیمی وظائف دیے جائیں۔ عالمگیر نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی مولوی ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ اس نے ان کے لئے تعلیم کو لازمی اور جبری قرار دیا۔ درس و تدریس کے

(۱،۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۱ [۳] آبِ کوثر ص ۲۷۱

بہترین استاد مقرر کئے، ماہوار امتحانات کا طریقہ ایجاد کیا جس کے نتائج کی اطلاع اس کو برابر دی جاتی تھی۔

لیکن گجرات کے علاقہ میں جو کچھ علمی اور ثقافتی سرمائے مسلم عہد میں جمع ہوئے تھے اس کا بڑا حصہ مرہٹوں کی تاراجی کے زمانہ میں برباد ہو گیا پھر بھی گجرات کے کتب خانوں کی کچھ باقیات احمد آباد، بھروچ اور کھمبایئت وغیرہ کے صوفیوں، قاضیوں اور عالموں کے گھرانوں میں اب تک موجود ہیں یہ لکھا ہے کہ کچھ کتابیں احمد آباد کی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ میں بھی محفوظ ہیں۔

بنگال

بنگال میں مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی کتب خانے قائم ہونے کے سلسلہ میں سلطان شہاب الدین غوری کے ایک بہادر غلام محمد بن بختیار خلجی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے محبوب خلیفہ شیخ اخی سراج کے نام آئے ہیں بنگال ۹۸ - ۱۱۹۷ء میں فتح ہوا جس کا سہرا بختیار خلجی کے سر رہا اس فتح کے بعد لکھنوتی کے بجائے گوڑ مسلم بنگال کا پایہ تخت قرار پایا اس نے رنگ پور آباد کر کے وہاں متعدد مسجدیں، درس گاہیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں صوبیدار بنگال، غیاث الدین (۱۲۱۲ - ۱۲۲۷ء) نے بھی لکھنوتی میں ایک مسجد، مدرسہ اور کاروان سرا بنوائی۔ اس طرح بنگال میں بارہویں اور تیرہویں صدی سے ہی کتب خانے قائم ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

چشتیہ سلسلہ کا پہلا کتب خانہ

لیکن بنگال میں کتب خانوں کی ترقی کی بنیاد حضرت نظام الدین اولیاء کے کتب خانہ کی ان کتابوں سے پڑی جو شیخ اخی سراج حضرت کے وصال (۱۳۲۵ء) کے بعد دہلی سے اپنے وطن لکھنوتی لائے تھے مشائخ چشت میں ہے کہ یہ چھوٹا سا کتب خانہ بنگال میں چشتیہ سلسلہ کا پہلا کتب خانہ تھا۔ شیخ سراج الدین المعروف بہ اخی سراج (متوفی ۱۳۵۷ء) کے مشہور خلیفہ شیخ علاؤ الحق اور ان کے صاحبزادے نور الحق (المعروف بہ نور قطب عالم) نیز ایک نہایت مشہور و معروف بزرگ جلال الدین تبریزی نے بنگال میں اسلام اور علم کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ شیخ

علاء الحق کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے پنڈوہ[1] میں ایسی عظیم الشان خانقاہ قائم کی کہ دور دور سے لوگ کھنچ کر وہاں جمع ہونے لگے۔

یہاں اسے پیش نظر رکھئے کہ یہ خانقاہیں محض روحانی اصلاح و تربیت کا مرکز نہ تھیں بلکہ یہاں سینکڑوں آدمی اپنی دنیاوی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے بزرگان دین سے دعائیں کرانے بھی آیا کرتے تھے وہ جب ان بزرگوں کے پاس کتابوں کے ذخیرے دیکھتے تو ان کی تقلید میں خود بھی کتابیں جمع کرنے کی طرف راغب ہو جاتے اس طرح خانقاہی کتب خانے کتابیں جمع کرنے کا ایک اہم ذریعہ بنے ہوئے تھے۔

اور یہ بھی خیال رکھئے کہ اس زمانہ میں یہاں اولیائے کرام کی بڑی کثیر تعداد تھی۔ مورخ ایشوری پرشاد نے اپنی کتاب میں سفرنامہ ابن بطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ چودھویں صدی کے بنگال میں فقراء و صوفیہ کی ایک سو پچاس گدیاں[2] تھیں ان میں مذہب اور تصوف وغیرہ کی کتابوں کے جو ذخائر جمع ہونگے۔ ان سے یہاں کے خانقاہی کتب خانوں کی کثیر تعداد کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

بنگال کے حکمراں

یہ حکمراں بھی دیگر صوبوں کے حکمرانوں کی طرح بدلتے رہے محمد تغلق کے زمانے میں یہ صوبہ دہلی کی مرکزی حکومت سے الگ ہو کر آزاد ہو گیا اس کی خود مختاری کا خاتمہ شیر شاہ کے ہاتھوں ہوا اور ۱۵۷۶ء میں اکبر نے اسے سلطنتِ مغلیہ میں شامل کرلیا لیکن ہر دور میں مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے۔

شاہانِ بنگال میں علاء الدین حسین شاہ (۱۴۹۳ - ۱۵۱۹ء) اور اس کا بیٹا نصرت شاہ علم و ادب کے بڑے سرپرست و مربی تھے۔ ان کے عہد میں گو دفتری زبان فارسی تھی لیکن بنگالی زبان کی بھی بڑی ترقی ہوئی۔ حسین شاہ نے بھگوت گیتا اور نصرت شاہ نے مہابھارت کا ترجمہ بنگالی میں کرایا۔ ایک بنگالی شاعر ودیا پتی نے اپنی کچھ تصانیف نصرت شاہ کے نام معنون کردی تھیں۔ یہاں اس نکتہ کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بنگالی زبان کی ترقی کا سنگ بنیاد بنگال کے مسلم دورِ حکومت میں رکھا گیا ورنہ اس سے پہلے یہ

[1] تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۲۰۰۔ [2] آبِ کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۲۴۴۔

زبان بقول سید سلیمان ندوی کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی اور مسلمانوں سے پہلے اس زمین میں ایک تخم بھی نہ بویا گیا تھا۔

مدارس بنگال کے قدیم مدارس کی گذشتہ عظمت کا پتہ چلانے کے لئے ان کی تاریخ پر نظر ڈالیے جس میں ان مدارس کے لئے "عالی شان، مسکن ذاکران صاحب شوق، اور مثل قصر بہشت" جیسے شاندار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ایسے مدارس کے کتب خانے لازمی طور پر بہترین کتابوں کے خزانے ہونگے۔

جہاں تک شاہان بنگال کے عہد کی تعلیمی ترقیوں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں حسین شاہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے اس کے تعمیر کئے ہوئے مدارس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ لکھنوتی کے قریب ساگر ڈگی (تالاب) کے شمالی کنارہ پر کچھ کھنڈرات ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک مدرسہ تھا جسے حسین شاہ نے تعمیر کرایا تھا ایک مدرسہ کا ذکر خورشید جہاں نامہ کے مصنف الٰہی بخش حسینی نے کیا ہے کہ وہ گوڑ کے ایک محلہ میں غلام حسین مصنف ریاض السلاطین کے مکان کے قریب تھا اسکو بھی حسین شاہ نے تعمیر کرایا تھا اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق تاریخ بنگال کے مصنف اسٹورٹ نے لکھا ہے۔

> "منجملہ اور نیک کاموں کے حسین شاہ نے قطب عالم کا مقبرہ تعمیر کرایا اور اس کے متصل ایک مدرسہ، ایک مسجد اور ایک شفا خانہ قائم کیا جس کے لئے اس نے خاطر خواہ دیہات وقف کئے مسجد و مدرسہ ابتک موجود ہیں"

بنگال کے دیگر مدارس میں ایک مدرسہ اسمعی پور میں تھا جو اب باقی نہیں رہا لیکن اس جگہ ایک ٹیلہ ہے جو "مدرسہ ٹیلہ" کے نام سے مشہور ہے "مدرسہ درس باری" کے کھنڈرات موضع عمر پور کے قریب ہیں یہاں ایک کتبہ ملا ہے جس پر ۱۴۷۹ء کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ آج سے تقریباً پانچ سو برس پہلے قائم ہوا تھا۔

"مدرسہ مسجد خان محمد میردہ اور مدرسہ نواب شائستہ خاں" ڈھاکہ میں تھے۔ اول الذکر ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) میں قائم ہوا تھا یہاں طلباء کے قیام کے لئے بھی کمرے تھے جس مسجد سے یہ مدرسہ منسلک تھا وہ بڑی عظیم الشان کہی جاتی ہے۔

امیر الامراء شائستہ خاں عالمگیر کا ماموں اور عہد شاہجہانی و عالمگیری کا ممتا
امیر تھا۔ مختلف صوبوں میں وہ ناظم رہا۔ عالمگیر کے عہد میں بنگالہ کا حاکم ہوا جہاں گیا وہا
مدرسے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ڈھاکہ میں لب دریا ایک مدرسہ مع مسجد بنوایا جو ا
عرصہ دراز تک قائم رہا۔

"مدرسہ فیض اللہ"۔ ڈھاکہ کے محلہ اعظم پورہ میں ایک شاندار دو منزلہ مسجد میں تھا ج
اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ مولوی ابوالحسنات ندوی نے لکھا ہے کہ "یہ مدرسہ تصو
و علوم باطن کی مشق گاہ تھا ممکن ہے کہ بعد کو علوم باطن کی جگہ علوم ظاہر نے لے لی ہو"۔
۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں قائم ہوا تھا اس کے کتبہ کی منظوم عبارت کا یہ شعر مدرسہ کی آئینہ داری ک
ہے ۔ مسکنِ ذاکرانِ صاحبِ شوق ؛ مثلِ قصرِ بہشت پُر رونق۔

"مدرسہ کٹرہ" کے متعلق لکھا ہے کہ مرشد آباد میں اس عالیشان مدرسہ کی عمارت اب تک
اپنے گذشتہ عہد عظمت کی یاد دلا رہی ہے اسے نواب مرشد قلی جعفر خاں صوبہ دار بنگال ۱
۱۷۲۵ء) نے قائم کیا تھا مرشد آباد کا بانی بھی وہی تھا اس نے اپنی علمی قابلیت اور علم نوا
و دینداری کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کر لی تھی لکھا ہے کہ وہ ہر روز بعد نماز فجر قرآن مجی
کی تلاوت کرتا تھا اور اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے مکہ اور مدینہ بھیجا کرتا تھ
اس کے دربار میں علماء و فضلاء کے علاوہ تقریباً دو ہزار حافظ اور مناجات خواں بھی تھے۔

"مدارس سیلا پور" قدیم مدارس کے سلسلہ کی وہ اہم کڑیاں تھیں جو اٹھارویں صد
کے پُر آشوب زمانہ تک نمایاں رہیں ان مدارس کی یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ یہاں ہندو
مسلمان دونوں عربی اور فارسی علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

کتب خانہ معین الدولہ مرشد آباد میں یہ بھی عمدہ کتب خانوں میں سے تھا اس کے
احمد اللہ اور تحویلدار۔ اسد اللہ تھے اس کتب خانہ کی ایک کتا
رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں موجود ہے۔ یہ معین الدین جوینی کی کتاب نگارس

۱؎ مولوی ابوالحسنات ندوی کی کتاب ص ۵۹۔
۲؎ ۳؎ رسالہ اسلامک کلچر حیدر آباد دکن جلد ۲۰ ص ۱۶۔
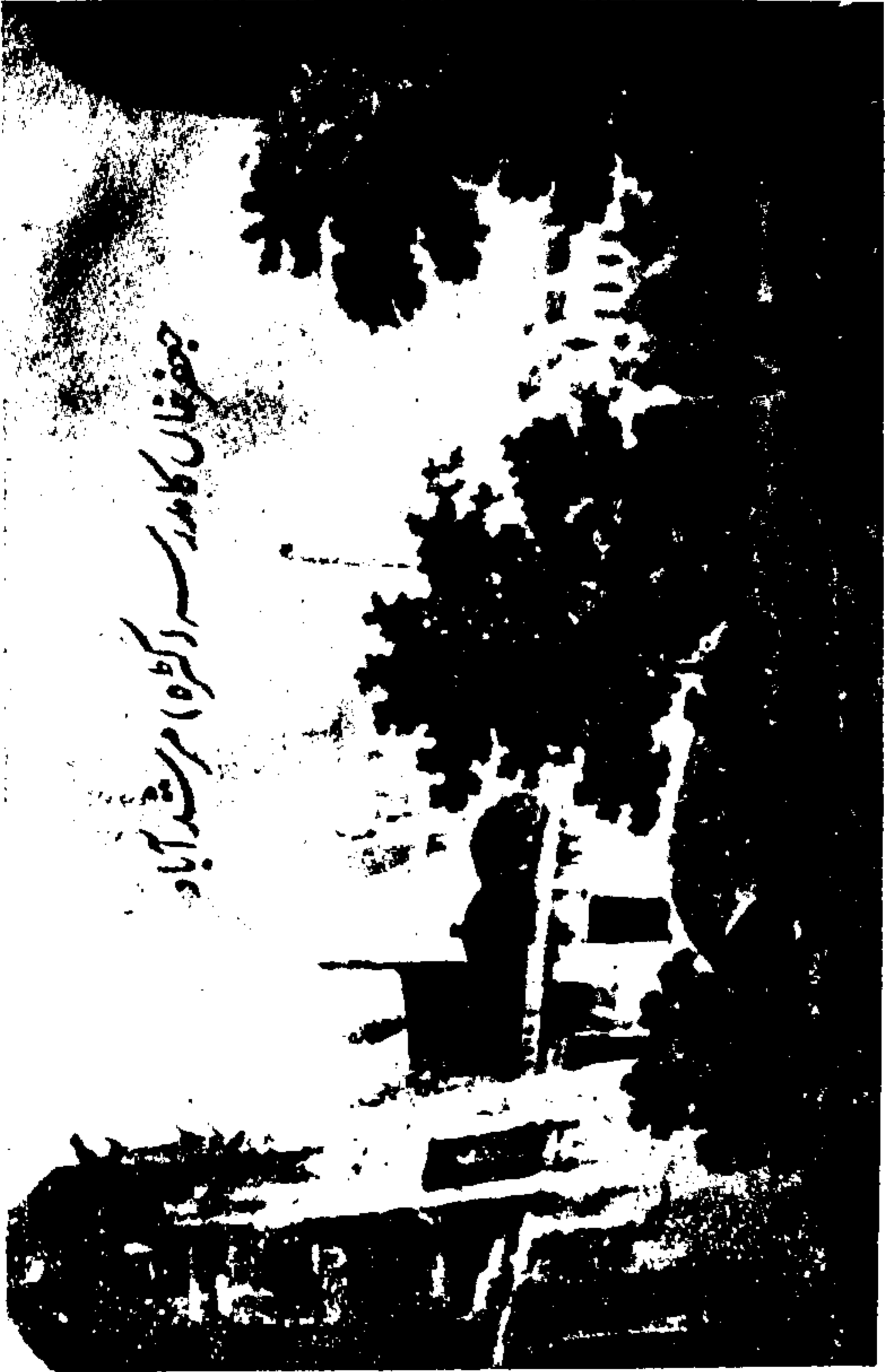
جعفر خاں کا مدرسہ (کٹرہ) مرشد آباد

کا قلمی نسخہ ہے جسے محمد حسین ابن محمد مظفر نے ۹۵۳ھ (۱۵۴۶ء) میں لکھا تھا۔

کتب خانہ میر محمد علیخاں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک اچھا کتب خانہ تھا جس میں دو ہزار کتابیں جمع تھیں۔ میر محمد علی بنگال کے حاکم علی وردی خاں کے دربار کے فضلاء میں سے تھا اس نے عظیم آباد (پٹنہ) کی سکونت ترک کر کے مرشد آباد کو اپنا نیا دار السلطنت بنا لیا تھا۔ وہ اہل علم کی بڑی قدر دانی و سرپرستی کرتا تھا چنانچہ اس کے دربار میں میر محمد علی خاں، علی ابراہیم خاں، حاجی محمد خاں، تقی قلی خاں اور دیگر اربابِ علم جمع تھے۔

کتب خانہ ہیبت جنگ علی وردی خاں کا داماد زین الدین احمد ہیبت جنگ بھی ایک کتب خانہ رکھتا تھا جس کی کتاب داری کی خدمت لالہ اُجاگر چند الفت کے سپرد تھی علی وردی کی وفات (۱۷۵۶ء) کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ تخت نشین ہوا مگر وہ اپنے باپ کے کتب خانہ کو قائم نہ رکھ سکا اس لئے کہ میر جعفر کی غداری اور انگریزوں کی عیارانہ چالوں نے خود اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ بنگال کے ہر حصہ میں کتب خانے اور مدرسے پھیلے ہوئے تھے گذشتہ صفحات میں ایک سرکاری رپورٹ کے حوالے سے کہدیا گیا ہے کہ برطانوی عہد سے قبل بنگال میں مدارس کی تعداد ایک لاکھ تھی اس تعداد سے کتب خانوں کی تعداد کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن ان تعلیمی ترقیوں کی راہیں جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کی ناکامی نے بالکل بند کر دیں یہ حقیقت ہے کہ میر جعفر کی غداری اس شکست کا باعث ہوئی جس کے اثرات علم و ادب، سیاست اور سراج الدولہ کی ذات پر بڑے بھیانک اور دور رس ہوئے اسے نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا اور مسلم بنگال پر انگریزوں کا بھرپور قبضہ ہو گیا۔ یہ المیہ ایک شاعر راجہ رام نرائن موزوں نے ذیل کے شعر میں ایسی فنی مہارت سے سمو دیا ہے کہ یہ تاریخی شعر ہر دل سوز سانحہ کے وقت رنج و الم کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ موزوں کہتے ہیں ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

بہار

بہار[1] زمانۂ قدیم سے علوم ظاہری و باطنی کا مرکز رہا ہے اسی سرزمین پر گوتم بدھ کو صداقت کا جلوہ نظر آیا تھا اور یہاں سے اہنسا اور انسان دوستی کی وہ تحریک اٹھی تھی جو بدھ مت کے نام سے مشہور ہے۔ اس صوبہ کا قدیم شہر پاٹلی پترہ (پٹنہ) بدھ مت کا وہ مقدس شہر ہے جو اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل شہنشاہ اشوک کے عہد میں مذہب اور علم کا بہت بڑا گہوارہ بن گیا تھا اور آج بھی یہاں کتب خانۂ خدا بخش کی شکل میں علم و ادب کا وہ بے بہا خزانہ موجود ہے جو ساری علمی دنیا کے لئے باعثِ افتخار ہے۔

جب بختیار خلجی نے ۱۱۹۴ء میں شہر بہار فتح کیا تو اس وقت اس کی علمی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی۔ اس علم نواز فاتح نے یہاں متعدد مسجدیں اور مدرسے قائم کئے جن کے اثر سے اس علاقے میں مذہب اور علم کے چرچے ہونے لگے اور درس و تدریس اور کتابیں جمع کرنے کے شوق کو پھولنے پھلنے کے لئے ایسی فضا مل گئی جس کی تصویر اس تحریر میں نظر آتی ہے۔

> "بہار میں عموماً یہ صورت رہی ہے کہ اکثر رؤسا، و امرا، علم و فن کی دولتِ لازوال سے بھی مالا مال ہوتے تھے اور وہ ضروریاتِ دنیوی سے بے نیاز رہ کر اپنے کاشانوں میں بیٹھے ہوئے تعلیم و تدریس کے ذریعہ سے علم و فن کی بہترین خدمات انجام دیتے تھے اور جو امراء اہل علم نہ تھے وہ اپنی معاصرانہ عزت برقرار رکھنے کے لئے علما و فضلا کو اپنے دامنِ دولت سے وابستہ رکھتے تھے طلبار کے لئے وظائف اور جاگیریں مقرر کرتے تھے اور وہ اس کارِ خیر کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ آج تک اس مقدس رسم کی یادگاریں بہار میں موجود ہیں"[2]

ایسے ماحول میں کیسے کیسے اہل علم اور کتنے مدرسے و کتب خانے ہونگے۔ ان کا اندازہ لگانا دشوار نہیں مولانا ابوالحسنات ندوی نے اپنی کتاب (ص ۴۸۔۔۵۰) میں ان ممتاز علما

---

[1] بہار کی مفصل تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ مگدھ"، مرتبہ مولوی فصیح الدین بلخی۔

[2] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں (مولوی ابوالحسنات ندوی) ص ۴۶۔

فضلاء کے نام دیئے ہیں جو بہار کے مختلف شہروں میں علم و فضل کے روشن مینارے تھے مثلاً
بہار میں شاہ شرف الدین احمد یحییٰ، سہسرام میں مولوی سلیم اللہ اور شاہ کبیر الدین، ڈیانوان
میں مولوی شمس الحق محدث، مولوی حافظ نور احمد، مولوی محمد زبیر اور استھانوان میں مولانا
حافظ وحید الحق۔ ان میں بقول مولوی ابوالحسنات ندوی "مولوی شمس الحق کی وہ مایہ ناز ہستی
ہے جس پر اس آخری دور میں ہندوستان جس قدر چاہے فخر کر سکتا ہے۔ تمام عمر خدمت علم حدیث
میں بسر کر گئے۔ تحصیل حدیث کے لئے آپ کے ہاں اکثر مدنی، یمنی، اور نجدی عرب طلباء آتے تھے
مرحوم نے فن حدیث میں "سنن ابی داؤد" کی وہ بہترین شرح لکھی جس کو پڑھ کر عرب و عجم کی
زبان سے بے ساختہ صدائے تحسین و آفرین بلند ہوئی۔"

خانقاہی کتب خانے بہار میں تعلیمی اداروں کے علاوہ ایسی خانقاہیں بھی ہیں جن سے نہایت عمدہ کتب خانے منسلک رہے ان میں عربی، فارسی کی
مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں اور نوادر کا بڑا نایاب ذخیرہ موجود رہا ان خانقاہی کتب خانوں
میں سے چند کو ملاحظہ کیجئے اور یہ خیال رکھئے کہ بعض خانقاہوں کا روحانی اور علمی فیض
کئی سو برس سے جاری ہے۔

"خانقاہ منیر شریف" کے کتب خانہ کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد
منیری کی اس خانقاہ میں عہد قدیم سے قائم ہے۔ اس میں حضرت مخدوم کی تمام تصانیف
موجود ہیں۔ ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، شرح آداب المریدین اور فوائد المریدین ان
کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا غالب کے دوست اور شاگرد شاہ فرزند علی
صوفی منیری کی بھی کئی تصانیف یہاں ہیں۔ حضرت مخدوم کا شمار ہند و پاک کے مشہور بزرگوں
میں ہوتا ہے ان کی وفات ۷۸۲ھ (۱۳۸۰ء) میں ہوئی تھی۔

"خانقاہ اسلام پور" کے کتب خانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مولانا شاہ محمد عبد القادر
قادری کی تنہا کوششوں سے قائم ہوا تھا اس میں عربی، فارسی اور اردو کی ہزاروں کتابیں

ان کی مزید تفصیل مولانا محمد حنیف پھلواری مرحوم کے مضمون "بہار کے بعض قدیم کتب خانے"
رسالہ مہر نیم روز، کراچی۔ مئی ۱۹۷۱ء) میں دیکھئے۔

عرصہ دراز سے محفوظ چلی آرہی ہیں قلمی کتابوں کا بھی اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ اس خانقا
کے سجادہ نشین شاہ محمد عبدالقادر قادری صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے مگر ا
کی سب سے بڑی یادگار یہ کتب خانہ ہے۔ جس کا نام ان کی رحلت (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) کے بعد
"کتب خانۂ قادریہ" ہوگیا۔

"خانقاہِ مجیبیہ" کے کتب خانہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے اپنے مخطوطات و نوادرات
اور افادیت و کثرت کتب کے اعتبار سے ایشیا کی مشہور خدا بخش لائبریری پٹنہ کے بعد
دوسرا مرتبہ دیا جاتا ہے لیکن کتب خانہ مجیبیہ میں بعض اہم کتابیں ایسی بھی ہیں جو خود
لائبریری پٹنہ میں موجود نہیں ہیں۔ پھلواری شریف کی اس خانقاہ کے بانی شاہ مجیب اللہ
قادری (متوفی ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء) کے زمانہ سے لے کر اب تک اس میں برابر اضافے ہوتے رہے کتب خانہ
کی عمارت تعمیر کرانے اور اس کو ترقی دینے کے سلسلے میں خانقاہ کے سجادہ نشین مولانا شاہ
محمد امان اللہ قادری کا نام قابل ذکر ہے۔

"خانقاہِ سلیمانیہ" پھلواری شریف" کا کتب خانہ تعداد کتب کے لحاظ سے گو بہت
بڑا نہیں ہے لیکن اسناد و حوالجات کی کتابوں نیز اہم تاریخی مخطوطات کے لحاظ سے خاص
اہمیت رکھتا ہے اور دور دور سے ریسرچ اسکالر اس سے استفادہ کے لئے آتے ہیں۔ یہ
خیال رہے کہ اس کتب خانہ میں بہت زیادہ کتابیں اور مخطوطات پھلواری شریف کے ایک
مشہور و معروف بزرگ مولانا شاہ محمد سلیمان چشتی قادری نے فراہم کئے ہیں اس خانقاہ کی
یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس کے بیشتر سجادہ نشین صاحب درس علماء تھے ان سجادہ
نشینوں میں پاکستان کے مشہور مصنف مولانا شاہ محمد جعفر ندوی کے ذی علم بھائی مولانا شاہ
غلام حسنین چشتی سلیمان کا نام بھی آتا ہے۔ پھلواری شریف کے سلسلہ میں اسے یاد رکھیئے کہ عالمگیر
نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے لئے علماء و فضلاء کا جو بورڈ مقرر کیا تھا اس میں دو عالم
یہاں کے رہنے والے تھے اس شہر کا علمی فیض اب بھی جاری ہے۔

"خانقاہِ عمادیہ، پٹنہ سٹی" کے کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں اور مسودات
و مخطوطات کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے مولوی حسیب اللہ مختار کے انتقال (۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء) کے بعد ان کے

تب خانہ کے نادر ذخیرے کی بہت سی کتابیں خانقاہ میں آگئی تھیں مولوی صاحب پٹنہ
سور کتب خانہ کے بانی خدا بخش کے دوستوں میں تھے اور کتب خانہ کے کاموں میں ان
دگار رہے تھے کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں خانقاہ عمادیہ کے بانی حضرت خواجہ عماد الدین
ر پھلواروی (متوفی ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) کے بعد یہ خانقاہ معہ کتب خانہ پٹنہ سٹی منگل تالاب
ں ہو گئی تھی۔

خانقاہ حضرت عشق، (متین گھاٹ پٹنہ سٹی) کا کتب خانہ بڑی نایاب کتابوں سے
ہے حضرت شاہ رکن الدین عشق کے قلمی دیوان کا ایک ایسا نایاب نسخہ یہاں ہے جو
اہ عمادیہ کے سوا اور کسی خانقاہ میں نہیں ہے۔

کے دیگر کتب خانے پٹنہ کے محلہ صادق پور میں مولوی احمد اللہ اور مولوی ولایت
علی کے پاس ذاتی کتب خانہ تھا تحریک مجاہدین میں جب حکومت
کی تمام جائداد ضبط کی تو یہ کتب خانہ بھی ان سے جدا ہو گیا۔ لکھا ہے کہ اس کا بڑا حصہ
منتقل کر دیا گیا لیکن اس کی کچھ کتابیں خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔

دانا پور (پٹنہ) میں مولانا شاہ محمد قائم قتیل (سجادہ نشین) کا کتب خانہ بھی نہایت
ہا جاتا ہے اس میں تصوف کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود رہا ہے۔

س مدرسہ دانا پور بھی لائق ذکر ہے۔ یہاں مسجد و مدرسہ کی بنیاد نواب آصف خاں
نے ڈالی تھی۔ بقول مولانا ابوالحسنات ندوی اس مدرسہ کی عمارتوں کی خوش
لو وہاں کی کوئی عمارت نہیں پہنچ سکتی۔

"مدرسہ پٹنہ" کے ضمن میں یہ کہا گیا ہے کہ عظیم آباد میں ایک محلہ ہی "مدرسہ مسجد" کے
سے موسوم ہے مسجد کی عمارت بھی اب تک قائم ہے اس شہر کی علمی رونقیں مغلوں کے
وال میں بھی اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اورنگ زیب کا پوتا شہزادہ محمد عظیم الشان اسے

وبہ بہار کا صدر مقام ایک عرصہ تک شہر بہار رہا پندرہویں صدی عیسوی میں شیر شاہ سوری نے
صدر مقام قرار دیا اس شہر کو عظیم آباد بھی کہا جاتا ہے۔ عظیم آباد کی چند ممتاز شخصیتوں کا حال
ید محمد حسین کی کتاب "مرزا محمد علی فدوی" میں ملاحظہ کیجئے۔

دوسری دہلی بنانا چاہتا تھا۔ اگراس عہد کی علم دوست تحقیقوں اور انکی علمی وادبی سرگ
کا گہرا جائزہ لیا جائے تو اس شہر کے ہر پڑھے لکھے شخص کے پاس ایک چھوٹا موٹا کتب خانہ
جس میں ادب اور شعر وشاعری کی کچھ کتابیں ضرور ہوں گی اس زمانہ میں دہلی کے پرآشوب
سے تنگ آکر شہزادہ محمد عظیم الشان اور بہت سے شعراء اور ادیب بھی دہلی سے عظیم آباد آگئے

بہار شریف کے دو درس گاہی کتب خانے

بہار شریف کا ذکر کاغذ سازی کے سلسلے میں پہلے آچکا
اس صنعت کے علاوہ یہ شہر تعلیم کا بھی بڑا مرکز تھا یہاں
تعلیم گاہوں میں "مدرسہ اسلامیہ اور مدرسہ عزیزیہ" بہت
مشہور ہوئے لکھا ہے کہ ان دونوں مدارس کے ساتھ وسیع کتب خانے بھی ہیں۔ ا
مدرسہ اسلامیہ کے کتب خانہ میں بعض کتابیں بڑی نادر ہیں اس مدرسہ کی بانی ایک خا
بی بی جین کو بتایا جاتا ہے جس نے تقریباً پچیس ہزار روپیہ کی آمدنی کی جائداد مدرسے
لئے وقف کردی تھی۔ مدرسہ اسلامیہ کے پہلے مہتمم مولانا حافظ وحید الحق استھانوی
مولانا صاحب کے متعلق مولوی ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں کہ" آپ کے علمی فی
کی زندہ یادگار مدرسہ اسلامیہ بہار ہے جو آج تک اس دیار واطراف کیلئے سرچشمۂ
کا کام دیتا ہے"۔

سہسرام کے کتب خانے اور مدرسے

صوبہ بہار کے شہر سہسرام کے ساتھ شیر شاہ سوری (
۹۴۵ھ) کا ذکر بے محل نہ ہوگا اس لئے کہ یہی شہر اس
مولد ومدفن ہے۔ شیر شاہ نے اپنی پانچ سالہ حکومت
بھی مدرسوں اور کتب خانوں کو فراموش نہیں کیا۔ ہمارے خیال میں خود شیر شاہ
پاس تاریخ کی کتابوں کا نہایت اعلیٰ ذخیرہ ہوگا۔ اس علم دوست فرماں روا کو ع
فارسی، فقہ اور تاریخ میں مہارت تامہ حاصل تھی تاریخ سے اس کو خاص شغف
شیر شاہ نے نارنول میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس کی عمارت بہت
اور شاندار تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدرسہ نارنول[1] کا کتب خانہ بھی نہایت

[1] نارنول اب ریاست پٹیالہ میں ہے۔

با۔ شیر شاہ کے دادا ابراہیم سوری کی قبر نارنول میں ہے۔ لکھا ہے کہ ان کے انتقال کے
قع پر بطور کارِ خیر یہ مدرسہ شیر شاہ نے بنوایا تھا اور مقبرہ و مدرسہ کی تعمیر پر ایک لاکھ
زائد روپیہ صرف کیا تھا۔

سہسرام کے ایک درویش شاہ کبیر کی خانقاہ کے ساتھ جو مدرسہ قائم ہوا تھا اس
م "مدرسہ عربیہ خانقاہ" ہے وہ تقریباً ڈھائی سو برس سے اب تک علمی فیض پہنچا رہا
س کے اخراجات کے لئے بادشاہ فرخ سیر اور شاہ عالم نے جاگیریں عطا کی تھیں۔ "مدرسہ
تب خانہ" نہایت وسیع اور قیمتی کہا جاتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ تقریباً ایک لاکھ
پیہ کیا گیا ہے۔

سہسرام کے دورِ آخر کے نامور عالم اور مصنف مولانا مصلح الدین مولف "تاریخ
سرام" کا کتب خانہ بھی قابلِ ذکر ہے انھوں نے علامہ اقبال پر کئی کتابیں لکھیں مثلاً
اور اقبال وغیرہ مولانا نے تفسیر قرآن آسان زبان میں لکھی اور قرآن کے پیغام کو
یں پھیلانے کے لئے ماہانہ ترجمان القرآن حیدرآباد دکن سے جاری کیا۔ مولانا ابوالکلام
کے تعلق کی وجہ سے ان کی تفسیر قرآن کے نام پر رسالہ کا یہ نام رکھا تھا مولانا ابوالاعلیٰ
ندی پہلے اس رسالہ میں شریک مدیر رہے بعدہٗ وہ اس کے مالک ہوگئے اور آج اس
مار پاکستان کے مشہور دینی رسالوں میں ہوتا ہے۔

ان کتب خانوں کی کیفیت پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بہار کی چھوٹی

ڈا اور دیستہ کتب خانے

چھوٹی غیر معروف آبادیوں تک میں کتابیں جمع کرنے کا شوق آج سے
برسوں قبل پھیلا ہوا تھا۔ یہ دونوں مختصر آبادیاں ریلوے اسٹیشن
ورا ور رسل و رسائل کی سہولتوں سے محروم رہی ہیں اس کے باوجود یہاں اعلیٰ درجہ کے
خانوں کا قائم ہو جانا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ ان کے بانی عشاقِ کتب کی صف
یت اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

ہو مولانا سید ابوظفر ندوی۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے ص ۲۹۴۔
ہر نیمروز کراچی مئی ۱۹۷۱ء)

کھجوا (ضلع سارن) کے کتب خانہ میں نایاب کتابوں اور قدیم مخطوطات کے علاوہ لقما
وصلیوں کا بھی کافی ذخیرہ تھا یہاں کی کتابوں وغیرہ پر بانی اور واقف کی مہریں لگی ہوئی ہیں جن
"سید ناصر علی ۱۲۱۳ھ" بتاتی ہے کہ یہ کتب خانہ تقریباً پونے دوسو برس پرانا ہے مگر اب اس کی
بڑی خراب و خستہ ہے ٹوٹی پھوٹی الماریوں اور ٹوکریوں میں کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔

خاکسار نے آج سے سولہ سال قبل اس کتب خانہ کی ایک نہایت قیمتی کتاب "
ہمایوں" کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا واحد قلمی نسخہ کھجوا کے کتب خانہ میں ہے اور اس کی
کا فخر سید حسن عسکری (پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی) کو حاصل ہے دیوانِ ہمایوں کے اس
پر ایک مفصل مضمون رسالہ معیار پٹنہ (۱۹۳۶ء) میں شائع ہونیکا بھی میں نے ذکر کیا
جہاں تک دلیسنہ کی لائبریری کا تعلق ہے اسے دیکھ کر آچاریہ کرپلانی کو اچنبھا ہوا
دیہات میں اتنی بڑی ورنیکلر لائبریری کیسے اکھٹی ہوگئی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس
نادر مجموعۂ علم" اور مولانا حفظ الرحمٰن (صدر جمعیۃ العلمائے ہند) نے اس کو "ہندوستا
مایہ ناز لائبریری" کہا ہے۔ مولوی عبدالحق (انجمن ترقی اردو) نے فرمایا کہ "اردو کتب اور
کا ایسا اچھا اور جامع مجموعہ شاید ہی کہیں اور ہو"

یہ خیال رہے کہ اس کتب خانہ کا فیض جاری ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ ہو
لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اس کی تقریباً چھ ہزار کتابیں خدا بخش لائبریری میں منتقل کر دی
ہیں جہاں ان سے استفادہ کا زیادہ موقع مل سکیگا۔ اس کتب خانہ کے قیام کی قد
قدر داستان اور اس کے ذخائر منتقل ہوتے وقت اہلِ دلیسنہ کے رنج والم کی درد
کیفیت ان اوراق میں بوجہ طوالت پیش نہیں کی جارہی۔ اسے سید شہاب الدین دسنوی
معلومات افزا مضمون "دلیسنہ لائبریری مرحوم" (کتب خانہ نمبر الزبیر، بہاول پور)
ملاحظہ فرمایئے۔

ہندوؤں کے کتب خانے ان کے سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی کا بیان تو پچھلے اوراق
میں آچکا ہے لیکن یہاں پٹنہ کے ساتھ اسے دُہرا دینا بے جا نہ
وہ لکھتے ہیں کہ پٹنہ میں اس وقت ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہیں جن کے یہاں عربی کتا

کے نادر نسخے ابتک ہیں اور ان کو اس قدر عزیز ہیں کہ وہ انہیں جدا نہیں کر سکتے۔ راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان میں اس قسم کا نادر کتب خانہ موروثی چلا آتا ہے اور حسب بیان سید ابوظفر ندوی شتاب رائے کا بیٹا راجہ کلیان سنگھ کئی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر فارسی ادب کی اور کچھ تاریخ کی کتابیں تھیں اس کے علاوہ ایک علم دوست شاعر راجہ رام نرائن کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا جس کی کتابیں اس کے اخلاف کے پاس اب تک موجود ہیں۔

میوزیم۔ پٹنہ میں ایک مارواڑی جالان صاحب کا میوزیم بھی ہے جس میں نہایت قیمتی مخطوطات اور تاریخی وعلمی نوادر محفوظ ہیں ان میں نپولین کا پلنگ، لوئی شانزدہم کی میز ہے جس پر بادشاہ اور اس کے بیگمات کی تصاویر ہیں، چین کے دو ہزار سال قبل کے ظروف، مصر کے دو ہزار سال پرانے سوتی پارچہ جات قرون وسطیٰ میں بنے ہوئے چار جامے اور دریاں مختلف ہتھیار اور اسلحہ جات وغیرہ یہاں موجود ہیں۔ قرآن شریف کے بعض نسخے خدا بخش لائبریری کے نمونوں سے بہتر اور عمدہ حالت میں ہیں اس میوزیم میں اورنگ زیب کے عہد کا ایک قرآن مجید ہے جو از اول تا آخر سونے کے حروف میں ہے اور فن کار نے نقاشی کا فن اس پر ختم کر دیا ہے قرآن کا یہ نسخہ اورنگ زیب نے اپنی ایک بیٹی کو عطا فرمایا تھا اس پر شہنشاہ کے دستخط اور مہر موجود ہیں۔

ایسے ذاتی کتب خانے دیگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھرانوں میں بھی ہوں گے کیونکہ اس زمانہ کے بہار میں تعلیم کا چرچا دیہات اور قصبات تک میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن ان سب کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ علمی و تعلیمی ترقیوں کا جو سلسلہ بختیار خلجی کی فتح بہار یعنی بارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوا تھا وہ عہد مغلیہ تک جاری وساری رہا اس کے بعد برطانوی عہد میں تعلیم کے نظام اور کتب خانوں کے قیام کا ایسا نیا سلسلہ رائج ہوا جو اس زمانہ کے سائنٹیفک مزاج سے ہم آہنگ ہو سکے۔ لیکن عہد رفتہ کی کچھ یادگاریں خانقاہوں، مدرسوں اور کتب خانوں کی شکل میں اب بھی موجود ہیں جنہیں دیکھ کر بہار کی گذشتہ علمی عظمت و شوکت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

یوپی

یوپی کی صبح بنارس اور شامِ اودھ تو آج تک مشہور ہیں لیکن نوابانِ اودھ
کتب خانوں اور امان اللہ بنارسی کی درسگاہ کو دنیا بھولتی جا رہی ہے۔ اس زمانہ
تعلیمی نظام اور کتب خانوں کے قیام میں حکومت اور عوام دونوں کا ہاتھ رہا بادش
اور امراء کی طرف سے ان علماء کی قدر و منزلت اور مالی امداد کی جاتی تھی جو اپنی زندگ
تعلیم کے لئے وقف کر دیتے تھے چنانچہ سرکاری مدارس کے علاوہ ہر صاحب در
عالم ایک دار العلم تھا ایسے علمائے کرام شہروں، قصبوں اور دیہاتوں تک میں پھیلے
تھے۔ مثلاً الٰہ آباد میں شیخ محب اللہ، قاضی محمد آصف اور شیخ محمد افضل، بنارس میں
امان اللہ، جائس (ضلع رائے بریلی) میں ملا علی قلی، چڑیا کوٹ[1] میں مولانا عنایت رس
اور مولانا فاروق، خیر آباد میں مولانا فضل امام اور مولانا فضل حق، دیوہ (ضلع بارہ
میں مولانا عبد السلام، سندیلہ میں مولانا حمد اللہ، سہالی[2] میں مولانا قطب الدین سہالوی شہ
میں مولانا قطب الدین شمس آبادی، غازی پور میں مولانا قصیحی اور مولانا عبد الہٰد گوپا
(ضلع ہردوئی) میں شاہ خیر اللہ اور قاضی مبارک، گھوسی[1] میں شیخ عطاء اللہ گھوسی
درس و تدریس کے چراغ روشن کئے اس میں شک نہیں کہ ان گرانقدر شخصیتوں کے دل و د
کتب خانوں کی طرح علم و فضل کے خزانے تھے۔

---

[1] چڑیا کوٹ اور گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے مردم خیز قصبات ہیں اس علاقے کے دو علمی قصبے سرائے
اور مبارک پور بھی قابل ذکر ہیں۔ سرائے میر میں ایک مدرسہ موسومہ "مدرسۃ الاصلاح" ۱۹۰۸ء میں قائم ہے
مبارک پور جن نامور علماء و فضلا کا مسکن رہا ہے ان کے مفصل حالات "شجرۂ مبارکہ یعنی تذکرہ علمائے مبارک
از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری میں دیکھیئے۔ علاوہ ازیں اعظم گڑھ اور اس کے اطراف کے علمی مراکز کی تفصیلات حیات
از علامہ سلیمان ندوی (ص۵۰۔۷۰) میں ملاحظہ کیجئے۔ [2] یہ قصبہ لکھنؤ سے ۲۲ میل کے فاصلے پر ہے۔

ان کے علاوہ یوپی کے قدیم علمی مراکز میں ان شہروں نے بھی بڑا نام پایا۔ آگرہ اعظم گڑھ، امروہہ، آنولہ، بدایوں، بریلی، بلگرام، جون پور، رام پور، سنبھل، شاہجہاں پور علی گڑھ، غازی پور، فرخ آباد، قنوج، کڑامانک پور، کچھوچھا، لکھنؤ، مارہرہ اور مراد آباد۔

مدارس پر ایک نظر قرون وسطیٰ کے یوپی میں جابجا مدارس کا ہونا کتب خانوں کے وجود کی بہت بڑی دلیل ہے اس سلسلہ میں پہلی نظر بدایوں پر پڑتی ہے جو عہد قدیم سے مرکز علم رہا ہے یہ ہندوؤں کے عہد میں ویدک تعلیم گاہ ہونے کی بناء پر ویدامئو کے نام سے موسوم تھا۔ مسلم عہد کے اولین دور میں ہی یہاں سلطان التمتش (متوفی ۱۲۳۵ء) نے جامع مسجد اور "مدرسہ معزی" تعمیر کرائے تھے۔ اس شہر کی خاک سے بڑے بڑے صلحا اور رحمتا فضلاء مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء، ان کے استاد علاؤالدین اصولی، ضیاء الدین نخشبی شہاب الدین حمرہ، ملا عبدالقادر بدایونی اور دوسرے اکابر اٹھے جو اپنے فیض سے تعلیم گاہوں اور کتب خانوں کو مالا مال کر گئے۔

آگرہ لودھیوں اور مغلوں کے عہد میں تعلیم کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ اس کی تعلیم گاہوں کے لئے فاضل اساتذہ شیراز تک سے آیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں یہاں بکثرت مدرسے قائم ہوتے جن میں "مدرسہ شیخ زین الدین خوافی" مولانا علاؤالدین لاری کا "مدرسہ خسینی" فتح پور سیکری میں "مدرسہ اکبر بادشاہ" اور "مدرسہ ابوالفضل" بہت مشہور ہیں ان کے علاوہ "مدرسہ چشمہ رحمت" (غازی پور) "مدرسہ عالیہ" (رام پور) "مدرسہ نجیب الدولہ" (دارانگر متصل امروہہ) "مدرسہ فخر المدارس" اور "مدرسہ نواب محمد بنگش خان" (فرخ آباد) اور بریلی، شاہجہاں پور، پیلی بھیت وغیرہ میں حافظ الملک رحمت خاں (حکمراں بریلی) وغیرہ کے قائم کردہ مدارس اور دوسری درس گاہوں کا فیض جاری تھا یہ سب درس گاہیں علم کے طلبگاروں اور کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ رحمت خاں کے مدارس میں درس و تدریس کے لئے پانچ ہزار علماء مقرر ہوئے تھے ان سب اساتذہ اور طلباء کی علمی ضرورتیں درس گاہی کتب خانے پوری کر رہے تھے۔

اب چند علمی و تعلیمی مراکز جونپور، لکھنؤ اور بلگرام وغیرہ پر بھی ایک نظر ڈالیں۔

جونپور

یوپی کا تاریخی شہر جونپور کتب خانوں کے لحاظ سے بھی نہایت ممتاز رہ چکا ہے
"ریاض جونپور" اور دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عہد بہ عہد بہت سے
مدارس قائم ہوئے جن کے ساتھ کتب خانے اور بورڈنگ ہاؤس بھی تھے ان میں سے
۲۹ مدرسے[1] گویا ۲۹ کتب خانے محمد شاہ کے زمانہ تک تھے۔ جن میں پہلا نام ملک العلما
قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۹ھ-۱۴۴۵ء) کے مدرسہ کا ہے آپ
تیموری حملے کے بعد دہلی سے جون پور آگئے تھے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی آپ
کے فیض کمال سے پورب کی ساری زمین لہلہا اٹھی تھی قاضی صاحب نے درس دیے
"بدائع البیان" اور "حاشیہ کافیہ" جیسی کتابیں لکھیں۔ جونپور کی مشہور و معروف
"مسجد اٹالہ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہی قاضی موصوف کا مدرسہ تھا۔

جون پور کے دو مدرسے جونپور میں دو اور مدرسے قائم ہوئے تھے "مدرسہ ملا محمد
افضل" اور "مدرسہ اسلامیہ امام بخش" استاد الملک ملا
محمد افضل (پیدائش ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء) علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے ان کے مدرسہ
کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "اس درس گاہ نے جونپور کو دارالعلم بنا دیا"
"مدرسہ اسلامیہ" کی بنیاد جون پور کے ایک رئیس منشی امام بخش نے ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں
ڈالی تھی اور اپنی تمام املاک کا چوتھائی حصہ مدرسہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ مدرسہ
ایک نشان میل کی حیثیت سے ہمیں بتا رہا ہے کہ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی
کے زمانہ سے انیسویں صدی یعنی تقریبًا چار سو برس تک جونپور تعلیم گاہوں کے
لحاظ سے بھی بڑا ممتاز شہر رہا ہے۔

جونپور کے چند علماء ان مدارس کے ساتھ چند علما کا ذکر بھی ہو جائے جنہوں نے
علمی دنیا میں جونپور کا نام روشن کر رکھا ہے ان میں کے ایک

[1] ان کے نام "حیات شبلی" مولانا سید سلیمان ندوی (ص ۳۶) میں ملاحظہ کیجیے۔

عالم قاضی محمد حسین جون پوری فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں شامل رہے تھے۔ یہاں اور بھی بلند پایہ علماء و فضلاء موجود تھے مثلاً شیخ محمد ماہ جونپوری، شیخ شمس الدین جونپوری مولانا شیخ الہ داد وغیرہ مگر دیوان عبدالرشید (متوفی ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) اور ملا محمود جونپوری (متوفی ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۱ء) کو آسمانِ علم کا آفتاب و مہتاب کہا گیا ہے۔ ایسی علمی شخصیتوں کا کتب خانوں پر یہ اثر پڑا کہ ان کا معیار اور وقار بلند ہو گیا۔

جونپور کو فیروز تغلق نے اپنے چچا زاد بھائی جونا خاں (سلطان محمد تغلق) کے نام پر دریائے گومتی کے کنارے بسایا تھا اس کے بعد مشرقی سلاطین کے عہد میں یہ علم و فضل کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ محمد بن تغلق نے اپنی سلطنت کے شرقی علاقہ کا حاکم ملک سرور المعروف بہ خواجہ جہاں کو مقرر کیا تھا جو ۱۳۹۴ء میں خود مختار ہو گیا اور اس نے "شرقی سلطنت" قائم کر لی جس کے چھ سلاطین میں سلطان ابراہیم بڑا نامور ہوا اس کے چالیس سالہ دور (۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء تا ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء) میں یہ علاقہ اصحاب علم و فضل اور درس گاہوں سے معمور ہو گیا اور جب جونپور مغلوں کے قبضہ میں آیا تو یہاں علمی و تعلیمی ترقیاں اتنے عروج پر پہنچ گئیں کہ شاہ جہاں اس شہر کو "شیراز ہند" کہا کرتا تھا۔ جونپور کی یہ علمی شان تقریباً تین سو برس یعنی محمد شاہ کے عہد تک قائم رہی اس زمانہ میں یہاں تقریباً اُنتیس مدرسے موجود تھے۔

کتب خانہ منعم خاں عہد مغلیہ کے کتب خانوں میں یہ بھی نفیس کتابوں پر مشتمل تھا منعم خاں اکبری عہد میں جونپور کا گورنر رہا اس علم دوست شخص نے کتب خانہ قائم کرنے کے علاوہ رفاہ عام کے اور کام بھی کئے مثلاً جب اکبر جونپور سے گذرا تو اس کی یادگار میں دریائے گومتی پر پل تعمیر کرایا جو آج تک "اکبری پل" کے نام سے مشہور ہے۔ منعم خاں کتابیں جمع کرنے کا بڑا شائق تھا اور اس مد پر نہایت فیاضی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا کرتا تھا ایک مرتبہ اس نے "کلیات سعدی" کے ایک نسخہ کے بدلے میں پانچ سو روپیہ انعام میں دیئے تھے اس سلسلہ میں وہ خود لکھتا ہے۔

"این کلیات شیخ حضرت شیخ سعدی قدس سرہ راآں عزیز بہادر خاں در بلدۂ پرسرور جونپور بدیں فقیر فرستادہ بود، پانصد روپیہ انعام شد۔ در تاریخ نہ صد ہفتاد وشش (۹۷۶) عدد اوراق این کتاب سی صد و نود و چہار است عدد ابیات وسطورش از متن وحاشیہ نوزدہ ہزار وہفت صد، حاشیہ چہار ہزار وہفت وصد وبست وہشت است، مشتمل بود واسم ودیباچہ مصور وچہار لوح شیرازی"[1]

کتب خانہ قاضی ابوالبقاء

شاہجہاں کے عہد میں جونپور کے قاضی ابوالبقاء کا کتب خانہ بھی نہایت قیمتی کہا جاتا ہے انھیں خدا نے کتابیں جمع کرنے کے شوق کے ساتھ غیر معمولی حافظہ بھی عطا کیا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ جہاں نے انھیں ایک ایسی کتاب اصلاح کے لئے دی جس کے حرف جگہ جگہ سے خراب ہو گئے تھے، قاضی صاحب نے اسے پڑھ کر اپنے کتب خانہ میں کہیں رکھ دیا۔ جب بادشاہ نے کتاب طلب کی اور تلاش کرنے کے بعد بھی کہیں نہ ملی تو انھوں نے صرف اپنے حافظہ کی مدد سے ساری کتاب ازسرنو لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کردی۔

کتب خانہ مولوی معشوق علی

غرض ایسے اہل کمال اس زمانہ میں جونپور میں جمع ہو گئے تھے جن کے ومانع حقیقتاً کتب خانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ دورِ آخر کے کتب خانوں میں مولوی معشوق علی خاں کا کتب خانہ نہایت اعلیٰ تھا اس میں پانچ ہزار کتابیں تھیں جن میں زیادہ تر فقہ اور اخلاقیات پر تھیں چونکہ ان ہی دو مضامین سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ صاحب درس علماء اور مصنفین کی صفوں میں بلند مقام رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس ہر وقت طلباء کا مجمع لگا رہتا تھا "تحفۂ طیفۂ" اور "فرائض اسلمیہ" ان ہی کی تصانیف ہیں۔ مولوی صاحب کا ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں انتقال ہو گیا مگر ان کا کتب خانہ یہ شہادت دیتا رہیگا کہ سیاسی حوادث کے طوفانوں میں بھی جونپور کے کتب خانے نایاب کتابوں سے معمور رہتے۔

[1] اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۱۹، ص ۳۳۷

کچھوچھا

کتب خانہ اشرفیہ فیض آباد کے ضلع میں کچھوچھا ایک مشہور قصبہ ہے جہاں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۱۴۰۵ء) نے کتب خانہ اشرفیہ قائم کیا تھا جو آپ کی حیات ہی میں علم معقول و منقول سے مزین اور تاریخ و تصوف کی بیش بہا کتابوں سے آراستہ ہو گیا تھا۔ حضرت اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم اور برگزیدہ صوفی تھے۔ آپ نے ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) میں اخلاق و تصوف پر ایک رسالہ لکھا۔ یہ قلمی کتاب بقول حامد حسن قادری (مصنف داستان تاریخ اردو) اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر ہے اس کے علاوہ آپ نے کم و بیش بارہ کتابیں تصنیف کیں جن کا ذکر "لطائف اشرفی" میں ملتا ہے آپ کے خلفاء نے بھی آپ کی اس سنت کو اپنایا اور "بحر مواج" اور "بحر ذخار" جیسی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔

حضرت مخدوم نے اپنی سو سالہ زندگی میں خوب سیر و سیاحت کی۔ ہندوستان اور بلاد شرقیہ کے گوشے گوشے میں علم و معرفت کی روشنی پہنچائی اور ہر جگہ سے علمی نوادر جمع کرتے رہے۔ علم کی جستجو اور حقیقت کی تلاش نے حضرت کے ذہن میں کتب خانہ کے قیام کا خیال پیدا کیا۔ چنانچہ آپ نے ہندوستان کے علاوہ سمنان، بغداد، دمشق، یمن، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بصرہ سے کتابوں کا خاصا ذخیرہ فراہم کیا۔ امراء حضرت کے مذاق علمی کو دیکھکر اہم کتابوں کا تحفہ بھیجتے تھے۔ اور علماء اصلاح و نظر ثانی کے لئے اپنی گراں قدر تصانیف کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ایک موقع پر اپنی تصنیفات کے علاوہ بعض نادر کتابوں کو بھی حضرت مخدوم کی خدمت میں بھیجا اور ایک عرصہ تک مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا جس کی چند جھلکیاں "مکتوبات اشرفی" میں بھی ملتی ہیں۔

حضرت مخدوم کی وفات کے بعد حضرت عبدالرزاق نور العین (المتوفی ۸۷۲ھ) منصب سجادگی پر فائز ہوئے۔ انھوں نے اپنے عہد میں کتب خانہ اشرفیہ کی خاص طور

پر توسیع کی اور اس میں بیشتر کتب تاریخ و تصوف کا اضافہ کیا۔ حضرت نور العین کے زمانہ میں لوگ دور دور سے تحصیل علم و معرفت کے لئے جمع ہونے لگے جس کی بنا پر کتب خانہ کی افادی حیثیت اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی یہاں تک کہ جب حضرت شاہ حسن خلف اکبر حضرت نور العین (المتوفی ۸۹۸ھ) نے لباس سجادگی زیب تن فرمایا تو اس وقت کتابوں کی مجموعی تعداد ساڑھے چھ ہزار تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کتب خانہ زمانے کے الٹ پھیر کے ساتھ مختلف سجادگان میں منتقل ہوتا رہا اور اسی درمیان میں ایک ایسا بھی وقت آیا کہ حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کی شاندار روایات کی روشنی مدھم پڑ گئی اور کتب خانے کا بڑا حصہ ناقدری اور عدم توجہی کا شکار ہو گیا اور ایک طویل مدت تک یہ حفاظت و نگرانی سے محروم رہا۔

تیرھویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں حضرت مولانا سید شاہ علی حسین اشرفی سجادہ نشین سرکار کلاں نے ایک بار پھر خاندانی وقار کو بلند کیا اور حضرت مخدوم کی سنت عالیہ کو زندہ کرنے میں پوری تن دہی کے ساتھ دلچسپی لی۔ بقول میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم "حضرت اشرفی میاں کی تاریخی اہمیت خانوادۂ اشرفیہ میں وہی ہے جو بنی امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو حاصل تھی" اس میں شک نہیں کہ حضرت اشرفی میاں نے خاندانی اختلال وجمود کو دور کرنے کے جو عملی منصوبے بنائے اور جس طرح عامۃ الناس کو صراط مستقیم پر لانے کے لئے ان کی قیادت و رہنمائی کی اور جس انداز سے انھوں نے قومی کردار و سیرت کی تعمیر و تخلیق میں حصہ لیا وہ مقدمہ لطائف اشرفی، وظائف اشرفی، صحائف اشرفی اور مجلہ اشرفی کے مختلف شماروں کے پڑھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے تحصیل علم کے لئے "جامعہ اشرفیہ" کی بنیاد رکھی اور لوگوں میں دینی تعلیم کا جذبہ پیدا کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے کتب خانہ اشرفیہ کی بھی اصلاح فرمائی اور مختلف مقامات سے نوادر منگوائے۔ حضرت اشرفی میاں نے اپنے ذاتی مصارف سے اشرفی پریس قائم کیا جس میں بعض نادر کتابیں طبع ہوئیں۔ اور ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۸ء اسی پریس سے "مجلہ اشرفی" نکلتا رہا، جس کی ادارت کے فرائض

حضرت مولانا ابوالمحامد سید محمد محدث نے بحسن وخوبی انجام دیئے اسی مجلہ کے ذریعہ
لطائف اشرفی کا اردو ترجمہ بالاقساط پیش کیا گیا۔ ترجمہ کا کام حکیم مولانا سید نذر
اشرف فاضل نے کیا۔ بعض ناگزیر حالات کی بناء پر وہ صرف نو لطائف کا ترجمہ کر سکے
جو آج ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی موجود ہے۔ حضرت اشرفی میاں نے والیانِ
ریاست کو بھی کتابوں کی طباعت واشاعت کی جانب متوجہ کیا چنانچہ انھیں کی تحریک
پر نواب کلب علی خاں ریاست رام پور نے ۱۲۹۷ھ میں "لطائف اشرفی" کی طباعت
کرائی اور نواب میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد نے چند نادر کتابوں کی طباعت کی
ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ غرض کتابوں کی اصلاح ونقل اور طباعت سے کتب خانہ
اشرفیہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا۔ حضرت اشرفی میاں کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ
انہوں نے عربی اور فارسی کی طرح اردو سیکشن کو بھی ترقی دی چنانچہ اردو کے شعرا
کے دواوین کے علاوہ مذہب، تصوف، فلسفہ، کلام، تاریخ اور طب کا بھی جس قدر
ذخیرہ انھیں اردو زبان میں دستیاب ہوا وہ سب کتب خانے کی زینت بن گیا۔ غالباً
یہ بات لطف سے خالی نہ ہوگی کہ دیوان ولی کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۱۸۰ھ جو اس کتب خانہ
میں ہے اپنے بعض اندرونی شواہد کی بناء پر ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اب تک
دیوان ولی کو مولانا احسن مارہروی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مرتب کیا ہے ان دونوں
مطبوعہ دیوان میں ولی دکنی کے درج ذیل شعر کا اندراج اس طرح ہے۔

مرد کا اعتبار کھوتی ہے ؛ مفلسی سب بہار کھوتی ہے۔

لیکن کتب خانہ اشرفیہ کے قلمی نسخۂ دیوان ولی میں مرد کے بجائے عشق لکھا ہے اس
شعر کے اور بھی تھوڑے بہت اختلافات ہیں جو قلمی نسخۂ ہذا کی شعری بلاغت کو
نمایاں کر کے اس کی صحت کی غمازی کرتے ہیں۔

حضرت اشرفی میاں کے وصال کے بعد جب منصب سجادگی حضرت مولانا محمد مختار
اشرف کو ملا تو انھیں یکایک زمانے کی مختلف کشمکش سے دوچار ہونا پڑا اور ان
کے افکار وعلائق نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ کتب خانے کی طرف ملتفت ہوتے

بہر حال ان کا یہی اقدام کیا کم اہم ہے کہ انھوں نے کتب خانہ کو "قومی ملکیت" قرار دیکر
اپنے ذاتی تصرفات سے اسے علیحدہ کر دیا ہے ان کے فرزند مولوی سید اظہار اشرف نے
ایک انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل کی جس میں بلا تفریق مذہب وملت لوگوں کو شریک کیا رائے عامہ نے انھیں کتب
کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا ہے اور اب وہ اس کمیٹی کے ذریعہ ترقی کے منصوبے بناتے اور انھیں عمل میں لاتے

کتب خانہ اشرفیہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مجموعی تعداد کم وبیش دس
ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ قلمی کتابوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ ہے۔ جن
میں اکثر نہایت نادر ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں تفسیر، حدیث، فقہ
کلام، تاریخ، ادب اور طب کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے اور ان حقائق کی روشنی میں
اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مشائخ کرام نے اپنی خانقاہی زندگی میں
دین ومذہب کی تبلیغ واشاعت کے ساتھ علم وادب کی کیسی کیسی حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں۔

لکھنؤ

آج سے تقریباً پانچ سو برس پہلے جون پور کی بزم علم کے ایک فاضل
شیخ اعظم نے لکھنؤ میں مسند درس بچھا کر اسے علم وفضل کا مرکز بنایا تھا
اسی زمانہ میں یہاں کتب خانوں کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد شاہ پیر محمد (متوفی
۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء) نے یہاں مدتوں سلسلۂ تدریس جاری رکھا۔ فرنگی محل کے قیام
اس سلسلہ کو مزید ترقی دی۔ لکھنؤ کی علمی وتعلیمی مرکزیت بڑھی اور اس کے سا
کتب خانوں کی ضرورت بھی بڑھ گئی۔ پھر نوابان اودھ کے عہد میں یہ شہر کتابوں کا
ومصدر بن گیا۔ اس زمانہ میں چاروں طرف سے کتابی دولت سمٹ کر یہاں پہنچ رہی
شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کے بیش بہا ذخائر لوٹ مار سے بچ بچا کر یہیں آگئے
نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کا کتب خانہ
یہاں منتقل ہو گیا تھا۔ اس پر آشوب دور میں ہر کس وناکس لکھنؤ کی طرف کھچا
چلا آتا تھا، اس لئے کہ یہاں امن وامان تھا، دولت کی فراوانی تھی اور نوابان اودھ

ر علم وفضل کے قدردان تھے۔ دہلی اور دوسرے مقامات سے ہجرت کرکے جو لوگ
ھنؤ آتے وہ اپنا کتابی سرمایہ بھی ساتھ لاتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں شاہ عالم
بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کے ساتھ بھی کچھ نایاب کتابیں دہلی سے آئی تھیں۔ غرض لکھنؤ
نوابانِ اودھ کے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے ذاتی اور درس گاہی کتب خانے
ی تھے۔ مثلاً" فرنگی محل کا کتب خانہ، مولوی سبحان علی خاں، علمائے شیعہ میں سید دلدار علی
ور علامہ تفضل حسین خاں کے کتب خانے" ہر اعتبار سے بے نظیر کہے جاتے ہیں۔ اس طرح
شہر کتب خانوں کے اعتبار سے اتنا ممتاز ہو گیا تھا کہ علامہ شبلی نے لکھنؤ کے ایک حکیم
سیح الدولہ علی حسن خاں بہادر کے کتب خانہ کی باقیات دیکھ کر کہا تھا کہ ایسا نایاب ذخیرہ
مصر وشام میں بھی نہ ہوگا۔

لکھنؤ کی زرخیز سرزمین میں کتب خانوں کے ساتھ کتابت کا فن بھی
فن کتابت خوب پھولا پھلا۔ ایران کے مشہور خطاط میر عماد الحسینی کے شاگرد
ر بھانجے آغا عبدالرشید دیلمی ہندوستان آئے اور ان کے دو شاگرد حافظ
ر اللہ اور قاضی نعمت اللہ نوابانِ اودھ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے
شاگردوں میں ایسے باکمال خطاط پیدا ہوئے جو خود اُستاد کہلائے۔ ان میں حافظ نوراللہ
ے بیٹے حافظ ابراہیم کے دو شاگرد منشی منسارام کشمیری اور منشی محمد ہادی علی بہت
مشہور ہوئے۔ حافظ نوراللہ کی نسبت عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کے لوگ ان
ے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعوں کو موتیوں کے داموں مول لیتے یہاں تک کہ ان کی معمولی مشق
بازار میں صرف ایک روپیہ کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔ ایک بار نواب سعادت
علی خاں نے گلستاں کا ایک نسخہ لکھنے کی حافظ نوراللہ سے فرمائش کی تھی انھوں نے اسی
ہزار روپے نقد، کاغذ، ایک سو قلم تراش، چاقو اور کئی ہزار قلموں کے نیزے منگوانے کے لئے
عرض کیا۔ چنانچہ یہ سامان فراہم کر دیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کتابوں
کے بڑے شائق تھے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شیخ سعدی کی گلستاں انہیں اس قدر
پسند تھی کہ وہ ہر وقت ان کے سرہانے رکھی رہتی تھی۔

کتابوں کے ذخیرے

گو کتابت کے ذریعہ لکھنؤ میں کتابوں کی تعداد بڑھتی رہی لیکن مطابع قائم ہو جانے کے بعد اس تعداد میں بڑا اضافہ ہو گیا متعدد علوم کی کتابوں کے ذخیرے جمع ہو گئے یہاں غازی الدین حیدر کے عہد (۱۸۱۴ تا ۱۸۲۷ء) میں پہلا مطبع کھولا گیا اس کے بعد مصطفائی مطبع، علوی مطبع اور دیگر مطابع جاری ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۴۸ء میں یہاں بارہ مطابع تھے۔ اب کتابیں اتنی کثیر تعداد میں چھپنے لگیں کہ انھیں لکھنؤ سے باہر بھی بھیجا جانے لگا۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنے دادا حقیقی چچا مولوی احمد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہزاروں کتابیں لے کر لکھنؤ سے راولپنڈی رتھوں اور بیل گاڑیوں میں جایا کرتے تھے مولوی احمد بیان کرتے ہیں

"ان دنوں کتابیں عنقا تھیں یہاں کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں اور پروانہ وار گرتے تھے۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہم جس شہر یا گاؤں میں پہنچتے ہم سے پہلے ہماری خبر پہنچ چکتی اور ہمارا داخلہ عجیب شان و شوکت سے ہوتا اور ہم کسی بھی بستی میں پہنچے ادھر خلقت نے گھیر لیا بھیڑ لگ جاتی تھی اور ہم جس کتاب کو جس قیمت پر دیتے لوگ بے عذر لے کے آنکھوں سے لگاتے۔ ہم کریما، ماقیماں وغیرہ کو فی جلد چھ آنے یا آٹھ آنے کے حساب سے اور گلستاں و بوستاں کو فی جلد تین روپیہ یا چار روپیہ کے نرخ سے بیچتے اور اس پر یہ حال تھا کہ ہم مانگ کو پورا نہ کر سکتے تھے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے پہنچتے کتابوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور نئے مال کے انتظار میں مہینوں ٹھہر جانا پڑتا۔ ان دنوں مال کا پہنچنا دشوار تھا۔ مگر ہم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ برابر مال لکھنؤ سے آتا رہتا۔"[1]

لکھنؤ میں کتابوں کی تعداد اور ان کی مانگیں نولکشور پریس قائم ہو جانے کے بعد بہت بڑھ گئی تھیں۔ منشی نول کشور (متوفی ۱۸۹۵ء) کے اس پریس میں فارسی، عربی

[1] ملاحظہ ہو، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ مصنفہ مولانا عبدالحلیم شرر۔ ص ۲۲

اردو کی قدیم و نایاب کتابیں بڑی احتیاط و توجہ سے چھپتی تھیں بالخصوص قرآن شریف جس احترام و اہتمام کے ساتھ یہاں چھاپا جاتا تھا اس کی مثال شاید ہی کسی اور پریس میں مل سکے۔ ان کتابوں کی اہمیت اور شہرت اتنی پھیلی کہ ہندوستان کے ہر گوشے سے ان کی مانگیں آتی تھیں جو یہاں سے پوری کی جاتی تھیں۔

کتب خانہ فرنگی محل

لکھنؤ میں فرنگی محل کے کتب خانہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ پونے تین سو برس سے برابر علمی فیض پہنچا رہا ہے اس ادارہ کی نسبت گذشتہ اوراق میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ ملا قطب الدین سہالوی کی اولاد کو جو مکانات وغیرہ عالمگیر نے عطا فرمائے تھے اس میں ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا اسی لئے اس کا نام فرنگی محل پڑ گیا اس دارالعلم سے متعلق علماء میں ملا صاحب کے صاحبزادے ملاّ نظام الدین (متوفی ۱۷۴۸ء) ان کے فرزند ملاّ عبد العلی (متوفی ۱۸۱۹ء) اور ملا عبد الحی (متوفی ۱۸۸۶ء) بڑے مشہور و معروف ہوئے ان کی شخصیات کے اثرات و برکات کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ملاّ عبد العلی اپنے تبحر علمی کی وجہ سے بحر العلوم کہلاتے ہیں ان کی نسبت سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رام پور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہو کر بحرِ ہند کے کناروں سے مل گیا" اور یہ خیال رہے کہ ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا "درس نظامی" تقریباً ڈھائی سو برس سے عربی مدارس میں رائج ہے۔

کتب خانہ ندوۃ العلماء

یہ ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے جس میں آج سے کچھ عرصہ پہلے کتابوں کی تعداد چالیس ہزار تھی اور اب یہ تعداد کافی بڑھ گئی ہوگی۔ خیال رہے کہ لکھنؤ کی تعلیمی خدمات اور کتب خانوں کا دائرہ ندوۃ العلماء[1] کے قیام سے بھی کافی وسیع ہو گیا تھا۔ یہ ادارہ انیسویں صدی کے آخر میں علامہ شبلی اور دیگر علمائے کرام کی مساعی جمیلہ سے لکھنؤ میں قائم ہوا تھا۔ ان مساعی کا ثمرہ وہ نامور علماء ہیں جو اس ادارہ سے نکلے اور ندوی کہلائے۔ ندوۃ العلماء

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیاتِ شبلی از سلیمان ندوی۔

کی خدمات کا اعتراف غیر مسلم اکابر نے بھی کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ (مصنف تا[illegible]
ادب اردو) نے لکھا ہے۔

"ندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علومِ عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے
سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔ قیمتی اور نیز ہزارہا مفید مطبوعہ
کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ قائم کیا۔ قرآن شریف
کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا مسلمانوں کے عہد حکومت
میں ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیاں ناواقفیت سے لوگوں
میں مشہور ہو گئی ہیں، ان کو رفع کیا اسی طرح مسلمانوں کے قانون
وقف و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسائل قانونی اکثر پیش آجاتے
ہیں ان پر روشنی ڈالی اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم
کیا جس کا اثر ممالکِ دور و دراز تک پر پڑا"

شعر و ادب کا دبستان لکھنؤ میں دینی علوم کے ساتھ دنیوی علوم کی نشوو[نما]
بھی ہوئی۔ یہاں شعر و ادب کے دبستان میں ایسے با[کمال]
شاعر اور نثار پیدا ہوئے جن کے علمی و ادبی کارناموں سے تاریخیں بھری ہوئی [ہیں]
مختصر یہ کہ گذشتہ لکھنؤ میں علم و فضل اور شعر و شاعری کے چرچے پھیلے ہوئے [تھے]
لوگ کتابیں پڑھتے اور جمع کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ یہاں کی علمی و ادبی مجلس[وں]
کی شان اور رونق شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کی وجہ سے دوبالا ہو گئی
اس نے دہلی چھوڑنے کے بعد یہاں بھی علمی مجلسیں آراستہ کر لی تھیں جن میں شعر[ا کا]
مجمع رہتا تھا۔ بزم تیموریہ (ص ۳۴۳) میں ہے کہ "صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرز[مین]
پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی اور سارا ٹھاٹھ وہی قائم کر رکھا تھا دلی سے جو ج[و]
پہلے ان کی سرکار میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈتا، شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور شع[را]
و اہلِ کمال کے قدر داں تھے۔"

لہ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "لکھنو کا دبستانِ شاعری" از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

بہر حال یہاں تفصیل مقصود نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ لکھنؤ میں کتابوں کی اشاعت، تعلیم اور علم و ادب کی ترقیوں سے کتب خانوں کی بھی توسیع ہوئی اور جب نوابانِ اودھ کی سلطنت کا پایہ تخت فیض آباد کے بجائے لکھنؤ بنا تو یہاں ترقیوں کا ایک اور شاندار دور شروع ہوا اس زمانہ میں رقص و موسیقی کی رنگین محفلیں سجیں اور نشاط و سرمستی کے ترانے گونجے مگر علم کی بھی گرم بازاری ہوئی۔ وہ حکمراں شعراء و ادباء وغیرہ کی سرپرستی و قدر دانی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انھیں کتابیں جمع کرنیکا بھی بڑا شوق تھا۔ نواب آصف الدولہ کتابوں کے ایسے شائق تھے کہ ان کے حضور میں کتابیں پیش کرنے والے نہ صرف انعام و اکرام پاتے بلکہ ان سے تقرب بھی حاصل کر لیتے تھے۔ ان کی کتاب دوستی کے اثر سے شاہی کتب خانہ کی بڑی ترقی ہوئی، غازی الدین حیدر نے بھی اس کتب خانہ میں اضافے کئے اور علم و فن کی ترقی میں حصہ لیا واجد علی شاہ کتابوں سے بھی دلچسپی رکھتے تھے کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی کبھی کتب خانہ میں جا کر کتابیں ملاحظہ کیا کرتے تھے اور ان میں سے اقتباسات لیتے تھے۔

نوابانِ اودھ کا شاہی کتب خانہ نوابانِ اودھ کی کتابوں سے گہری دلچسپی رکھنے کا ہی یہ اثر تھا کہ شاہی کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون کی تین لاکھ کتابیں جمع ہو گئی تھیں ان میں سات سو اپنے مصنفین کے ہاتھوں لکھی ہونیکی وجہ سے نادر کتابوں میں شمار ہوتی تھیں ان کے علاوہ ہندوستان، ایران، اٹلی اور دیگر ممالک کے مصوروں کی بنائی ہوئی اعلیٰ تصاویر بقول مؤلفین اتنی کثیر تعداد میں تھیں کہ انھیں دیکھنے کیلئے عمرِ نوح درکار تھی کتب خانہ کی نگہداشت اور تنظیم و ترتیب کیلئے جو عملہ مقرر تھا اس کی تعداد تین سو بتائی گئی ہے غرض کتابوں اور عملہ کی تعداد سے کتب خانہ کے وسیع اور عالی شان ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن سلطنتِ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ (متوفی ۱۸۸۷ء) کے معزول اور جلاوطن ہو جانے کے بعد اس عظیم کتب خانہ میں ابتری پھیل گئی تھی اور کتب خانہ کے بعض کارکنوں کی خیانت اور بد دیانتی کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ کتب خانہ سے قیمتی کتابیں نکال لیتے اور ان کی جگہ معمولی کتابیں داخل کر کے تعداد کتب پوری کر دیتے تھے۔ ایک

ناظم کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اسے اپنی لڑکی کی شادی کے وقت جب سرمایہ کی ضرورت پڑی تو اس نے کتب خانہ کی کچھ کتابیں دس ہزار روپیہ میں فروخت کر ڈالی تھیں اس طرح کتب خانہ کا انحطاط ہوتا چلا گیا اور صرف اس کی یاد باقی رہ گئی۔

اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد شاہی کتب خانہ کے ذخائر کی فہرست مرتب کرنے کا کام ڈاکٹر اسپرنگر (SPRENGER) کے سپرد کیا گیا مگر وہ تمام کتابوں کی فہرست مرتب نہ کرسکا اس کی مرتبہ فہرست کی صرف پہلی جلد ۱۸۵۴ء میں اس نام سے شائع ہوئی ہے ،، کٹلاگ آف دی عربیک' پرشین اینڈ ہندوستانی مینسن کرپٹ ان دی امپیریل لائبریری آف اودھ" اس جلد میں فارسی اور اردو شعراء کی تصانیف اور تذکرے ہیں

تصنیفات و تالیفات نوابان اودھ کی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد ان کے کتب خانے بھی نہ رہے مگر ان کے وہ رفاہی کام یاد آتے رہیں گے جن کی بدولت علم و ادب نے ترقی پائی ہے اس زمانے میں چھاپے خانے قائم ہوئے کچھ کتابیں بھی لکھی گئیں۔ آصف الدولہ کے عہد میں کتاب "اصول النغمات" تالیف ہوئی جس سے بہتر کتاب بقول عبدالحلیم شرر اس فن میں نہیں لکھی گئی۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں فارسی لغت ،، ہفت قلزم" اور عربی لغت" تاج اللغات ،، شائع ہوئیں۔ یہ دونوں سات سات جلدوں پر مشتمل ہیں۔ نوابان اودھ کی سرپرستی میں مغربی علوم وفنون کی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے اس سلسلہ میں کمال الدین حیدر لکھنوی کا نام آیا ہے جنہوں نے طبیعیاتی علوم پر انیس[19] رسالوں کا ترجمہ کیا۔ نواب واجد علی شاہ اختر نے بھی کچھ تصانیف اور مکتوبات اپنی یادگار چھوڑے وہ رقص و موسیقی کے بیحد شائق تھے اور عیش وعشرت کی طرف زیادہ مائل رہتے تھے اس کے باوجود انھوں نے شعر وادب میں بھی کچھ اضافے کر دیئے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مرثیہ، وغیرہ پر انھوں نے بہت کچھ کہا۔ غزلوں کے چھ دیوان اور بہت سی مثنویاں اپنی یادگار میں چھوڑیں۔ مثنویوں میں" حزن اختر" سب سے بہتر ہے۔ واجد علی شاہ نے اپنی تصانیف کی تعداد چھیالیس[۴۶] بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ" یہ سب فقیر کے کتب خانہ میں ہیں" ان میں کی ایک کتاب" بنی"، کو نہایت نایاب تصنیف کہا جاتا ہے چار سو صفحات کی یہ کتاب

ف موضوعات پر مشتمل ہے اور واجد علی شاہ کے طرز تحریر کی عکاسی کر رہی ہے وہ لکھتے ہیں

"اختر شاہِ آخر اودھ۔ یہ فقیر حقیر راقم و مصنف و مؤلف سراپا تقصیر ہے۔
پندرہ برس کے سن میں والد جنت مکان نے ولی عہد اور وزیر کیا۔ بیس
برس کے سن میں تخت اودھ بجائے حضرت اعلیٰ قائم ہوا۔ تیس برس کے
سن میں بلا صدور ظلم و ناانصافی و بے آزاری۔ رغبت بے سبب تخت
سے محروم کیا گیا۔ بیس برس سے کلکتہ محلہ موچی کھولہ ملقب بہ مٹیا برج
میں قیام ہے۔ پچاس برس کا سن ہوا چھبیس مہینے قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ
میں ناحق قید رہا۔ ساٹھ سے اوپر ماشاء اللہ چشم بدور ذکور و اناث ہیں"

مکاتیب

واجد علی شاہ کی یادگار ان کے وہ خطوط بھی ہیں جو انھوں نے اپنی جلاوطنی
کے زمانہ میں کلکتہ سے اپنی چہیتی بیوی اکلیل بیگم معروف بہ ممتاز جہاں
نام لکھے تھے۔ پیار و محبت کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے یہ خطوط لطیف اور شیریں الفاظ
لبریز ہیں۔ یہ مکاتیب ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں مرتب ہوئے اور بیگم موصوف نے بنام
نجف اکبر علی خاں توقیر کے بیش بہا مقدمہ کے ساتھ واجد علی شاہ کو بھیجا تھا وہ برٹش
میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس کا نمبر بقول ڈاکٹر محمد اشرف (ORIENTAL 5E88) ہے
یہ برٹش میوزیم نے ایک خاتون (MRS. L. HEILGARS) سے خریدا تھا۔ مہتمم کتب خانہ
خیال ہے کہ اس کی تیاری پہ تقریباً آٹھ سو روپیہ صرف ہوئے ہوں گے یہ خوب صورت
ے کی جلد کا مخطوطہ ۸ مطلا اوراق پر مشتمل ہے۔ دو ورق سادہ ہیں ہر صفحہ پر شاہِ
اودھ کا نشان یعنی دو مچھلیاں اور دیہیم تاج منقش ہے۔ معتمد کتب خانہ ذوالفقار الدولہ
مہر کے علاوہ خود واجد علی شاہ کی سرکاری مہر ہے اور ورق نمبر ۱۲ ب پر واجد علی
کی شبیہ بھی ہے جس کے سرنامہ پہ عنوان کے طور پر درج ہے۔

شبیہ حضرت سلطانِ عالم ٭ کہ ہے تصویر گویا جانِ عالم

ان موضوعات کی تفصیل ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (کراچی یونیورسٹی) کا اس مضمون میں ملاحظہ کیجیے۔

علیشاہ کی ایک نایاب تصنیف (اردو ادب کے آٹھ سال۔ مرتبہ عشرت رحمانی۔ ص ۱۴۱)

بلگرام

بلگرام، ضلع ہردوئی کا ایک بہت پرانا مردم خیز قصبہ ہے اسے سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں قاضی یوسف گازرونی نے ۱۰۱۸ء میں فتح کیا تھا وہ صاحب سیف و قلم اور علم و فن کے بھی بڑے شائق تھے ان کے زمانہ سے یہاں علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوکر مدتوں جاری رہا۔ یہاں کی خاک سے جو عالی مرتبت علماء و فضلاء اُٹھے ان میں یہ شخصیتیں بھی بڑی نامور ہوئیں۔ عبدالواحد بلگرامی، عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد بلگرامی، سید علی بلگرامی اور عمادالملک سید حسین بلگرامی۔

اس شہر کے علمی ماحول میں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے کے بلگرام کی علمی حیثیت کی عکاسی کر رہی ہے۔

کتب خانہ قاضی ابوالفتح بلگرامی اس میں فلسفہ، منطق، خصوصاً تفسیر کی بہت سی کتابیں جمع تھیں۔ قاضی ابوالفتح عرف شیخ کمال (متوفی ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء) اکبر کے عہد میں بلگرام کے قاضی تھے اس اہم عہدہ کی مصروفیات کے باوجود کتابیں لکھنے اور کتابیں جمع کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ قاضی صاحب کو خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں اپنے قلم سے لکھیں۔ قاضی صاحب کتابیں نقل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان پہ جامع اور واضح حاشیے لکھ کر ان کی قدر و قیمت بھی بڑھا دیتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ کتاب میں کہیں ایک نقطہ کی بھی غلطی نہیں ملتی۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ان کتابوں کو "صحائف آسمانی کا نمونہ اور الواح ربانی" کا نسخہ کہتے ہیں۔

کتب خانہ سید عبداللہ بلگرامی اس میں علم و ادب، شعر و شاعری اور دیگر علوم کی کتابیں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "تنقیح الکلام فی تاریخ خطۂ پاک بلگرام، مؤلفہ منشی محمد محمود عثمانی بلگرامی مرحوم و قاضی شریف الحسن بلگرامی۔ ص ۹۸۔

کتابیں تھیں۔ سید عبد اللہ (متوفی ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء) بہترین شاعر ہونے کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فنِ کتابت میں بھی مہارت حاصل تھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہفت قلم تھے۔

اس میں بہجۃ المحافل جیسی نادر کتابیں موجود تھیں

کتب خانہ شاہ طیّب شاہ طیّب (متوفی ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء) ایسے زود نویس کاتب تھے کہ چار سو پانچ سو صفحات کی کتاب شرح ملا جامی ایک ہفتہ میں نقل کر دی تھی آپ کی نسبت علامہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔

"کتب خانہ عظیمے از خوش خط خود یادگار گذاشت"

ایسے ہی کتب خانے سید عبد الواحد بلگرامی اور دوسرے اکابرین کے پاس تھے۔

کتب خانہ علامہ عبد الجلیل بلگرامی یہ بہت بڑا کتب خانہ تھا جسے سید صاحب نے بڑی لگن اور خوش اسلوبی سے مرتب کیا تھا وہ بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ فن کتابت میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ حیات جلیل (سید مقبول احمد صمدانی) میں ہے کہ خط نسخ اور نستعلیق اتنا پختہ، پاکیزہ اور شیریں لکھتے کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں، کتابیں جمع کرنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کتابیں خود لکھتے اور جہاں کہیں کوئی اچھی کتاب دستیاب ہو سکتی اس کی فکر و تلاش میں رہتے۔ کتابوں کی نگہداشت اور حفاظت کا بھی خاص خیال رکھتے تھے چنانچہ ایک خط میں اپنے بیٹے میر سید محمد کو لکھتے ہیں۔

> "برخوردار کتاب روضۃ الناظر (منتخب اشعار عربی و فارسی) اس صندوق میں رکھی ہے جو گجرات سے گھر پر لے آیا تھا۔ یہ کتاب کمیاب ہے اس کی نفاست کے سبب سے براہِ احتیاط میں اس کو ہمراہ نہیں لایا تھا اس وقت اس کتاب کی ضرورت لاحق ہے۔ کتاب کو صندوق سے نکال کر اور مخدومی میاں محمد طفیل کو دکھا کر ان سے التماس کیجئے کہ اگر فرصت ہو تو چند ورقوں پر اس کی نقل کر دیں ورنہ آپ خود

ہی اس کی نقل احتیاط کے ساتھ کر کے اور مقابلہ کر کے اپنے خط میں
ملفوف کر کے بھیج دیں کہ ضرورت شدید ہے۔ کتابوں کی احتیاط کے
بارے میں کیا لکھوں آپ پر ظاہر ہے کہ میں کتابوں کو کس قدر عزیز
رکھتا ہوں اور کتنی محنت و تلاش سے ان کو فراہم کیا ہے۔ آپ مجھ سے
بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں گے اور حزم و ہوشیاری رکھیں گے تاکہ
کتاب بیجا نہ جانے پائے۔ کبھی کبھی دھوپ بھی دکھا دیا کریں۔ مخدومی
میاں محمد طفیل نے رسالہ کلمہ طیبہ فقیر سے نقل کرنے کے لئے لیا تھا۔ جب
فارغ ہو جائے تو احتیاط کے ساتھ کتابوں میں رکھ دیجئے گا۔"

جن کتابوں کی علامہ عبدالجلیل نے بڑی احتیاط اور توجہ کے ساتھ حفاظت کی تھی وہ سب ان کے انتقال (۱۷۲۵ء) کے بعد محفوظ نہ رہ سکیں۔ کچھ ضائع ہو گئیں لیکن خدا کے فضل سے ان کے کتب خانہ کا بہترین حصہ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں پہنچ کر محفوظ و مامون ہو گیا۔

کتب خانوں کی بربادی اسی طرح بلگرام کے کتب خانوں کی کتابیں انقلاب زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گئیں اس کے باوجود انگریزوں کے ابتدائی دور تک نایاب کتابوں کے کچھ ذخیرے باقی رہ گئے تھے جن کی بدولت بلگرام انگریز سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا وہ یہاں آتے اور انمول قلمی کتابوں کو حاکمانہ اثر و رسوخ سے ردی کے مول خرید کر لے جاتے۔ بعض ناقدرشناس حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے اسلاف کی کتابیں تحفتاً بھی پیش کر دیتے تھے۔

مگر قاضی ابوالفتح کے کتب خانہ کے ذخائر میں سے خاندان قضاۃ بلگرام کے متعلق قدیم سجلات اور شاہی فرامین بربادی سے بچ رہے۔ ان کو قاضی موصوف کے ورثاء نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے رکھا ہے کہ ابتک ان کے خاندان میں قاضی شریف الحسن بلگرامی (ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ) کے پاس محفوظ ہیں ان میں قاضی محمد یوسف گازرونی کا ایک دستخطی سجل مرقوم ۵ رجادی الاول ۸۳۰ھ بھی ہے۔

قدامت اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور قابل قدر دستاویز ہے
تمام سجلات اور فرامین کو دیکھ کر بے اختیار وہ مرثیہ ہماری زبان پر آگیا جو کسی نے
نی ابوالفتح کے کتب خانہ کی بربادی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

داو حسرتا کہ زوالِ کمال شد ؛ برطالبان حیاتِ دو روزہ وبال شد

مارہرہ

بلگرام سے جن آبادیوں نے فیض پایا ان میں راقم کا وطن مارہرہ (ضلع ایٹہ) بھی
مل ہے اب اس قصبہ کی خستہ حالی دیکھکر کون یقین کر سکتا ہے کہ یہ کبھی فخر روزگار
نابغ. علماء، اطباء، شعرا اور اہل قلم کا مسکن تھا جن کے روحانی اور علمی فیوض و برکا
ثر سے جا بجا مکاتب اور چھوٹے موٹے کتب خانہ موجود تھے اس علمی ماحول میں
بوں کے جو ذخیرے جمع ہوئے انھیں حوادثات زمانہ برباد اور منتشر کرتے رہے مگر اب
مارہرہ کے پیرزادوں، قاضیوں اور زبیریوں کے گھرانوں میں کتابوں کے کچھ ذخیرے
ود ہیں جن کے تحفظ کا اگر کوئی بندوبست ہو جائے تو اسے علم و ادب کی بڑی
مت سمجھا جائے گا۔

ضی قوام الدین قاضیوں کے خاندان کے ان ممتاز عالم کا ذکر مفتی ولی اللہ
فرخ آبادی نے اپنی کتاب[۲] میں کیا ہے قاضی صاحب ایک نامور
م ملا قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء) کے شاگرد "سلم العلوم" کے شار
کی یہ شرح بہترین مانی گئی ہے انکے فرزند قاضی معین الدین بھی بڑے متقی اور صاحب علم تھے۔

قول پروفیسر نذیر احمد چیرمین شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ "فارسی خط کی قدیم ترین
نیاب کتاب "کتاب الانبیار" ہے جس کا ایک نسخہ ۴۷۴ھ کا ویانا میں موجود ہے۔ لیکن گازرونی
مجل مرقومہ ۴۳۸ھ جو کتاب مذکور سے متقدم ہے۔ دنیا میں فارسی خط کی سب سے قدیم
ہے" (ملاحظہ ہو" رسالہ فکر و نظر" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ج ۱، شمارہ نمبر ۳۔
لاحظہ ہو" عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ"، ص ۳۳۰۔

خاندان سادات اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ سید شاہ میر عبدالجلیل (ابن میر عبدالواحد بلگرامی، مصنف "سبع سنابل") بلگرام سے مارہرہ میں آکر سکونت پذیر ہوگئے تھے اور یہیں ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں وفات پائی تھی شاہ صاحب کی اولاد میں نہایت بلند پایہ عالم، شاعر اور مصنف گذرے ہیں۔ ان کے پوتے شاہ برکت اللہ (متوفی ۱۷۲۹ء) بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ فارسی میں عشقی اور ہندی میں پیمی تخلص تھا' دیوان فارسی اور مجموعہ اشعار ہندی "پیم پرکاش" ان کی یادگار ہیں شاہ صاحب کے شاعرانہ اوصاف وکمالات کا ذکر "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند" (ج ۶ ص ۹۲) نے وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی "پریم پرکاش" کی نسبت پنڈت لچھمی دھر (صدر شعبۂ سنسکرت دہلی یونیورسٹی) نے لکھا ہے کہ "یہ ہندی شاعری کا لافانی شاہکار ہے ان کی شاعری میں گیت کے سُروں کے ساتھ فلسفیانہ افکار کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے کہ ان کے پڑھنے سے غیر معمولی سرور بھی حاصل ہوتا ہے اور بے ساختہ زبان سے واہ بھی نکلتی ہے۔"

کتب خانہ درگاہ برکاتیہ درگاہ برکاتیہ[۲] (مارہرہ) حضرت شاہ برکت اللہ کے نام ہی سے موسوم ہے اس سے مدرسہ اور کتب خانہ بھی منسلک تھا یہ بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں ہزاروں کتابیں مختلف علوم وفنون کی تھیں شاہ صاحب کے پوتے حضرت[۳] شاہ حمزہؒ (متوفی ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء) نے اس کے قیام وترقی میں بڑا حصہ لیا تھا انھوں نے بہت سی نایاب کتابیں خود اپنے دست وقلم سے نقل

---

[۱] ملاحظہ ہو رسالہ برہان دہلی، ستمبر ۱۹۵۰ء [۲] درگاہ کی عالیشان عمارت نواب محمد خاں بنگش غضنفر جنگ والی فرخ آباد نے ۱۷۲۹ء میں تعمیر کرائی تھی [۳] آپ کے خاندان کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "خاندان برکات" (از مولوی سید محمد میاں مارہروی) برکات مارہرہ (از مولوی طفیل احمد بدایونی) اور "مدیح حضور نور (از غلام شبر قادری بدایونی) اسی مصنف کی اس کتاب کا دوسرا حصہ مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری لائل پور سے شائع ہوا ہے یہ حصہ خاندانِ برکات کے ایک ممتاز بزرگ سید شاہ ابوالحسن نوری میاں (متوفی ۱۹۰۶ء) کے حالات پر مشتمل ہے۔

دوسرے کاتبوں سے لکھوا کر یہاں جمع کی تھیں وہ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ خاندانِ برکات" میں ہے کہ "جمیع علوم و فنون کی کتابیں دیکھنے کا شوق تھا جو کتاب مطالعہ فرماتے اول سے آخر تک دیکھتے اور فوائد پسندیدہ اس کے اول آخر یا حاشیہ پر تحریر فرما دیتے" ان کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ دوپہر کا کھانا تناول فرمانے کے بعد کوئی نہ کوئی کتاب کتب خانہ سے نکلوا کر مطالعہ فرماتے تھے اور کتابیں لکھنے پر بھی کچھ وقت صرف کر دیا کرتے تھے اس مشغلہ کی یادگاران کی دو تصانیف "فص الکلمات اور کاشف الاستار" ہیں حضرت کے صاحبزادے سید شاہ آل احمد عرف[1] اچھے میاں (متوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء) ولی کامل اور عالم ظاہر و باطن تھے ان کی تصانیف میں "آئینِ احمدی" اتنالیس جلدوں پر مشتمل ہے مولوی سید محمد میاں رقم طراز ہیں کہ "علوم متداولہ میں سے کوئی علم و فن ایسا نہیں چھوڑا تھا جو اس میں نہ ہو۔ اس کی بہت سی جلدیں تلف ہو گئیں۔ اب فقیر کے کتب خانہ میں چند جلدیں ہیں کچھ سید مہدی حسن کے کتب خانہ میں بھی تھیں اور کچھ مولوی عبدالمقتدر بدایونی کے کتب خانہ میں ہیں" علاوہ ازیں رام پور کی رضا لائبریری میں بھی اس قابل قدر کتاب کی کئی جلدیں محفوظ ہیں۔

حضرت اچھے صاحب کی اولاد میں مولوی سید محمد میاں (خلف سید شاہ اسمٰعیل حسن) بہت بڑے عالم، مصنف اور خطیب تھے۔ انھوں نے اپنے خاندان سے متعلق ایک کتاب "خاندانِ برکات" اور "اصح التواریخ" کی دو جلدیں لکھیں ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ سید صاحب نے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ بھی اپنی یادگار چھوڑا جس میں بعض نادر کتابوں کے ساتھ تصوف اور تاریخ کی بھی بڑی اعلیٰ کتابیں ہیں ان کی وفات ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔

سادات مارہرہ سے مرزا غالب کو بھی قلبی تعلق تھا وہ ان بزرگوں کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ حضرت سید صاحب عالم سے تو انہیں اتنی گہری

---

[1] آپ کے عالی مرتبت بھتیجے حضرت سید شاہ آلِ رسول رح کے مرید و خلیفہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی تھے۔

عقیدت وارادت تھی کہ عالم خیال میں حضرت کے آستانہ پر سر نیاز جھکایا کرتے تھے وہ
ایک خط میں چودھری عبدالغفور مارہروی کو لکھتے ہیں "جناب چودھری صاحب آ
تم حضرت صاحب کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کی کفِ پا سے ملیں" اور جب غا
کی حضرت سے ملاقات کی آرزو پوری نہ ہو سکی تو اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھا "آرز
دید حد سے گذر گئی یارب جب تک صاحب عالم کو مارہرہ میں اور انوار الدولہ کو ک
میں نہ دیکھ لوں اور ان سے ہم کلام نہ ہو لوں میری روح کو قبض کا حکم نہ ہو۔"

سید صاحب[1] عالم (متوفی ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء) شعر و شاعری اور علم و ادب
بڑا بلند مقام رکھتے تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے انھوں نے فن تاریخ گوئی سے متع
ایک کتاب "تحفۃ المورخین" فارسی میں لکھی تھی جس کا قلمی نسخہ اب مسلم یونیو
کی مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ "جواہر میوزیم" میں ہے۔

ان کے پوتے سید افتخار عالم بڑے فاضل شخص تھے۔ شعر و سخن کا بھی اچھا ملک
رکھتے تھے "حیات النذیر" (سوانح مولوی نذیر احمد دہلوی) اور "محمڈن کالج ہسٹری
تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان" ان کی بہترین یادگاریں ہیں۔ اس میں مدرسۃ العل
علی گڑھ کی ابتداء ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء تک کے مفصل حالات معہ نقشہ جات عمارات
یہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ سید صاحب کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہو گیا۔

سید صاحب کے نواسے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (متوفی ۱۸۸۹ء) "جلوۂ
کے مؤلف اور غالب کے شاگرد تھے ان کی کتاب "فیض صفیر" (رسالہ تذکیر و تانیث
غالب دیباچہ بھی لکھا ہے صفیر بلگرامی بڑے پایہ کے ادیب اور شاعر تھے اور ایک اچھے کتب خانہ کے بھی مالک

---

[1] سید صاحب عالم اور مرزا غالب کی پیدائش کی تاریخوں کے سلسلہ میں یہ بات بڑی
ہے کہ ایک بار غالب نے سید صاحب سے تاریخ پیدائش دریافت کی موصوف نے جواب
کہ لفظ تاریخ کے عدد سے سنِ ولادت نکلتا ہے اس کے جواب میں غالب نے اپنا سنِ ولادت
شعر میں لکھ کر حضرت کے پاس بھیج دیا ؎

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا ٭ ان کی تاریخ میرا تاریخا
۱۲۱۱ھ/۱۲۱۲ھ
۱۷۹۶ء/۱۷۹۷ء

اسی خاندان کے ایک بزرگ سید علی احسن المتخلص بہ احسن مارہروی نہایت اعلیٰ ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے کچھ عرصہ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر بھی رہے۔ ان کا شمار داغ کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں اپنے استاد کی سوانح عمری "جلوۂ داغ" کے نام سے شائع کرائی، اردو کے قدیم شاعر ولی دکنی کا دیوان مرتب کرکے اس پر نہایت جامع اور مبسوط مقدمہ لکھا اور اپنی ایک تصنیف "تاریخ نثر اردو یا نمونہ منشوراتِ اردو" میں پچھلی چھ صدی کے اردو نثری سرمایہ کے نمونے پیش کر دیئے۔ ان کی یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

سید احسن مارہروی ذاتی کتب خانہ بھی رکھتے تھے جس میں اردو ادب سے متعلق بڑی نایاب اور کمیاب کتابیں جمع تھیں ان کی وفات (۱۹۴۳ء) کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے سید محمد احسن مارہروی (سابق ڈپٹی رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے یہ کتب خانہ مسلم یونیورسٹی کو عنایت کر دیا تھا اس گرانقدر عطیہ نے یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ اردو کی قدر و قیمت اور افادیت میں بڑا اضافہ کر دیا۔

اس موقع پر مارہرہ کے ایک علم دوست رئیس سید محمد موسیٰ (برادر نسبتی احسن مارہروی) کا نام بھی یاد رکھیئے۔ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانہ کی ۱۷۰۹ قلمی اور مطبوعہ کتابیں اسلامیہ کالج اٹاوہ کے "جواہر میوزیم" کو عطا کر دیں۔ ان میں کی ایک سو دس قلمی کتابیں نہایت نادر کہی جاتی ہیں۔

خاندان زبیری کنبوی یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ لودھیوں کے عہد میں خاندان زبیری[۱] کے بزرگوں حضرت شیخ سماء الدین، مفتی جمال، میاں لاڈن اور

---

[۱] اس خاندان کا سلسلۂ نسب حضرت زبیر بن العوامؓ سے ملتا ہے اور اسی نسبت سے یہ زبیری کہلاتا ہے سیاسی انقلابات و حوادثات کے باعث زبیری بلادِ عرب سے نکل کر ۴۵ھ (۶۶۲ء) میں سندھ آ گئے اور اس کے ایک شہر "کنبایہ" میں آباد ہو گئے جو سندھ کے قدیم دار السلطنت منصورہ سے دو منزل کے فاصلے پر "قامہل" کے قریب تھا کنبایہ میں دو سو برس رہنے کے باعث ان کا سکنی لقب کنبوی ہو گیا اور وہ "زبیری کنبوی" کہلائے جانے لگے سیاسی انقلابات کی وجہ سے نقل (بقیہ آئندہ)

یشخ جمالی وغیرہ نے علم و فن کی مسندیں دہلی میں بچھائی تھیں جب یہ خاندان مارہرہ میں آباد
تو یہاں بھی اس نے مدارس و کتب خانے قائم کرنے اور اسے ایک علمی قصبہ بنانے میں خاص
لیا۔ زبیریوں میں خواجہ عمادالدین عماد پہلے شخص ہیں جنھوں نے عہد ہمایوں (دسویں صدی
میں یہاں سکونت اختیار کی تھی اس وقت سے اب تک اس خاندان میں جو بڑے بڑے علما
اطبا، اور شعرا پیدا ہوئے۔ ان میں مولوی بزرگ علی، حکیم عنایت حسین اور چودھری ع
سرور نے بھی بڑی شہرت پائی۔ چودھری صاحب سے مرزا غالب کو جو خاص تعلق رہا اس
کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو غالب اپنے اس محبوب شاگرد کے نام لکھا
تھے اس خط و کتابت نے دہلی اور مارہرہ کا علمی ناتہ جوڑ دیا تھا۔ اصلاح و مشورے کے
غزلوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سید صاحب عالم اور چو
عبدالغفور سے غالب کی ملاقات نہ ہوسکی حالانکہ انھوں نے کئی بار مارہرہ آنے کا ارادہ
کیا چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں چودھری صاحب کو لکھتے ہیں[1]۔

"اگر زمانہ میری خواہش کے مطابق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا
ہوں۔ حضرت پیر و مرشد کا اشتیاق اور جلسہ میں تمھاری دید کا شوق
ایسا نہیں ہے کہ مجھکو آرام سے بیٹھا رہنے دیگا"

چودھری صاحب کے علاوہ مارہرہ کے زبیری خاندان میں یہ شاعر بھی مرزا غال
شاگرد[2] رہے۔ عطا[3] حسین عطا، مولوی عبدالعزیز ضیاء، حکیم اشفاق علی ذکی اور ح

بہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) سکانی کرتے رہے کنبایہ کے بعد ملتان میں سکونت اختیار کرلی پھر د
جا بسے اس کے بعد یوپی کے مختلف شہروں میرٹھ، مارہرہ، سنبھل، امروہہ، مرادآباد و
وغیرہ میں آباد ہوتے چلے گئے اس خاندان کا ذکر قزوینی کی تاریخ گزیدہ، مولانا غلام علی
بلگرامی کی خزانہ عامرہ اور دیگر کتب میں آیا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو پروفیسر ایوب قادری کا مضمون "غالب اور مارہرہ"۔

[2] ملاحظہ ہو "تلامذۂ غالب" (از مالک رام) [3] عطا حسین پر انیس مصطفٰے مینا زبی
مضمون قومی زبان (انجمن ترقی اردو کراچی) میں شائع ہوا ہے۔

یت الٰہی۔ ان کے ساتھ مارہرہ کے دیگر شاعروں کے یہ نام بھی پیش نظر رکھیے سید علی احسن
ہرو ی، امیر حسن دلیر، یوسف حسین طیش، منیرالدین حسن اشک، صدیق حسن صدیق
دھری عبدالصبور صابر، انیس مصطفےٰ منیا زبیری۔ ڈاکٹر انعام احسن ظریف، سوامی[۲]
ہرو ی اور بلال احمد بلال زبیری۔

ان شعراء کی وجہ سے بھی اس قصبہ کی علمی رونق اور شہرت بڑھی اور علمی سرمایہ میں
فے بھی ہوتے ان میں سے کچھ شعراء نے کتابیں لکھیں، بعض کے کلام بھی شائع ہوئے اور
ں کے پاس کتابوں کے بڑے اچھے ذخیرے رہے۔ سید علی احسن مارہروی کے کتب خانہ
کر گذشتہ سطور میں آچکا ہے۔

مارہرہ کے علماء میں مولوی بزرگ علی اپنے زمانہ کے بڑے جلیل القدر عالم تھے ان کے
ں مراتب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کے
ب خانہ میں ہر علم و فن کی کتابیں جمع تھیں۔ مولوی بزرگ علی ابن حسن علی مارہرہ میں پیدا
ئے تھے انھوں نے اپنے زمانہ کے بڑے بڑے فضلا سے تحصیل علوم و تکمیل فنون کر کے حضرت
عبدالعزیزؒ دہلوی کی درس گاہ سے سند حدیث لی اور تمام عمر خدمت علم میں بسر کر دی
لی گڑھ میں منصف ہو گئے تھے لیکن اس کے ساتھ تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا
وہاں کی جامع مسجد کے اس مدرسہ کا احیاء کیا جو بانی مسجد نواب ثابت خاں نے محمد
ہ کے زمانہ میں قائم کیا تھا۔ مولوی صاحب ٹونک میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر
رہے وہیں ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ء) میں وفات پائی۔ ان کی شخصیت علم و فضل کا ایک
نہ تھی۔ جس نے بہت سے طالبان علم کو سیراب کیا ان کے حلقۂ درس سے جو علماء نکلے

چودھری صاحب، عظمت الٰہی زبیری (سابق رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
والد ماجد تھے اور زبیری صاحب خاکسار کے ہم زلف ہیں۔

[۲] سوامی مارہروی کا مجموعہ کلام ''سوامی درپن''۔ ہندوستان میں شائع ہو گیا
ان کا نام سرور عالم ہے وہ سید صاحب عالم کے پڑپوتے تھے۔

ان میں مفتی عنایت[۱] احمد (مولوی لطف اللہ علی گڑھ کے استاد) بھی شامل ہیں، جنھو
۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں مدرسہ فیض عام کانپور قائم کیا تھا۔

مولوی لطف اللہ علی گڑھ کے اس مدرسہ[۲] میں ۲۷ برس (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء — ۱۳۱۲/۱۸۹۵)
میں مدرس رہے جو ان کے استاد کے اُستاد مولوی بزرگ علی نے زندہ کیا تھا یہاں تعلیم
کرنے کے لئے بقول علامہ سید سلیمان ندوی "ہر سمت سے علم و فن کے طلب گاروں کے
علی گڑھ کا رُخ کر رہے تھے ستائیس برس کی مدت میں سینکڑوں عالم اس درس گاہ سے
اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے اُس عہد کا مشکل سے کوئی نامور عالم ہو گا جس کے
کمال کا طرۂ امتیاز اس باکمال کا تلمذ نہ ہو۔"

مولوی بزرگ علی نے ردّ نصاریٰ میں کئی کتابیں لکھیں جن میں "عجالہ نافعہ ا
اثبات الحق" کے قلمی نسخے مولوی حسین احمد زبیری کے پاس ہیں اور "بشارات" کا قلمی
حبیب گنج کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ موصوف کی دینی و علمی خدمات کے سلسلے
سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی (ص ۲۹۹) میں لکھا ہے۔

"اس زمانہ میں ہندوستان کی غیر متوقع حکومت پاکر عیسائی حاکموں اور
پادریوں کا ولولہ یہ تھا کہ وہ بالآخر ہندوستان کو عیسائی بنا لیں گے
علمائے اسلام اس کے مقابلے کے لئے اٹھے ان میں سے کئی بزرگوں کے
مبارک ناموں اور کاموں سے ہماری واقفیت ہے اسی مقدس
سلسلہ کی ایک کڑی مولانا بزرگ علی ہیں۔"

مولوی بزرگ علی[۳] کے فرزند مولوی محمد صدیق[۴] کا شمار بھی ممتاز اہل علم میں ہوتا

---

[۱] مفتی صاحب پر، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بغاوت کا الزام لگا کر انھیں جزیرۂ انڈمان بھیجدیا گیا تھ
اس قید و بند کی حالت میں انھوں نے تین بلند پایہ کتابیں (علم الصیغہ، تواریخ حبیب اللہ اور تر
تقویم البلدان) تصنیف کر دیں اور یہی ان کی رہائی کا ذریعہ بنیں [۲] یہ مدرسہ اب تک مدرسۂ لطف
کے نام سے جاری ہے [۳] مولوی صاحب پر راقم کا ایک مضمون "رسالہ العلم" "کراچی" (جنوری تا ما
۱۹۷۴ء) میں شائع ہوا ہے [۴] مولوی صاحب کی صاحبزادی راقم کے والد ماجد کی حقیقی نانی تھ

بقول مصنف المشاہیر "انھیں علوم عقلی و نقلی پر عبور کلی تھا۔ ہندسہ و نجوم اچھا جانتے تھے ٹونک میں عہدۂ قضاء و افتاء پر ممتاز رہے"۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد بزرگوار کے کتب خانہ کی حیثیت برقرار رکھنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی۔ اس کی تفصیلات نہیں مل سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی صاحب کے اس قیمتی ذخیرے کا بڑا حصہ مولوی بشیر الدین کے اسلامیہ اسکول اٹاوہ کی نذر کر دیا گیا۔

مارہرہ کے اطباء میں حکیم عنایت حسین اس لحاظ سے بھی ممتاز رہے کہ ان کے گھرانے میں طبابت ایک صدی سے زائد رہی اور کتابیں تصنیف کرنے نیز ذخیرۂ کتب رکھنے کا سلسلہ تو ان کے زمانہ یعنی انیسویں صدی کے شروع سے آج تک جاری ہے حکیم صاحب کو کتابی ذوق اپنے دادا خلیفہ حافظ نصر اللہ (متوفی ۱۸۰۰ء) سے ورثہ میں ملا تھا وہ عالم و فاضل ہونے کے علاوہ بڑے زود نویس بھی تھے درگاہ برکاتیہ مارہرہ کے مدرسہ میں پچاس برس درس دیا اور اپنے ہاتھ کی نقل کی ہوئی تین سو کتابیں اس درگاہ کے کتب خانے کی نذر کر دیں بقول مصنف خاندان زبیری کنبوی مارہرہ کے صوفیائے کرام میں حضرت شاہ آل احمد عرف اچھے میاں اور سید آل برکات عرف ستھرے میاں جیسے بلند پایہ مشائخ طریقت علوم ظاہری میں آپ ہی کے شاگرد تھے۔

جہاں تک حکیم عنایت حسین کی شخصیت کا تعلق ہے وہ طبابت کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل بھی رکھتے تھے ان کی تصانیف میں "آثار احمدی[1]" ان کے پیر و مرشد حضرت اچھے میاں کے خاندان کے حالات پر مشتمل ہے "کاشف الاخبار" تاریخ کی ایک جامع کتاب ہے "سلسلہ عالیہ" میں خاندان زبیری کنبوی کے اکابر و مشاہیر کے حالات ہیں۔ "ریاض احمدی" کی ۲۰۶۸ صفحات پر مشتمل دو غیر مطبوعہ جلدیں[2] طب نظری اور طب عملی پر ہیں۔ "رموز الاطباء" میں ہے کہ "انھیں پڑھنے کے بعد پھر کسی دوسری کتب طب کی حاجت نہیں رہتی" اور حکیم صاحب کی طبابت کے بارے میں اسی کتاب میں ہے کہ "ان کی تجویز و تشخیص

---

[1] آثار احمدی کا خطی نسخہ محمد ایوب قادری (پروفیسر اردو کالج، کراچی) کے کتب خانہ میں ہے۔ [2] یہ دونوں مولوی حسین احمد زبیری کے کتب خانہ میں ہیں۔

بے خطا تھی۔ دستِ شفا خداداد ذہانت تھی۔ ان کا انتقال[1] ۱۸۴۸ء میں ہو گیا مگر
کی طبابت اور کتابوں سے ان کی محبت کے چراغ گل نہیں ہوئے ان کے اسلاف نے
انھیں روشن رکھا ہے۔

صورت یہ ہوئی کہ حکیم صاحب کے بعد ان کی اولاد میں طبابت تقریباً سوا سو[2]
برس مسلسل جاری رہ کر ان کے تیسرے پوتے حکیم محمد اصلح[3] کی رحلت کے ساتھ ۱۹۲۶
میں ختم ہو گئی مگر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ حکیم عنایت حسین کے صاحبزادے
حکیم امداد حسین نے کئی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں اور کئی ضخیم کتابیں نقل کر دیں جو اب
محفوظ ہیں۔ ان کے فرزند حکیم دلدار احمد نے فن طب میں "گلزار احمدی اور گلشن احمدی"
لکھیں۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ "کتب بینی کا از حد شوق تھا دست و قلم میں اتنا زور
تھا کہ بڑی بڑی ضخیم کتابوں کو بہت جلد لکھ لیتے تھے" ان کے بیٹے منشی فیض احمد نے اپنے
پردادا حکیم عنایت حسین کی "سلسلۂ عالیہ" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور بہت
اضافوں کے ساتھ "المشاہیر" کے نام سے ۱۹۰۰ء میں اسے شائع کرایا۔ انھوں نے اپنے باپ
کے کچھ خطوط کا ایک مجموعہ بھی "انشائے فیض احمدی" کے نام سے مرتب کر دیا تھا۔ منشی فیض
احمد کے بڑے صاحبزادے مولوی انوار احمد (سابق سفیر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
علی گڑھ) نے "مرقع کانفرنس اور "خطبات عالیہ" کی تین جلدیں مرتب کیں اول الذکر
کانفرنس کے پچپن سالہ اجلاسوں کی کیفیت درج ہے اور خطبات عالیہ میں چالیس سال

[1] حکیم صاحب کی تاریخ وفات سید صاحب عالم نے یہ کہی تھی " رفتہ بقراطِ دہر و اویلاہ
(۱۲۶۵ھ) [3] حکیم محمد اصلح راقم کے والد ماجد تھے ان کے والد بزرگوار حکیم محمد ابو صالح
کے متعلق رموز الاطباء میں ہے کہ "آپ کو پیچیدہ امراض کے علاج میں خاص شغف تھا اور کتب بینی
کا از حد شوق تھا" اسی کتاب کے صفحات ۳۰۵ تا ۳۱۰ پر عنوان "حکیم محمد اصلح مارہروی"
کے تحت ان کا اور ان کے بزرگوں کا ذکر ہے اسی میں والد صاحب کی چیچک سے متعلق ایک
تصنیف کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ رموز الاطباء ۱۹۱۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی اس میں
ہندوستان کے مشہور اطباء کے حالات اور ان کے نسخے جات وغیرہ درج ہیں۔

خطبات ہیں۔ ہر خطبہ کے ساتھ صدر کے مختصر حالات اور ان کا فوٹو بھی دیدیا گیا ہے ان کتابوں کو مسلمانوں کی تعلیمی اور قومی جدّ و جہد کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔ منشی فیض احمد کے دوسرے صاحبزادے مولوی حسین احمد نے اپنے خاندان سے متعلق دو ضخیم جلدیں "خاندان زبیری کنبوی" کے نام سے لکھکر ۱۹۵۸ء میں شائع کرائیں ان کی ایک اور کتاب "الزبیر" (سیرت حضرت زبیر بن العوامؓ) بھی شائع ہو گئی ہے۔ منشی فیض احمد کے چھوٹے بھائی حکیم ابوسعید احمد نے بھی تصوف سے متعلق ایک کتابچہ "مصباح الحق" لکھا اور یہ کہنا خودستائی نہ سمجھیں کہ خاکسار کی بھی چھوٹی بڑی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے دو کراچی یونیورسٹی کے نصاب لائبریری سائنس میں شامل ہیں۔

حکیم عنایت حسین کے گھرانے کی ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ مارہرہ کے دیگر زبیریوں نے بھی کتابیں لکھیں مثلاً اخبار المارہرہؒ (از چودھری بہاؤالدین) سلسلۂ نظامیہ (از نظام الدین حسین) امرائے ہنود از مولوی سعید احمد (بانی شیبیہ محمدیہ اسکول گڑھ) تذکرہ محسن، تذکرہ وقار اور ضیائے حیات وغیرہ (از مولوی محمد امین زبیری) دولت مغلیہ کی ہیئت ترکیبی[1] (از ڈاکٹر ابن حسن زبیری، سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن) عاقبۃ المکذّبین، خمخانہ وغیرہ (از انیس مصطفٰے مینا زبیری) اسی قصبہ کے ایک اہلِ قلم ڈاکٹر عترت حسین زبیری (سابق وائس چانسلر راج شاہی یونیورسٹی) انگریزی شاعر جان ڈانئے (DONNE ... DON) پر تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہوا ہے

---

[1] اس سو برس میں پرانی قلمی تصنیف کا نسخہ راقم کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے ؎ یہ ڈاکٹر ابن حسن مرحوم کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے مرحوم کے حالات کیلئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "ڈاکٹر ابن حسن زبیری مارہروی" (قومی زبان' انجمن ترقی اردو کراچی بابتہ جون ۱۹۷۳ء) مرحوم کی انگریزی کتاب کا نام یہ ہے۔

CENTRAL STRUCTURE OF THE MUGHAL EMPIRE AND IT[S] PRACTICAL WORKING UPTO THE YEAR 1657.

اس موقع پر خاندانِ زبیری کے چند اور مصنفین کی یہ کتابیں بھی دیکھ لیجئے
لودھی عہد میں اس خاندان کے بزرگوں مخدوم شیخ سماء الدین اور شیخ جمالی وغیرہ ک
تصانیف کا ذکر آچکا ہے عہدِ مغلیہ میں نواب شہباز خاں نے "خیر التجارب" شیخ عنای
(میر منشی شاہ جہاں) نے "بہار دانش، اشرف الصحائف" اور محمد صالح نے "عمل صا
لکھیں اسی زمانہ میں محمد شفیع سنبھلی نے "شرح قصائد عرفی" بھی لکھی تھی اس کے
بعد کی کتابوں میں یہ بھی مشہور ہوئیں۔ شمس التواریخ (حکیم نواب علی خاں امروہوی
رسالہ مبارک (از مبارک علی خاں میرٹھی) سسٹم آف ایجوکیشن اور سسٹم آف اکزا
منیشنس (از ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) مد
کے تعلیمی نظریئے وغیرہ (از ماسٹر محمد حسین خاں میرٹھی) ان کتابوں کے ساتھ مولوی عا
الٰہی زبیری میرٹھی (مترجم کلام مجید) کے دینی علوم سے ذوق و شوق کی یہ والہانہ کیف
بھی دیکھئے کہ حدیث کی ایک نایاب کتاب نقل کرنے کے لئے وہ دمشق کے ایک گاؤں
چھ ماہ تک رہے حسب بیان مصنف "زبیری کنبوی" اس پر معارف نے یہ لکھا تھ

"مولوی صاحب صرف عاشق الٰہی نہیں بلکہ عاشق رسول بھی ہیں"

کتب خانہ مولوی حسین احمد زبیری مصنفین کی تقریبًا تمام تصانیف مولو
حسین احمد زبیری کے کتب خانہ میں بمقام میرٹھ (بھارت) اب تک محفوظ ہیں ان ک
علاوہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں اور اخبارات و رسائل کے مجموعے بھی ہیں ۸۴۵
سے ۱۹۷۳ء تک کے کچھ مشہور اخبارات مجلدات کی شکل میں ہیں۔ عہد مغلیہ کے شا
فرامین بھی موجود ہیں۔ تصاویر کا وافر ذخیرہ جمع ہے اس ذخیرے میں مشاہیر قوم و ملک
نامور شعراء اور ادباء کے علاوہ زبیری خاندان کے بزرگوں کی تصاویر بھی بڑی تعد
میں ہیں۔

مولوی حسین احمد کا ۱۹۷۴ء میں انتقال ہو جانے کے بعد ان کا کتب خانہ
ہو گیا اور اب اس کی حفاظت و نگہداشت کی کوئی معقول صورت نظر نہیں آتی۔ م
صاحب ساری عمر مجرد رہے کتابیں ان کی مونس و ہمدم رہیں انھوں نے بیوی بچوں

...مہ کی محبت بھی اپنے کتب خانہ پر نثار کر دی تھی۔

...ار کتب خانے

مولوی حسین احمد کے علاوہ دیگر زبیریوں نے بھی کتابوں کے اچھے اچھے ذخیرے جمع کئے ہیں مگر فی الحال ان چار علمی شخصیتوں ...کتب خانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولوی سعید احمد مارہروی بغرض تلاش روزگار مارہرہ سے آگرہ گئے پھر تمام ...وہیں رہے انھوں نے وہاں "شعیب محمدیہ اسکول" (حال کالج) اور "صغیر فاطمہ گرلز ...سکول" قائم کئے۔ اول الذکر کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا مگر مولوی صاحب نے ...نے علمی و تصنیفی کاموں کے لئے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی قائم کر لیا تھا بقول مصنف ...ذکر سعید" انھوں نے اپنی زندگی میں قریباً دس ہزار کتابیں جمع کر لی تھیں ان میں ...رسو سے زائد قلمی و نایاب کتابیں تھیں۔ مگر یہ نفیس کتب خانہ آگرہ ہی میں رہ گیا ...حال ان کے داماد ماسٹر محمد حسین[۲] زبیری میرٹھی نے کراچی میں ایک بڑا عمدہ کتب خانہ قائم ...کیا ہے جس میں ایسی کتابیں بھی راقم نے دیکھیں جو کراچی کے اکثر کتب خانوں میں نہیں ملیں گی

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو بہ حیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی لائبریری سے ...ستفادہ کی تمام سہولتیں مہیا تھیں۔ پھر بھی انھوں نے اپنی رہائش گاہ میں بڑی اعلیٰ ...ابیں جمع کر لی تھیں انھیں واضح طور پر دیکھنے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب وہ ان کی ...ملت (۱۹۴۸ء) کے بعد علی گڑھ میں ان کی کوٹھی سے منتقل ہو کر یونیورسٹی لائبریری میں

---

[۱] مولوی صاحب کی متعدد تصانیف میں "امرائے ہنود" عہد مغلیہ کے ہندو امراء سے متعلق ہے۔ ...تاریخ اکبری" "فتحپور سیکری" اور "مرقع اکبرآباد" شہر آگرہ کی مفصل تاریخیں ہیں۔ "بوستان اخیار" میں ...آگرہ کے دو سو تراسی مشاہیر کے حالات ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذکر سعید از محمد حسین خاں ...زبیری۔ [۲] ماسٹر صاحب نے ذکر سعید کے علاوہ "مشاہیر کے تعلیمی نظریے، شان اسلام اور ...ثنائے سعید" بھی لکھی ہیں۔ انھوں نے مصر کے ایک پروفیسر ڈاکٹر احمد شلبی کی انگریزی کتاب "ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن" کا ترجمہ اردو میں "تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ" کے نام سے کیا ہے جو ادارہ ثقافت ...اسلامیہ لاہور کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔

داخل ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ریاضی کے پروفیسر تھے مگر ان کے ذاتی کتب خانے
سائنس کی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم سے متعلق انگریزی اور اردو کی کتابیں بھی تھیں
سے ان کے ذوقِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے سلسلہ میں اسے یاد رکھیئے کہ انھوں نے اپنی طالب علمی کے ز
میں ایک بڑا کام یہ کر ڈالا کہ مارہرہ میں ایک انگریزی اسکول دارالعلوم علی گڑھ کے پر
سر تھیوڈر مارلین کے نام پر "مارلین اسلامیہ اسکول" قائم کر دیا تھا جو اپنے سنِ قیام ۱۹۰
سے اب تک اہلِ مارہرہ کو فیض پہنچا رہا ہے اور یہ خیال رہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی خ
کا آغاز اسی اسکول سے ہوتا ہے اس کے بعد وہ تمام عمر دارالعلوم علیگڑھ کی خدمت کرتے رہے

اور زبیری خاندان کے ایک ممتاز بزرگ خان بہادر مولوی بشیر الدین (سرسید
رفیق خاص اور اخبار البشیر اٹاوہ کے ایڈیٹر) نے کتابیں جمع کرنے کے باب میں ایک مثا
قائم کر دی تھی انھوں نے اپنے قائم کئے ہوئے "اسلامیہ اسکول اٹاوہ" (حال کالج) س
ساتھ ایک کتب خانہ قائم کیا تھا اس کے بعد موصوف نے ایک اور کتب خانہ قائم کر
کا منصوبہ بنایا انھوں نے علمی گھرانوں کے ذخیرۂ کتب حاصل کرنے کے لئے ضعیفی کی
اور مالی وسائل کی قلت ہونے کے باوجود ہندوستان کے مختلف شہروں کے چکر لگا
ان کی سعی و کاوش سے مارہرہ وغیرہ کے علاوہ دور دراز کے علاقوں مثلاً حیدر آباد د
سے بھی قیمتی کتابوں کے ذخیرے اٹاوہ پہنچ گئے تھے۔ مرحوم نے اپنے اس منصوبہ کو جس
عملی شکل دی اُسے مولوی ابرار حسین فاروقی[۲] نے یوں بیان کیا ہے۔

"خان بہادر صاحب مرحوم (مولوی بشیر الدین) نے غالباً ۱۹۱۰ء میں اس کا
آغاز کیا وہ بھی اس طرح کہ پہلے اپنے چند احباب داعزا سے کچھ قلمی کتابیں لے کر

---

[۱] خاکسار کا مضمون "ایک ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد" العلم (کراچی) سلور جوبلی نمبر
(اپریل تا ستمبر ۱۹۷۵ء) میں شائع ہوا ہے۔

[۲] مولوی صاحب نے جواہر میوزیم کے ذخیرہ مخطوطات کے ایک حصہ کی نہایت جامع اور مشرح
مرتب کی ہے جو "جواہر زواہر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ان کو اسکول کی لائبریری میں محفوظ کیا اس کے بعد وقتاً فوقتاً اسی طرح سے نہ صرف کتابیں بلکہ پرانے فرامین اور خوش خطی کی بہترین قدیم وصلیاں حاصل کر کے اضافے فرماتے رہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ مرحوم کے پاس نہ تو اس کے لئے سرمایہ تھا کہ وہ ایسی کتابیں خرید کر رکھتے اور نہ اس کے لئے کوئی سرمایہ دار معاون تھا جو اس سلسلہ میں ان کا ہاتھ بٹاتا بہرحال کسی حد تک جب ذخیرہ قابل اعتنا ہو گیا تو انھوں نے اس کو لائبریری سے علیحدہ کر کے اسکول ہی کی عمارت کے ایک کمرہ میں منتقل کر دیا اور غالباً ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کے اس وقت کے کلکٹر اٹاوہ مسٹر ایچ۔ ۔ کے گریسی کے نام سے اس کو موسوم کر کے اسکا نام "گریسی میوزیم" رکھا جو وقت کا تقاضا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اس کا نام پنڈت جواہر لال نہرو کے نام پر "جواہر میوزیم" رکھا گیا اور اسے اٹاوہ سے علی گڑھ منتقل کر دیا گیا گو اب یہ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کا ایک حصہ ہے مگر یہاں بھی اس کی انفرادی حیثیت برقرار رکھی گئی ہے۔

کتب خانوں کی بربادی مارہرہ کے ذکر کے درمیان چار کتب خانے آ گئے تھے اس کے بعد قابل ذکر بات یہ ہے کہ اہل مارہرہ نے مختلف زمانوں میں کتابوں کے جو ذخائر جمع کئے تھے وہ برباد ہوتے رہے جب ۱۷۴۹ء میں وزیر الوالمنصور صفدر جنگ کی فوجوں نے مارہرہ کی غارت گری کی تو جان و مال کی بربادی کے ساتھ کتابوں کے ذخائر کا بھی بڑا حصہ برباد ہو گیا کہا جاتا ہے کہ درگاہ برکاتیہ کے کتب خانہ میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس کی بہت سی کتابیں تلف ہو گئی تھیں اور یہ بات بڑی افسوس ناک تھی کہ ذاتی کتب خانوں کے جو مالک غریب ہوتے وہ کبھی کبھی کتابیں بیچ کر اپنی ضرورتیں پوری کر لیتے تھے اور کچھ کتابیں لوگوں کی لاپرواہی اور ناقدری کی وجہ سے بھی دیمک کی غذا بن جاتی تھیں اس تباہی و بربادی کے باوجود مارہرہ میں ۱۹۴۷ء کے بعد تک ہزاروں کی تعداد میں کتابیں موجود رہیں۔ ان ہی میں سے کئی ہزار کتابیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج اٹاوہ کو عطا کر دی گئی تھیں جن کا

ذکر پچھلی سطور میں آگیا ہے لیکن آجکل بھی مارہرہ کتابوں سے خالی نہیں ہے وہاں کے
اسکول میں بڑا اچھا کتب خانہ ہے چند علمی گھرانوں میں بھی کتابوں کے کچھ ذخیرے
گئے ہیں اور مارہرہ کی قدیم روحانی اور علمی عظمت کی ایک لائق زیارت یادگار" درگا
برکاتیہ" بھی روحانی فیض پہنچا رہی ہے۔

فرخ آباد اور شمس آباد

بلگرام کے نواح میں جو قصبات مردم خیزی کے لحاظ سے مشہور ہوئے ان میں فرخ آباد
اور شمس آباد بھی شامل ہیں۔ ملا قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء)
کے علم وفضل کی لنسبت لکھا ہے[1] کہ" در شمس آباد مسند افادہ گستر و جم غفیر را بہ اضافہ
دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل کرامت نمود"۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اب سے ڈھائی سو برس پہلے ضلع فرخ آباد کے شہر
شمس آباد میں مدرسوں اور کتب خانوں کی تشکیل کا سامان فراہم ہو گیا تھا۔ فرخ آباد
میں نواب محمد خاں بنگش (والی فرخ آباد، متوفی ۱۷۴۳ء) نے ایک مدرسہ قائم کیا
جس کے نام سے وہ مقام اب تک مشہور ہے جہاں یہ مدرسہ تھا اسے یاد رکھیئے کہ ان
نواب صاحب کے خاندان میں وہ نواب تجمل حسین خاں گذرے ہیں جن کے لئے غالب نے
یہ شعر کہا ہے ؎ "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے" اور اس کے ساتھ یہ بھی کہدیا
؎ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ؛ کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

مدرسہ اور کتب خانہ اٹھارویں صدی میں یہاں ایک زبردست عالم مفتی ولی اللہ
فرخ آبادی (متوفی ۱۸۳۲ء) تھے جنھوں نے ایک مدرسہ موسوم
"فخر المرابع و ربیع المفاخر"[2] قائم کیا تھا جس کے سارے مصارف وہ خود برداشت کرتے تھے۔

[1] مآثر الکرام از علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ص ۲۱۰۔ [2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو" عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ" (مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، مترجمہ حکیم شریف الزماں اکبرآبادی، مرتبہ محمد ایوب قادری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی) ص ۲۶۴۔

ے ساتھ کتب خانہ بھی تھا جسکا ذکر ولیم اروِن (مصنف تاریخ فرخ آباد) نے کیا ہے۔ مفتی صاحب
کی تصنیفات و تالیفات میں کی ایک کتاب "تفسیر موسومہ نظم الجواہر" کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "وہ
لکھنے کے لائق ہے اور اس قابل ہے کہ دیدۂ و دل اس کے سپرد کر دیئے جائیں" ان کی ایک کتاب
تاریخ فرخ آباد" نہایت اہم ثابت ہوئی ہے۔ خیال رہے کہ ولیم اروِن نے فرخ آباد کی تاریخ لکھتے
وقت مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کی اس کتاب سے استفادہ کیا تھا۔

حافظ رحمت خاں

روہیلکھنڈ کی علمی اور تعلیمی ترقیوں میں نواب حافظ الملک رحمت خاں کی علم پرور شخصیت
کو بڑا دخل رہا ان کے دورِ حکمرانی میں یہاں کے متعدد شہر تعلیم کے زبردست مراکز بن گئے[1] انھوں
نے بریلی، شاہجہاں پور اور پیلی بھیت وغیرہ میں جو مدارس قائم کئے تھے ان میں طلباء کے لئے
وظائف مقرر تھے۔ عورتوں کی تعلیم کیلئے خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ مختلف شہروں میں لڑکیوں
کے مدارس بھی قائم تھے۔ اس سلسلہ میں مولوی ابوالحسنات ندوی[2] تحریر کرتے ہیں کہ "حافظ رحمت
خاں نے اپنی نوابی کے زمانہ میں روہیلکھنڈ کے مشہور شہروں کو رشک دہلی بنا دیا۔ مولانا بحرالعلوم
(مولانا عبدالعلی فرنگی محلی) کو اصرار و التجا سے شاہ جہاں پور بلایا ان کے لئے ایک خاص مدرسہ
قائم کیا جس میں مولانا بیس برس تک مشغول درس و تدریس رہے" مولوی صاحب ہی کی تحریر
سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب نواب صاحب نے تین لاکھ کے صرفہ سے ایک عالی شان مسجد پیلی بھیت
میں تعمیر کرائی تو اسی سلسلہ میں مدرسہ کی عمارت بھی بنوائی تھی۔ موصوف کی علمی اور تعلیمی
دلچسپیوں کا یہ حال تھا کہ جب کوئی طالب علم تعلیم سے فارغ ہوتا تو وہ خود اپنے ہاتھ سے اس
کے سر پر دستار فضیلت باندھتے تھے

کتب خانہ حافظ رحمت خاں ان مدارس کے کتب خانوں کے علاوہ حافظ رحمت خاں کا

---

[1] اس کتاب پر ڈاکٹر مختارالدین احمد کا ایک مضمون انجمن ترقی اردو ہند، علیگڑھ کے رسالہ "اردو ادب" شمارہ نمبر ایک میں ملاحظہ کیجئے آپ نے ایک مکمل فصل جو فرخ آباد کے شعراء پر مشتمل ہے ایڈٹ کر کے شائع بھی کی ہے۔ [2] ملاحظہ ہو "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" ص ۴۳، ۵۱۔

کتب خانہ بھی تھا جسے ان کی شکست و شہادت (۱۷۷۴ء) کے بعد نواب شجاع الدو
لکھنؤ لے گیا تھا ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کی فہرست مرتب کی تھی جس کی ایک ج
۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی اس نے لکھا ہے[1] ۔

"مجھے اسلحہ خانہ میں چالیس صندوق خراب وخستہ حالت میں رکھے ہوئے ملے ان میں حافظ رحمت خاں کا تمام علمی خزانہ موجود تھا۔ کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی بعض پشتو کی تصانیف تھیں جو بڑی کاوش کے ساتھ بکمال حسن و خوبی بہادر اور صاحب علم وفضل روہیلہ سردار کیلئے لکھی گئی تھیں"۔

حافظ رحمت خاں کے کتب خانہ کی ایک کتاب "تواریخ رحمت خانی" خدا بخش لائبر
پٹنہ میں ہے اس میں یوسف زئیوں کے کابل پر قبضہ کرنے اور ان کے ہندوستان آ
کے مفصل حالات درج ہیں۔ یہ ۱۶۲۲ء میں پشتو میں لکھی گئی تھی اور حافظ رحمت خا
نے ۱۷۷۰ء میں اس کا ترجمہ آسان فارسی میں کرایا تھا۔

غرض عہد مغلیہ کے آخری دور میں بھی یوپی کے ہر علاقہ میں علم وادب کا چرچا تھ
درس و تدریس کی مسندیں بچھی ہوئی تھیں اور کتابوں کے ایسے قدردان موجود تھے جن
پاس کتابوں کے بڑے اچھے ذخیرے جمع تھے۔ اس زمانہ میں علم کو صرف علم کی خاطر حا
کیا جاتا تھا اور مادی منفعت سے کوئی سروکار نہ ہوتا بلکہ تعلیمی نظام میں خلوص کا
اور رفاہِ عام کا ولولہ کارفرما رہتا تھا گو اس گذشتہ علمی عظمت کی اب صرف داس
باقی رہ گئی ہے لیکن اس کے غیر فانی نقوش ہمیشہ اس زاویہ نظر کی طرف رہنمائی کر
رہیں گے جو انسانوں میں حقیقی انسانیت اور اخلاقی قدریں پیدا کرتا ہے۔

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں مولفہ سید الطاف علی بریلوی ص ۲۹۸۔ اس کے علاوہ حافظ رحمت خاں
حالات "گل رحمت" (محمد سعادت یار خاں) میں بھی درج ہیں۔

باب پنجم

برّصغیر پاک وہند کے کتب خانے

سندھ میں کتب خانوں کی تشکیل و ترقی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان فاتح کی حیثیت سے جہاں پہونچے وہاں
انھوں نے بلا تاخیر اسلام اور علم کی شمعیں روشن کردیں۔ سندھ میں بھی یہ ہی ہوا کہ
محمد بن قاسم کی فتوحات نے اس علاقہ میں علمی وثقافتی ترقیوں کی راہیں کھول دی
تھیں۔ مورخین بشاری، مقدسی، بلاذری اور مسعودی وغیرہ نے سندھ کے مفتوحہ
شہروں کی رونقوں، وہاں کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں کے تذکروں کے ساتھ مسجدوں
کے قائم ہونیکا بھی واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ بات سابقہ اوراق میں بیان ہوچکی ہے کہ مسجدوں
کے ساتھ مدرسے اور مدرسوں کے ساتھ کتب خانے قائم کرنا قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں
کا قومی شعار تھا چنانچہ سندھ کی قدیم مساجد اور قدیم علمی مراکز دیبل، منصورہ، اور
ٹھٹھ وغیرہ میں مدرسے اور کتب خانے بھی قائم ہوگئے تھے۔

سندھ میں پہلا اسلامی کتب خانہ

محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں دیبل پر حملہ کرکے اُسے فتح کرلیا۔ بقول
بلاذری (مصنف فتوح البلدان) "فاتح سندھ نے وہاں مسلمانوں
کی آبادی قائم کی ایک جامع مسجد بنائی اور چار ہزار مسلمانوں
کو آباد کیا" ان مسلمانوں کی تعلیم وثقافت کا مرکز یہی مسجد تھی۔ یہاں کتابوں کے جو
ذخیرے جمع ہوئے ان ہی کو سندھ کا پہلا اسلامی کتب خانہ کہا جا سکتا ہے محمد بن
قاسم جو علاقہ فتح کرتا وہاں اسی طرح مسلمانوں کو آباد کرکے مسجدیں تعمیر کرا دیتا اور

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سندھ میں عربوں کی آمد اور تبلیغ اسلام" از محمد
... قادری (ماہنامہ ثقافت لاہور)

یوں مدارس اور کتب خانوں کا دائرہ بھی بڑھتا رہتا۔ خیال رہے کہ یہ نوجوان مجا
۷۱۲ء میں سندھ اور ملتان کا علاقہ فتح کر کے عرب واپس چلا گیا اس کے بعد بھی
ایک عرصہ دراز تک علم و فضل کا مرکز رہا اور یہاں ابراہیم بن محمد دیبلی اور احمد
عبداللہ دیبلی جیسے نامور علماء پیدا ہوئے۔ دیبل کے علاوہ سندھ کا شہر منصورہ بھی
علمی اعتبار سے بڑا مرتبہ رکھتا تھا۔ مقدسی لکھتا ہے

"منصورہ سندھ کا سب سے بڑا شہر اور پایہ تخت ہے اس کی حیثیت
دمشق کی طرح ہے جامع مسجد اینٹ اور پتھر سے بنی ہوئی ہے باشندے
نرم خو اور بامروت ہیں اسلام ان کے ہاں زندہ اور تر و تازہ ہے
یہاں علم اور علماء کی کثرت ہے"

منصورہ کے علماء و فضلاء میں ابو محمد منصوری داؤدی کا نام بھی آیا ہے وہ یہا
کے قاضی القضات اور صاحب تصانیف عالم تھے ان کے پاس ایک کتب خانہ بھی تھا۔

قدیم مدارس میں حسین بن علی بخاری کا مدرسہ بھکر میں تھا اور قصبہ بدین
ایک مدرسہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مدرسہ کے مدرس مخدوم طالب
کو عالمگیر[1] نے مدرسہ کے صرفہ کیلئے ایک رقم عطا کی تھی۔

سندھ کی یہ بڑی خوش بختی ہے کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۷۱۱ء)
بعد انگریزی عمل داری شروع ہونے (۱۸۴۳ء) تک یہاں مسلسل مسلم حکومت
قائم ہوتی رہیں اور اس طویل دور میں ایسے علم دوست فرماں روا بھی حکومت ک
رہے جن کی علم نوازی کے اثر سے تحصیل علم اور کتب بینی کا ذوق و شوق پھیلا اور ک
کی صورت گری کے اسباب بھی فراہم ہوئے۔

لیکن اسے نہ بھولنا چاہیئے کہ سندھ میں دینی اور علمی فضا پیدا کرنے میں
کے مشائخ اور علماء و فضلا کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی مذہبی، علمی اور تدریسی سرگ
کی بدولت سندھ کو علمی دنیا میں جو مرکزی و امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا ا

[1] تحفۃ الکرام مولفہ قانع تتوی۔ ص ۲۲۷ بحوالہ تاریخ تعلیم ص ۲۹۸۔

اندازہ مورخ اکبر شاہ خاںؒ کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"سندھ کے ملک نے علم وفضل وتہذیب میں یہاں تک ترقی کی
تھی کہ اس کی شعاعیں بنگال وتبت تک پڑنے لگیں اور علم
وعلماء کی قدر دانی نے ہندوستان کے باکمالوں کو عزت کے
ساتھ بغداد پہنچا دیا تھا۔"

اس زمانہ میں یہاں نامور اور بے مثل علماء وفضلاء کی اتنی کثرت تھی کہ ان کے ذکر کے لئے بھی ایک مخصوص کتاب کی ضرورت ہوگی۔ سندھ کے ایک عالم ابومعشر کی علمی فضیلت وعظمت کا یہ حال تھا کہ جب ۱۷۰ھ میں ان کا مدینہ میں انتقال ہوا تو ان کے جنازہ کی نماز خلیفہ ہارون رشیدؒ نے پڑھائی تھی۔ ان کے فرزند ابوعبدالملک، حافظ ابومحمد خلف ابن سالم، ابونصر سندھی، ابوالعطاء اور ابواسحاق نے حدیث وفقہ اور شعر وادب کی دنیا میں بڑی ناموری پائی۔ جہاں تک اس زمانہ کے کتب خانوں کا تعلق ہے ان کی تفصیلات نہیں مل سکیں لیکن ان کی تعداد وغیرہ کا اندازہ علماء وفضلاء اور درسگاہوں کی کثرت سے لگایا جا سکتا ہے۔

ٹھٹھہ اس موقع پر ٹھٹھہ کو دیکھئے جہاں قرون وسطیٰ میں مدارس کثیر تعداد میں موجود تھے جن کے دروازے عوام اور خواص کے لئے کھلے رہتے تھے۔ سندھ کے حکمران جام نظام الدین (۸۶۶ - ۹۲۳ھ) نے اسی شہر میں تعلیم پائی تھی ایک یورپین سیاح الیگزنڈر ہیملٹن کی تحریر کے مطابق یہاں سترہویں صدی عیسوی میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدارس تھے۔ ہیملٹن ۱۶۸۸ء میں ٹھٹھہ آیا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی ہوتا تھا اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت یہاں درسگاہی کتب خانوں کی تعداد چار سو تھی اور اٹھارویں صدی کے پرآشوب دور میں جو علماء فضلاء ٹھٹھہ میں درس وتدریس کی مسندیں بچھائے ہوئے تھے۔ ان میں

(۲) آئینۂ حقیقت نما از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، ص ۱۵۶۔
(۳) ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ ص ۴۔

آٹھ علماء (علی شیر قانع تتوی، مخدوم محمد ہاشم، مخدوم محمد معین، مخدوم محمد ضیاالد
میاں نعمت اللہ، میاں محمد صادق، اخوند محمد شفیع، اخوند ابوالحسن) کے متعلق لکھا
ہے کہ "یہ تمام بزرگ صاحبانِ تصانیف و درو دین تھے ان میں سے ہر ایک کے پاس الگ
الگ کتب[1] خانہ تھا جن سے نہ صرف وہ فائدہ اٹھاتے تھے بلکہ دوست، احباب بھی وق
فوقتاً استفادہ کرتے رہتے تھے"۔

اسے یاد رکھیئے کہ سندھ میں ٹھٹھ کو بڑی علمی فضیلت رہی ہے جس کی نشانیاں
مشائخ و علماء کے مزارات، قدیم مساجد اور خانقاہیں ہیں یہاں کے حکمرانوں میں سند
کے جام خاندان کے ایک فرماں روا جام نندو (جام نظام الدین) کی علم دوستی اور دیند
کو بڑا سراہا جاتا ہے اور اس کے دور حکومت (۱۴۶۱ء-۱۵۰۸ء) کو عہد زریں کہا جا
ہے مغلیہ عہد میں بھی یہ شہر علم کا ایک بڑا مرکز تھا اس دور کی یادگار شاہجہان اور عالمگ
کی بنوائی ہوئی دو عالی شان مساجد ہیں جنھوں نے اس شہر کو روحانی اور علمی رونق
بخشی تھیں۔
ٹھٹھ کی عظمتِ رفتہ کو ذیل کی تحریر[2] میں یوں دکھایا گیا ہے۔

"ایک زمانہ تھا کہ ٹھٹھ کی مساجد و مدارس میں اصحاب علم پر غرناطہ، قرطبہ،
اور کوفہ و بغداد کے اصحاب فضل و کمال اور تشنگانِ علوم و فنون کا دھوکا
ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ٹھٹھ کا فیضانِ علم و فکر نہ صرف سندھ میں بلکہ
ہندوستان اور اسلامی ممالک اور بغداد و حجاز تک پھیل گیا۔ ٹھٹھ کی
آبادی جنت نگاہ اور رشکِ کوفہ و بغداد بن گئی"۔

اور سندھ کے تاریخی شہر ٹھٹھ میں بزرگوں کے مزارات کی زیارت اور تاریخی مقا
سجاول کی سیر کرتے وقت یہ پیش نظر رکھیئے کہ ایک زمانہ میں یہاں کے علمی و تہذ

---

[1] رسالہ سرحد کراچی مارچ ۱۹۷۴ء۔

[2] ملاحظہ ہو علم و آگہی (کراچی) کا خصوصی شمارہ بابتہ ۱۹۷۴-۷۵ء جلد دوم
ص ۳۷۲۔ حوالوں میں جہاں علم و آگہی آئے اس سے یہ ہی شمارہ سمجھا جائے۔

...ول نے خواتین تک کے دلوں میں علم سے الفت و رغبت پیدا کر دی تھی اس کی مثال
...جاول (ضلع ٹھٹھہ) کی ایک خاتون زیب النساء کے اس کارِ خیر میں ملتی ہے کہ انھوں نے
...رت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے اپنی زمین کا ایک حصہ وقف کر دیا
...چنانچہ وقف کی شرائط کے مطابق شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد میں قائم کر دی گئی ہے

...رالفیوض الہاشمیہ اس علم نواز خاتون کے ساتھ ان کے شوہر سید عبد الرحیم کو بھی یاد رکھئیے جنھوں نے اب سے ۷۵ برس پہلے ۱۹۲۰ء میں ایک
...ی مدرسہ " دار الفیوض الہاشمیہ " سجاول میں قائم کیا تھا جس کے سینکڑوں تعلیم یافتہ
...ائے دین کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس مدرسہ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ " اس
سندھ میں اور خصوصاً ضلع ٹھٹھہ میں علوم اسلامی کی اشاعت اور تعلیم کے فروغ
نہایت اہم حصہ لیا ہے اس کی چودہ شاخیں سجاول اور اسکے گرد و نواح میں قائم ہیں "

...داد کوٹ لاڑکانہ ضلع میں شہداد کوٹ کا تاریخی قصبہ بھی علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز رہا ہے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ " اس کی خاک
بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے اور ایک زمانہ تک یہ سندھ میں مسلمانوں کا کعبۂ علم و فکر
...ا" یہاں کے ایک متبحر عالم مولانا نور محمد (۱۲۰۶ھ - ۱۲۹۶ھ / ۱۷۹۱ء - ۱۸۷۸ء) نے ایک دینی درس گاہ " مدرسہ نور محمدیہ "
...و وہ نام مدرسہ حلیمیہ) قائم کی تھی اس مدرسے کے سلسلے میں ذیل کی تحریر ملاحظہ کیجئے۔

> " سندھ میں علمائے دین کے دو سلسلے ایسے ہیں جن سے آج تک سندھ کا شاید ہی کوئی عالم الگ ہو ان میں سے ایک سلسلہ خلیفہ محمد یعقوب ہمایونی سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا نور محمد شہداد کوٹی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دونوں علمائے دین علامہ عبد الحلیم کنڈوڑی کے شاگرد رشید تھے یہ دونوں سلسلے دو جوئے شیریں و کوثر و تسنیم تھے جن کا منبع و مبداء ایک تھا اور جنھوں نے سندھ میں مزرعِ علم و عرفان کو کامل دو صدیوں سے سرسبز و شاداب کر رکھا ہے "

علم و آگہی - ص ۳۷۷، ۳۳۳ -

گوٹھ پیر جھنڈا اور امروٹ یہ دونوں قصبات بھی تعلیم کے بہت بڑے مراکز رہے ہیں گوٹھ پیر جھنڈا میں علوم دینی اور شاہ ولی اللہؒ کے افکار کی تعلیم کے لیے ایک درس گاہ "دارالرشاد" ۱۹۰۱ء میں قائم ہوئی تھی جس سے ہزاروں باعمل عالم نکلے مولانا عبیداللہ سندھی اس مدرسہ کے صدر مدرس اور مہتمم رہے تھے۔

امروٹ میں مولانا عبیداللہ سندھی نے بھی ایک دینی درس گاہ دیوبند کے طرز پر قائم کی تھی مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا خوشی محمد (لاڑکانہ) اسی کے تلامذہ میں سے تھے اس درس گاہ کے کتب خانہ کیلئے مصر اور استنبول تک سے کتابیں منگائی جاتی تھیں۔

امروٹ کے ساتھ یہاں کے دو خدا رسیدہ علماء تاج محمد امروٹی اور ابو الحسن امروٹی کو بھی یاد رکھئے جن کی دینی اور علمی خدمات کے سلسلے میں کتب خانوں کو فائدے پہنچے اول الذکر نے ایک دینی مدرسہ "قاسم العلوم" کے نام سے کھری (ضلع سکھر) میں قائم کیا تھا جس کا فیض ابتک جاری ہے۔

مدرسہ دارالھدیٰ ٹھیڑی اسے ۱۹۱۱ء میں قاضی عبداللہ نے ٹھیڑی (ریاست خیرپور) میں قائم کیا تھا جو بدستور جاری ہے اس کی فیض رسانی کے سلسلہ میں لکھا ہے[1] کہ "اس وقت خیرپور، سکھر، نواب شاہ کے اضلاع میں ایسے بیسیوں مدارس دینیہ خدمات انجام دے رہے ہیں جو مدرسہ کے تلامذہ و فیض یافتگان نے قائم کئے ہیں اور جو مدرسہ دارالھدیٰ کی شاخوں کی حیثیت رکھتے ہیں"

مدارس کے کتب خانے ان مدارس کے علاوہ سندھ مدرسہ اور مدرسہ مظہر العلوم (کراچی) سندھ اورینٹل کالج اور مدرسہ رکن الاسلام (حیدرآباد) دارالعلوم اشرفیہ ٹنڈو الہ یار دارالعلوم قاسمیہ میرپور اور دیگر بہت سی درس گاہیں سندھ میں ہیں ان کے سلسلہ میں یہ پیش نظر رکھئے کہ سندھ کے تمام اداروں سے کتب خانے منسلک ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کے مدارس اور کتب خانوں نے اہل سندھ کی ذہنی اور فکری تربیت کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

---

[1] علم و آگہی - ص ۶۷ -

سندھ کے کتب خانے

سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ۱۸۴۳ء میں ہوا مگر انھوں نے یہاں کے قدیم
رس اور کتب خانوں کو ترقی دینے اور نئے علمی ادارے قائم کرنے کی طرف
خواہ توجہ نہیں کی بالآخر کراچی کے علم دوست کمشنر مسٹر فریئر کو یہ خیال آیا کہ کراچی
ایک ایسی لائبریری قائم کی جائے جس سے پبلک کے تمام طبقے مستفید ہو سکیں
چہ ۱۸۵۲ء میں اسی کے نام پر "فریئر ہال لائبریری" قائم کی گئی اس کے چند سال بعد
نیٹو جنرل لائبریری" کھولی گئی ۱۸۶۹ء میں ایک کتب خانہ سکھر میں کھلا ۱۸۷۲ء
حیدرآباد جنرل لائبریری" اور ۱۸۸۸ء "نیٹو جنرل لائبریری" بمقام حیدرآباد قائم
ں اور ۱۸۸۴ء میں ایک عوامی کتب خانہ لاڑکانہ میں قائم ہوا۔ ان چھ کے علاوہ نو
ب خانے میرپور خاص، نواب شاہ اور جیکب آباد وغیرہ کے اضلاع میں قائم ہوئے
طرح ۱۸۵۲ء سے ۱۹۲۰ء تک یعنی اڑسٹھ برس کے عرصہ میں پندرہ[1] کتب خانوں کا
عمل میں آیا ان کی تعداد کتب کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں کے دس
خانوں میں بائیس ہزار دو سو (۲۲۲۰۰) کتابیں تھیں۔

لیکن اس دور میں بھی ارباب علم اور اہل قلم کی سرگرمیوں کے اثر سے مدارس اور
خانوں کی ترقی ہوتی رہی ان حضرات کی رہائش گاہوں میں بھی کتابوں کے ذخیرے
ئے جیسا کہ ثبوت ان ذاتی کتب خانوں سے ملتا ہے جو نہ صرف شہروں بلکہ قصبات میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔

---

[1] تعداد مولوی نثار الحق کے مضمون "انگریزی دور میں سندھ کے کتب خانے سنہ ۱۹۲۰ء تک"
سالہ سرحد کراچی، مارچ ۱۹۷۴ء سے لی گئی ہے انھوں نے یہ معلومات ۱۹۲۰ء کے گورنمنٹ گزٹ سے
ہیں۔ سندھ کے کتب خانوں کے سلسلہ میں مخدوم امیر احمد رحمت فرخ آبادی کے مضامین "سندھ
خانے" "سکھر کے کتب خانے" (مندرجہ الزبیر کتب خانہ نمبر ص ۲۰۱، ۲۰۴) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اب چند کتب خانوں کے مختصر حالات ضلع وار پیش کئے جا رہے ہیں ۔

کراچی

فریئر ہال لائبریری یہاں مسٹر فریئر کی یہ یادگار ۱۸۵۲ء سے اب تک قائم ہے ان
خواہش تھی کہ کراچی میں ایک ایسی لائبریری قائم کی جائے جس سے پبلک کے تمام طبقے ا
کر سکیں اور جو عوام کے چندوں سے چلائی جائے ان کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے
لئے جیم خانہ یا لیڈیز کلب کے ایک کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کردی گئی ا
اسے پبلک کی ملکیت قرار دیدیا گیا اس کے ساتھ ایک عجائب گھر بھی تھا لیکن ۱۸۹۲
میں اسے لائبریری سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ یہ لائبریری آج کل کراچی کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہوتی

خالق دینا ہال لائبریری "نیٹو جنرل لائبریری" کراچی میں تقریباً ۱۸۶۰ء میں قائم ہوئی
اور ۱۹۲۰ء تک اس میں تین ہزار مجلدات تھے جن میں سے بعض کت
نہایت نایاب اور عجیب و غریب تھیں ہر سال نئی کتابوں کی خر
کے لئے دو سو پچاس یا تین سو روپیہ کی رقم منظور کی جاتی تھی۔ دارالمطالعہ میں کئی اخ
اور رسالے بھی آتے تھے یہ لائبریری ہر طبقے کے تعلیم یافتہ دلیسی افراد کے لئے قائم کی گئی
۱۹۰۵ء کے بعد اسے غلام حسین خالق دینا ہال میں منتقل کردیا گیا تھا۔ اور اب اس
نام "خالق دینا ہال لائبریری" ہے۔

اسے یاد رکھیے کہ کراچی جیسے مرکزی شہر میں صنعت و حرفت اور تجارت کی گہما
کے باوجود علمی سرگرمیاں جاری رہیں ۱۸۵۲ء یعنی فریئر ہال لائبریری کے قیام سے
کتب خانے اور مدرسے برابر قائم ہوتے رہے قیام پاکستان کے بعد یہاں سر
درس گاہی، ذاتی اور علمی و ادبی اداروں کے کتب خانے جس کثیر تعداد میں قائم ہوئے
کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہاں صرف عوامی کتب خانے چھیالیس ہیں۔ اب چند کتب خانوں کے نام ملاحظہ

ؔ ان حالات کے کچھ حصے رسالہ سرحد کراچی (مارچ ۱۹۶۴ء) کے ص ۷ تا ۱۱۔ اور کتب خ
نمبر النزبیہ کے ص ۲۰۲ تا ۲۰۷ سے لئے گئے ہیں۔

دیگر مشہور کتب خانے کراچی یونیورسٹی لائبریری کتب خانہ مدرسہ عربیہ مظہر العلوم، کتب خانہ دار العلوم کورنگی، لیاقت میموریل لائبریری، یوسف میموریل لائبریری (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی لائبریری، انجمن ترقی اردو لائبریری، اردو بورڈ لائبریری، مجلس علمی لائبریری، کراچی تھیوسافیکل سوسائٹی لائبریری، علامہ شبیر احمد عثمانی لائبریری، علامہ اقبال لائبریری، غالب لائبریری، زبیدہ اسلامیہ کتب خانہ، پاکستان نیشنل سینٹر لائبریری، کے۔ایم سی پبلک لائبریری، برٹش کونسل لائبریری، امریکن سنٹر لائبریری۔

حیدر آباد

کتب خانے

یہاں ۱۸۷۶ء میں ایک "حیدر آباد جنرل لائبریری" یورپی و اینگلو انڈین لوگوں کے لئے قائم کی گئی تھی اس کے اخراجات میونسپلٹی کی امداد اور چندوں سے پورے کئے جاتے تھے۔ میونسپلٹی ۱۲۰ روپیہ کے علاوہ سولہ روپیہ مٹی کے تیل کے لئے بھی دیتی تھی ۱۹۲۰ء میں یہاں جملہ مضامین کی تقریباً سات ہزار کتابیں تھیں۔ لائبریری سے متعلق ایک دار المطالعہ بھی تھا۔

"نیٹو جنرل لائبریری" حیدر آباد میں ۱۸۸۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کو ۱۹۲۰ء میں وکٹوریہ جنرل لائبریری کہا جاتا تھا اس کے ذخائر کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہاں مختلف مضامین کی ۴۰۰۰ کتابیں تھیں جن میں سندھی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کی کتابیں شامل تھیں۔ ایک دار المطالعہ بھی تھا۔ اسے میونسپلٹی سے چار سو بیس روپیہ سالانہ کی امداد کے علاوہ پچاس روپیہ مٹی کے تیل کے لئے بھی ملتے تھے۔

حیدر آباد میں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں کتب خانہ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کی بھی تعریف کی گئی ہے اس میں عربی، فارسی، ترکی اور سندھی کتابوں کے ذخائر موجود ہیں۔ ضلع حیدر آباد کے قصبہ پیر جھنڈا میں "کتب خانہ پیر رشد اللہ راشدی" کو قابل دید بتایا جاتا ہے۔ پیر صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اس کتب خانہ پر بے پناہ روپیہ

خرچ کیا لندن کی لائبریری انڈیا آفس سے کتابوں کی فوٹو کاپیاں منگوائیں، ترکی
مصر کے کتب خانوں سے نایاب کتابوں کی نقلیں اپنے اخراجات پر کاتب بھیج کر کرائیں
مولانا عبیداللہ سندھی نے بھی اس کتب خانے سے استفادہ کیا تھا وہ تحریر فرماتے
کہ" پیر صاحب کے پاس علوم دینیہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ میں دوران مطالعہ و
جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا میری تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کو بڑا دخل تھا"

ان کے علاوہ اور بھی کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے مثلاً "کتب خانہ لواری شریف" ضلع
حیدرآباد میں ہے اس ضلع کے قصبات ٹنڈو سائیداد میں "کتب خانہ خواجہ محمد حسن جان
مجددی" ٹنڈو میر نور محمد میں "کتب خانہ میر نور محمد" مٹیاری میں "کتب خانہ پیر غلام
محمد سرہندی" ہالا میں "کتب خانہ مخدوم مولانا غلام حیدر" ہیں۔ ان میں مخطوطات، نوادر
اور مطبوعات کے عمدہ ذخائر جمع ہیں۔

حیدرآباد میں کئی وقیع علمی و ادبی ادارے بھی موجود ہیں جن میں "شاہ ولی اللہ
اکیڈمی" اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ایک خاتون بی بی زیب النساء (زوجہ
عبدالرحیم) کی علم نوازی کی یادگار ہے ان خاتون کا ذکر پچھلے اوراق میں سجاول کے ضمن میں آچکا

کتب خانہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی — یہ کتب خانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اس میں تقریباً بارہ ہزار بڑی
قیمتی اور معیاری کتابیں ہیں جن سے اکیڈمی کے اہل قلم استفادہ
کرتے ہیں اسے یاد رکھیے کہ یہ اکاڈمی شاہ ولی اللہ کے علوم و افکار اور تصانیف
اشاعت کا خاص مرکز ہے یہاں سے ایک رسالہ "الولی" اردو میں اور "الرحیم" سندھی
میں شائع ہوتے ہیں اسی مرکز سے شاہ صاحب کی تصانیف "ہمعات، لمعات، اور
مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کی تصحیح و ترتیب کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ مولانا صاحب
نامور عالم اور مصنف ہیں ان کا شمار مولانا عبیداللہ سندھی کے نامور شاگردوں میں ہوتا
ہے مولانا قاسمی اپنے استاد اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی اشاعت میں سرگرم عمل
ہیں ان کا ذاتی کتب خانہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے جسمیں بہت سے اہم مخطوطات بھی ہیں

---

[1] علم و آگہی ص ۳۵۳۔

یہ کالج ضلع حیدرآباد کے موضع ڈیہر کے قریب واقع ہے۔

کتب خانہ شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ اس کا کتب خانہ بڑا نفیس ہے جس میں تفاسیر، حدیث اسلامیات، اسلامی تاریخ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ کی تقریباً دس ہزار کتابیں ہیں ڈھائی سو نہایت نایاب مخطوطات ہیں ان میں سے سو کی فہرست محمد ایوب قادری نے رسالہ الرحیم حیدرآباد (دسمبر ۱۹۶۸ء) میں شائع کرادی ہے۔

حیدرآباد اور اس کے نواحی علاقوں میں نو عوامی کتب خانے قائم ہوئے ہیں ان میں سے پانچ کے نام یہ ہیں۔ شمس العلماء داؤد پوتا گورنمنٹ لائبریری، سندھ پراونشل لائبریری اور پاکستان نیشنل سینٹر لائبریری (حیدرآباد) شاہ لطیف لائبریری (بھٹ شاہ) اور ادارہ سندھی ادب لائبریری (ٹنڈو محمد خاں) حیدرآباد کے تعلیمی اداروں کے کتب خانوں میں سندھ یونیورسٹی اور لیاقت میڈیکل کالج کے کتب خانے نہایت وسیع ہیں۔

لاڑکانہ، جیکب آباد میر پور خاص لاڑکانہ میں ایک کتب خانہ ۱۸۸۴ء میں قائم ہوا تھا جو "گالس لائبریری" کہلاتا تھا اسے ضلع لاڑکانہ کا واحد عوامی کتب خانہ کہا گیا ہے اس میں تقریباً ایک ہزار کتابیں تھیں جن سے ہر شخص استفادہ کرسکتا تھا کتب خانہ کا ماہانہ چندہ آٹھ آنے سے دو روپیہ تک تھا۔

جیکب آباد میں ایک کتب خانہ ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا تھا جس کا نام "سیٹھ ریجھا لائبریری" تھا۔ اس کے قیام پر سترہ سو روپیہ صرف ہوئے تھے ان میں سے ایک ہزار سیٹھ صاحب نے اور کچھ رقم سندو پنچایت نے دی تھی اس کے بعد جو کمی رہ گئی وہ چندوں سے پوری کی گئی تھی۔ جیکب آباد سے چھاونی کے منتقل ہوجانے کے بعد اس کے کتب خانہ کی تمام کتابیں ریجھا لائبریری کو مل گئی تھیں اور یہاں کتابوں کی تعداد تین ہزار ہوگئی تھی۔ میر پور خاص میں بھی چندوں کی رقم سے جو کتب خانہ ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا تھا اس کا نام "ہڈسن لائبریری" تھا وہ چودہ سو روپیہ کے صرفے سے قائم ہوئی تھی اس میں انگریزی اور سندھی کی تقریباً سات سو کتابیں تھیں۔

سیوہن، دادو، اور خیر پور۔ سیوہن میں "کتب خانہ مخادیم"، باترہ ضلع دادو میں کتب خانہ

فضل اللہ" اور کھوڑا ضلع خیرپور "کتب خانہ مخادیم" نادر تصنیفات و مخطوطات سے معمور ہیں اول الذکر
نسبت لکھا ہے کہ اس میں سیوہن کے مخادیم کی تصانیف اور مخطوطات کا ایک اچھا ذخیرہ ہے جو قابلِ دید

خیرپور کی پبلک لائبریری خاص طور سے قابلِ ذکر ہے اس میں کتابوں کی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہوگی۔ اس کی شاندار عمارت اس کے مطبوعات و مخطوطات کا نادر ذخیرہ اور پکچر گیلری وغیرہ اس لائبریری کی عظمت کی گواہ ہیں۔

سکھر یہاں کی دو لائبریریوں (جنرل لائبریری اور معصوم علی شاہ لائبریری) کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں پہلی لائبریری سندھ کی قدیم ترین اور دوسری جدید ترین لائبریریوں میں خاص اہمیت رکھتی ہیں جنرل لائبریری ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئی تھی اسکے متعلق کہا گیا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے یہ شمالی سندھ کی سب سے بڑی لائبریری شمار ہوتی تھی اسمیں کتابوں کی تعداد چودہ ہزار سے زائد کہی جاتی ہے جن میں کئی نادر مخطوطات ہیں۔

"میر معصوم علی لائبریری" کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس میں ایک آرٹ گیلری ہے۔ اس لائبریری میں کتابوں کے علاوہ کئی نادر مخطوطات بھی ہیں ان ذخائر کی تعداد چند سال میں کافی ہو جائے گی کیونکہ یہاں کتابوں کے سالانہ اضافے کا اندازہ پانچ سو لگایا گیا ہے۔

سکھر میں اور کئی کتب خانے ہیں یہاں کے قدیم کتب خانوں میں ایک ضلع سکھر کے قصبہ شکارپور میں ۱۸۷۳ء میں قائم ہوا تھا جس کا نام "فرنڈس سوسائٹی ریڈنگ روم" تھا لیکن بعد میں وہ وہاں کے ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کے نام سے موسوم ہو کر "نارائن جگن ناتھ لائبریری" کہلانے لگا۔ اس کتب خانہ کو "اہم" کہا گیا ہے اور اس میں کتابوں کی تعداد کے متعلق یہ آیا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں یہاں تقریباً گیارہ سو کتابیں تھیں

ضلع سکھر کے ایک قصبہ گڑھی لٰسین میں "کتب خانہ مولانا محمد لٰسین" ہے جس کے بارے میں لکھا ہے کہ "مولانا عبدالغفور سندھ کے ایک بڑے فقیہ اور قادر الکلام شاعر تھے انھوں نے اس گرانمایہ کتب خانہ کو جمع کیا تھا جو آجتک صحیح وسالم حالت میں موجود ہے۔"

پنجاب کے کتب خانے

مُلتان

سندھ کے بعد مسلم سلطنت کے اثرات کا بڑا مرکز ملتان تھا جہاں برسوں اسلام اور علم کی اشاعت کامیابی کے ساتھ ہوتی رہی اس سلسلہ میں یہاں درس گاہیں اور کتب خانے بھی قائم ہوئے۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ شہر اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل رہا حیات شبلی (علامہ سید سلیمان ندوی) میں ہے۔

"قطار در قطار علماء بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے اس زمانے میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا اس لئے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا ملتان اور سندھ کے بعد ان کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوتی"[1]

ملتان کو تعلیم و تعلم کے میدان بھی یہ اولیت حاصل رہی کہ غیر منقسم ہندوستان میں مدرسہ کی پہلی عمارت یہیں تعمیر ہوئی۔ یہاں ناصر الدین قباچہ[2] نے اپنے دور حکومت (۱۲۰۵ - ۱۲۲۷ء) میں ایک مدرسہ قائم کرایا جس کے صدر مدرس مولانا قطب الدین

[1] عہد اسلامی کا ہندوستان (سید ریاست علی ندوی) ص ۲۷ [2] ملتان اور اوچ، سلطان شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر حملہ کے دوران اس کی سلطنت میں شامل ہو گئے تھے اس کے بعد جب اس کی مملکت تقسیم ہوئی تو اس کے ایک امیر قباچہ کے حصہ میں یہ دونوں شہر آئے جہاں بیالیس برس تک وہ حکمراں رہا۔

کاشانی تھے کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ بہاءالدین ذکریا ملتانی فجر کی نماز یہاں مولا[نا]
کاشانی کی امامت میں ادا فرمایا کرتے تھے۔

حضرت زکریا ملتانی حضرت زکریا ملتانی رح متوفی ۱۲۶۶ھ (۱۲۶۶ء) سہروردیہ سلسل[ہ]
کے ایک عظیم المرتبت بزرگ تھے ملتان میں ان کی عظیم الشا[ن]
خانقاہ علوم باطنی وظاہری کا بہت بڑا مرکز تھی ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی نسبت مصنف
آبِ کوثر نے انوارِ غوثیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "حضرت کا وعظ سن کر ملک سندھ او[ر]
علاقہ ملتان ولاہور کے ہنود میں سے بھی بے شمار خلقت نے جس میں بہت متمول تاج[ر]
اور بعض والیانِ ملک بھی تھے دینِ اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے"۔[۱]

حافظ محمد جمال ملتان میں چشتیہ سلسلہ کے ایک بزرگ حضرت حافظ جمال ملتانی
(خلیفہ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی) نے بھی علوم
باطنی وظاہری کے چراغ جلائے تھے انھوں نے یہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جسے
مصنف مشائخ چشت نے علم وفضل کا اعلیٰ مرکز بتایا ہے۔ اور حضرت کے تبحر علمی او[ر]
درس وتدریس کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ علم وعمل کی بے پنا[ہ]
صلاحیتوں کے مالک تھے اگر ایک طرف علمی وروحانی اعتبار سے ان کا پایہ بلند تھا تو
دوسری طرف شجاعت وتہور مجاہدانہ جذبات اور سرفروشی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے حافظ
محمد جمال نے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں وفات پائی تھی[۲]

ملتان کے سلاطین میں حسین شاہ لنگا بھی علم دوست اور اہل علم کا بڑا قدرد[ان]
تھا مولوی ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں کہ "اس نے متعدد مدرسے قائم کئے جن میں ممتا[ز]
ومشہور اساتذہ وقت مشغول درس وتعلیم رہتے تھے"۔

یہ ظاہر ہے کہ ملتان کے روحانی اور علمی ماحول میں کتابوں کے ذخیرے بھی رہتے
ہوں گے "مدرسہ حافظ محمد جمال" اور "مدارس شاہ حسین لنگا" سے کتب خانہ بھی منسلک
ہوں گے مگر وہ ایسے روپوش ہو گئے کہ ان کی کیفیت نہیں معلوم ہو سکی۔

---

[۱] آبِ کوثر ص ۲۹۵ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خلیق احمد نظامی کی "مشائخ چشت" ص ۵۳۰

ملتان کے متعلق یہ کہاوت ہے ؎

چہار چیز است تحفۂ ملتان ٭ گرد و گرما گدا و گورستان

لیکن سچ پوچھئے تو اس شہر کی خاک آنکھوں سے لگانے کے لائق ہے اس خاک پاک میں ایسے خدا رسیدہ مشائخ اور علماء آسودہ ہیں جن کے روحانی اور علمی کمالات کی نشانیاں کتابوں کی شکل میں آج بھی بہت سے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

اوچ شریف

یہ تاریخی شہر مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندؤں کے زمانہ میں بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "محمد بن قاسم کی فتح کے وقت یہ سیاسی اور معاشی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی بے مثل تھا" محمود غزنوی کے زمانہ میں ایک نامور عالم مولانا صفی الدین گازرونی نے یہاں ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی تھی پھر رفتہ رفتہ اس شہر کا علمی مرتبہ اتنا بڑھا کہ یہ علم و عرفان کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ خیال رہے کہ مولانا گازرونی (متوفی ۳۹۸ھ / ۱۰۰۸ء) پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اوچ میں مدرسہ اور خانقاہ قائم کی تھی کہا جاتا ہے کہ مدرسہ میں ڈھائی ہزار طالب علم تعلیم پاتے تھے

اس کے بعد قباچہ کے عہد میں بھی یہاں ایک درس گاہ موسومہ "مدرسہ فیروزی" قائم ہوا تھا جب قاضی منہاج الدین سراج (مصنف طبقات ناصری) ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں خراسان سے اوچ[1] آئے تو قباچہ نے اس مدرسہ کا انتظام ان کے سپرد کر دیا تھا قباچہ بھی بڑا علم پرور حکمراں تھا اس کے زمانہ میں مدرسے قائم ہوئے کتابیں تصنیف ہوئیں سندھ کی سب سے پہلی تاریخ "چچ نامہ" (مصنفہ اسمٰعیل کوفی) کا عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوا فارسی شعراء کا پہلا تذکرہ لباب الالباب، سدید الدین عوفی نے قباچہ کے علم دوست وزیر عین الملک کی سرپرستی میں لکھا۔ عوفی نے اپنی دوسری کتاب "جوامع الحکایات و لوامع الروایات"

---

[1] یہ بہاول پور سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اوچ سے متعلق یہ کتابیں بھی دیکھیے۔ خطۂ پاک اوچ از مسعود حسن شہاب دہلوی اور تاریخ اوچ از محمد حفیظ الرحمٰن۔

قباچہ ہی کی تحریک پر لکھنی شروع کی تھی مگر اس کی تکمیل سے پہلے ۱۲۲۷ء میں سلطان التمش نے قباچہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور دریائے سندھ نے اسکی زندگی ختم کر دی۔ وہ یہ دریا عبور کر رہا تھا کہ کشتی کے الٹ جانے سے ڈوب کر مر گیا۔

اوچ علوم باطنی کا بھی بڑا مرکز رہا مشائخ کرام کی روحانی تعلیمات اور تبلیغی کوششوں کی وجہ سے یہ شہر اوچ شریف کہلایا اس سلسلہ میں کئی روشن ضمیر صوفیا کے نام ملتے ہیں جن میں جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری نے خاص شہرت پائی آپ کے دادا بخارا سے ہندوستان آنے کے بعد حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی کے مرید ہوئے تھے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے دم سے اس علاقہ میں علوم باطن پھیلے اور بہت سے غیر مسلم آپ کی معرفت اسلام میں داخل ہوئے جن کا ذکر بہاول پور کے سرکاری گزیٹر اور دیگر کتابوں میں موجود ہے۔

حضرت مخدوم[۱] (متوفی ۷۸۵ھ/۱۳۸۴ء) بہت بڑے عالم اور قاری تھے۔ فن کتابت میں بھی مہارت حاصل تھی ان کے دست مبارک کا لکھا ہوا قرآن مجید کا نسخہ سجادہ نشین اوچ کے پاس محفوظ ہے۔ حضرت نے درس و تدریس کا بھی باقاعدہ نظام قائم کیا تھا وہ مریدین اور معتقدین کو حدیث، تصوف اور دیگر اسلامی علوم کا درس دیا کرتے تھے اور خاص مریدین کو فجر کی نماز کے بعد پڑھاتے تھے۔

حضرت مخدوم کا کتب خانہ

حضرت مخدوم نے ایک بہت اچھا کتب خانہ قائم کر لیا تھا جس میں قرآن مجید کی تفسیریں، اور حدیث و تصوف وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں جمع تھیں یہاں عوارف المعارف کا وہ خاص نسخہ بھی تھا جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے درس میں رہتا تھا کتابوں کی فراہمی میں حضرت مخدوم خود بھی کافی دلچسپی لیتے تھے ان کے پاس اہل قلم اپنی تصنیفات بھی بھیجتے رہتے تھے شیخ قطب الدین دمشقی نے تصوف کا مشہور رسالہ مکیہ حضرت کے پاس بھیجا تھا جس کا انھوں نے فارسی میں ترجمہ کر کے اپنے کتب خانہ کی زینت بنا لیا تھا۔

[۱] حضرت کے مفصل حالات کیلئے ملاحظہ ہو "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" از محمد ایوب قادری (کراچی ۱۹۶۳ء)

اس کتب خانہ کے علاوہ گازرونی کی درس گاہ اور مدرسہ فیروزی کے ساتھ بھی کتب خانے ہونگے مگر ان کی تفصیلات نہیں ملیں۔ بہر حال اس زمانہ کے کتب خانوں کے وجود کی گواہی اوچ کے قدیم گیلانی خاندان کی لائبریری اور عہد ماضی کی کتابیں دے رہی ہیں اس لائبریری میں ہر قسم کی نایاب[1] و نادر کتابیں موجود ہیں بعض ایسے قدیم مخطوطات بھی ہیں جن کا صرف ایک ہی نسخہ دنیا بھر میں موجود ہے۔ اس لائبریری کی مکمل فہرست ڈاکٹر غلام سرور (صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی) نے مرتب کی ہے جسے اردو اکیڈمی بہاول پور نے شائع کیا ہے۔

لاہور

لاہور کو قرون وسطیٰ میں بڑی امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اب سے تقریباً آٹھ سو برس پہلے اسلامی کتب خانوں کے جو نقوش یہاں ابھرے ان کا سلسلہ اب تک بڑی شان و شکوہ کے ساتھ قائم ہے اور آج کل یہ شہر بہترین کتب خانوں سے معمور ہے۔ اسے یاد رکھیئے کہ کتب خانوں کا قیام اور ان کی توسیع و ترقی سیاسی انقلابات اور ملکی فتوحات کے دوش بدوش ہوتی رہی ہے۔ جب سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں کے اثرات سے پنجاب میں غزنوی حکومت قائم ہو کر لاہور اس کا دارالخلافہ قرار پایا تو غزنوی حکمرانوں کی علم دوستی کی بدولت یہ شہر گیارہویں صدی میں مسلم ثقافت کا مرکز بن گیا جس کے گہوارے میں علم و ادب اور کتب خانے پھلنے پھولنے لگے۔

پنجاب میں غزنوی خاندان کی حکومت تقریباً دو سو برس قائم رہ کر ۱۱۸۶ء میں غوریوں کے قبضہ میں آ گئی لیکن ان کی علم پروری کی داستانیں اور یادیں تاریخ کی تحویل میں آ کر محفوظ ہو گئیں ان ہی میں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ غزنوی دور میں بخارا، سمرقند، غزنی اور بلخ وغیرہ سے مشائخ و علماء کے لاہور آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا لیکن ایک عالم د

[1] ان کے بارے میں ملاحظہ ہو مسعود حسن شہاب کا مضمون ''اوچ شریف کے علمی نوادر'' (الزبیر، کتب خانہ نمبر۔ ص ۲۰۸)

صوفی شیخ اسمٰعیل یہاں ۱۰۰۵ء میں ہی آگئے تھے وہ پہلے بزرگ ہیں جو علم تفسیر و حدیث کو لاہور لائے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ان کی تبلیغی مساعی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "ان کی مجلس وعظ میں سامعین کا ہجوم ہو جاتا تھا اور صدہا لوگ خلعتِ اسلام سے مشرف ہوتے تھے" ان کے بعد شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ عرف داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ ۱۰۷۲ء) محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے عہدِ حکومت میں لاہور آئے اور تدریس و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی شہرہ آفاق کتاب "کشف المحجوب" محتاجِ تعارف نہیں ہے۔
محمود غزنوی کے زمانہ میں علم ہیئت و نجوم کا ایک زبردست عالم ابوریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ - ۱۰۴۸ء) بھی ہندوستان آیا اس نے ہندوؤں کے مذہب، فلسفہ اور دیگر علوم سے واقفیت حاصل کر کے ایک نہایت اعلیٰ اور مستند کتاب "کتاب الہند" لکھی۔ البیرونی نے ۱۱۴ سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور اپنی ایک بہترین تصنیف "قانونِ مسعودی" سلطان مسعود کے نام معنون کر کے اس کی علم پروری کو لافانی بنا دیا۔
یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ لاہور میں پہلی مسلم سلطنت قائم ہو جانے کے بعد غزنوی سلاطین کی علم پروری، علماء نوازی اور ان کے زمانے کے مدارس اور تصنیفات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اسی دور میں یہاں کتب خانے قائم ہو گئے تھے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ "سلطان مسعود نے ممالکِ محروسہ کے تمام شہروں میں اس قدر مدارس و مساجد تعمیر کرلئے تھے کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز و قاصر ہے" یہ سلطان اپنے باپ محمود غزنوی کی طرح اہلِ علم کی بڑی سرپرستی و قدردانی کیا کرتا تھا وہ نہایت ذی علم اور سخی بادشاہ تھا۔ اہل قلم نے مختلف علوم و فنون کی بہت سی کتابیں اس کے نام معنون کر دی تھیں اس کے جانشینوں میں سلطان ابراہیم بھی نہایت دیندار اور صاحبِ علم بادشاہ گذرا ہے خطِ نسخ لکھنے میں اُسے مہارت تامہ حاصل تھی اور کتابت کا اتنا والہانہ ذوق رکھتا تھا کہ قرآن مجید کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک سال مکہ اور دوسرے سال مدینہ بھیجا کرتا تھا اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید مدینہ کے کتب خانہ میں عہدِ جہانگیری تک موجود تھے اور سلطان ابراہیم غزنوی کے عہد میں لاہور کو علمی

گرمیوں کا گہوارہ اور علم و فضل کا مرکز کہا گیا ہے اور اس کے ایک وزیر ابو نصر فارسی[۵]
متعلق لکھا ہے کہ وہ "علم و فضل کا مربی تھا اس نے لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی
اہل علم اور دوسرے بزرگوں کی جائے پناہ تھی اور آہستہ آہستہ لاہور میں بلخ و بخارا
ر دوسرے ممالک سے اہل علم کھینچ کر آنے لگے۔" اس بیان کے بعد یہ اندازہ لگانے میں کوئی
شواری نہ ہوگی کہ ایسی عظیم علمی خانقاہ کا کتاب خانہ بھی بڑا عظیم ہوگا۔

سلطان ابراہیم کے بیٹے علاؤالدین کے دربار سے جو علما اور شاعر وغیرہ وابستہ تھے
ن میں مسعود سعد سلمان برصغیر پاک و ہندو کا وہ ممتاز شاعر تھا جسے پاکستان کا پہلا
رسی شاعر کہا جاتا ہے اس نے فارسی اور ترکی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی شعر کہے
ر اس زبان کے اشعار کا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اکبر کے عہد تک موجود تھا۔
رخین کا بیان ہے کہ غزنوی سلاطین میں سلطان بہرام شاہ کو بھی کتابیں جمع کرنے کا بڑا
وق تھا اس کے لئے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں شیخ سنائی کی مثنوی "حدیقۃ الحقیقۃ"
بل ذکر ہے اس میں تینتیس[۳۳] ہزار بیت ہیں۔

ہور علم اور کتابوں کا گھر اسے یاد رکھئے گا کہ لاہور غزنوی عہد یعنی اولین مسلم سلطنت
لے زیر نگیں آنے کے بعد علم اور کتابوں کا گھر بن گیا تھا اس زمانہ میں باہر سے آنے والے
ض ارباب علم اپنے ساتھ کتابیں بھی لایا کرتے تھے چونکہ عہد غزنوی سے اب تک لاہور میں
می و ادبی سرگرمیاں برابر جاری رہیں اس لئے ہر عہد میں کتابوں کے کچھ نہ کچھ ذخیرے بھی جمع
تے رہے مثلاً محمد حسین آزاد کی نسبت لکھا ہے کہ جب وہ ۱۸۸۵ء میں ایران گئے تو وہاں
ے کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ لاہور لائے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ کتابوں کی آمد کتب خانوں کے قیام کے لئے بڑی محرک ثابت ہوئی۔
ہد غزنوی کے کتب خانے تو باقی نہ رہے مگر کتابیں جمع کرنے کا ذوق باقی رہ گیا جو اہل پنجا
ے دلوں کو برابر گرماتا رہا اور گردش زمانہ کی یہ کرم فرمائی تو دیکھئے کہ لاہور کی سیکڑوں برس
انی عظمتوں کے نقوش انیسویں اور بیسویں صدی میں ابھر آئے۔ یہاں اردو جدید شاعری

[۵] آب کوثر ص ۷۲۔

کی محمد حسین آزاد کی کوششوں سے بنا پڑی جیسے حالی نے جلا دی۔ اس دور میں لاہور علم و ادب اور شعر و شاعری کا بہت بڑا مرکز تھا اور یہاں یگانۂ روزگار ادیب، شاعر صحافی اور مصنف موجود تھے جن کی علمی کاوشیں کتب خانوں کا دائرہ بڑھانے میں معاون ہوئیں۔ اسی زمانہ میں کتابوں کے دو عاشق صادق مولانا محمد حسین آزاد اور سردار دیال سنگھ لاہور میں تھے جنہیں کتب خانوں کی دنیا کا مجنوں اور فرہاد کہنا چاہیئے اس علم افروز جنوں کی نشانیاں "کتب خانۂ آزاد" اور "دیال سنگھ لائبریری" ہیں

کتب خانۂ آزاد آزاد کو کتابیں جمع کرنے کا والہانہ ذوق اپنے والد ماجد محمد باقر سے ملا تھا جن کا دہلی میں بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ آزاد ۱۸۶۱ء میں لاہور آئے تھے اس کے بعد جب وہ ایران گئے تو بقول آغا محمد باقر[1] "ایران کے سفر میں انھوں نے دن دیکھا نہ رات، مینہ دیکھا نہ آندھی، سردی دیکھی نہ بارش، جہاں کہیں کتاب مل سکتی تھی وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچے اور اگر کوئی اچھی کتاب ملی تو وہ کتب خانۂ آزاد کی زینت کے لئے خرید کی" اس طرح اس سفر میں انھوں نے دس ہزار روپیہ کی کتابیں اپنے کتب خانے کے لئے خریدی تھیں۔ مولانا آزاد کا انتقال (۱۹۱۰ء) ہو جانے کے بعد ان کے کتب خانہ کی تمام کتابیں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری کو دیدی گئیں جہاں یہ چند مخصوص الماریوں میں آراستہ ہیں اور ان پر "آزاد کلیکشن" کی تختی لگی ہوئی ہے۔

دیال سنگھ لائبریری سردار دیال سنگھ (متوفی ۱۸۹۸ء) نے بھی کتابیں جمع کرنے میں اپنی کثیر دولت صرف کر دی تھی ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔

> "وہ کتابوں کے بڑے دلدادہ تھے لاہور، امرتسر اور ان کے آبائی گاؤں مجیٹھ میں انھوں نے اپنی رہائش گاہوں پر کتب خانے قائم کر رکھے تھے اور ان کی زندگی انہی علمی خزانوں کی آغوش میں گزرتی تھی"

سردار صاحب کی یادگار "دیال سنگھ لائبریری"[2] آج بھی لاہور کی نسبت روڈ پر

---

[1] ملاحظہ ہو کتب خانۂ آزاد از محمد باقر (الزبیر، کتب خانہ نمبر، ص ۲۳۳)

[2] اس لائبریری کے بارے میں قادر حسین کا مضمون ملاحظہ کیجئے (الزبیر کتب خانہ نمبر ص ۲۴۸)

پنے بانی کے کتابوں سے عشق کی کہانی لوگوں کو سنا رہی ہے۔

و عظیم کتب خانے لاہور میں "پنجاب پبلک لائبریری" "پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور انجمن حمایت اسلام" بھی یہ حقیقت آشکار کر رہی ہیں کہ انیسویں ور بیسویں صدی میں یہاں علمی، تعلیمی اور سماجی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ پنجاب لک لائبریری ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہاں عربی، اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت راقی گورمکھی، پشتو، بلوچی، سندھی، بنگالی، فرانسیسی، جرمنی، اور چینی زبانوں کی لاکھ[۲] سے زائد کتابیں ہیں نادر قلمی نسخوں کی تعداد ایک[۲] ہزار ہے۔ ان کے علاوہ مغل ر برطانوی عہد کی نایاب دستاویزات، سرکاری رپورٹیں گزیٹر وغیرہ بھی موجود ہیں۔ ذخائر میں فقیر خاندان کے ایک عالم سید جمال الدین کے کتب خانہ کی بیش قیمت کتابیں بھی شامل ہیں۔ لکھنؤ کے مشہور ناشر نولکشور نے بھی ڈھائی ہزار کتابیں اس لائبریری عطا کی تھیں۔ یہاں اردو اور فارسی کی قلمی کتابیں بھی ہیں جن میں بعض بڑی نایاب ر بیش قیمت کہی جاتی ہیں۔ عربی زبان کی قلمی کتابوں کی فہرست شائع ہو چکی ہے اردو ر فارسی کی فہرست زیر ترتیب ہے۔ لائبریری کی رکنیت کا چندہ آٹھ روپیہ سالانہ ر زر ضمانت پندرہ سے بیس روپیہ ہے اس کے علاوہ تاحیات رکنیت کی شرح سو روپیہ ے اس علمی مخزن سے تقریباً ساڑھے سات سو افراد استفادہ کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ں لائبریری کی افادیت کا سلسلہ بانوے[۹۲] برس سے جاری ہے اور آج کل یہ پورے لستان کی سب سے بڑی لائبریری کہی جاتی ہے۔

تب خانہ پنجاب یونیورسٹی اس یونیورسٹی اور اس کے کتب خانے نے پنجاب کے تعلیمی میدان میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے اور فن کتاب داری کی تاریخ میں تو یہ دونوں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں باسٹھ برس سے اس فن کی تعلیم جاری ہے جس کے باعث یہ کتب خانہ خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جہاں تک کتابوں

(۲) یہ تعداد سید اسرار زیدی اور عرفان چغتائی کے مضامین (مندرجہ الزبیر کتب خانہ نمبر ص ۱۴۲، ۲۶۰) سے لی گئی ہے۔

کا تعلق ہے ان کی تعداد ۱۹۶۶ء تک تقریباً دو لاکھ پچیس ہزار تھی ان میں ایسی بھی
کتابیں ہیں جن کو نایاب و نادر کہا جاتا ہے یہاں سنسکرت اور ہندی کی کتب بھی ہیں
لائبریری کے ذخائر میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد نہ صرف اس لائبریری نے ترقی کی ہے بلکہ لاہور میں بہت
سے سرکاری و غیر سرکاری، علمی، تصنیفی و تحقیقی ادارے وجود میں آئے ہیں جن کے ا
وقیع کتب خانہ ہیں مثلاً مرکزی اردو بورڈ، اقبال اکیڈمی، مجلس ترقی ادب لاہور، ا
علما۔ اکیڈمی وغیرہ ان کتب خانوں میں بلاشبہ نہایت قیمتی اور اعلیٰ ذخیرے جمع ہیں۔

لائبریری سائنس

اس موقع پر بھی لائق ذکر ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اب سے باسٹھ[62]
برس بیشتر لائبریری سائنس کی تعلیم کا گہوارہ بن گئی تھی خیا
رہے کہ اس زمانہ تک کسی اور یونیورسٹی میں یہ تعلیم جاری نہ ہوئی تھی جب یہاں اس تعلی
کی شمعیں روشن ہوئیں تو ان کی روشنی رفتہ رفتہ تمام ہندوستان میں پھیل گئی صورت
یہ ہوئی کہ یہاں سے جو طلبا نکلے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری اور دیگ
لائبریریوں کو جدید ترین سائنٹیفک اصولوں کے مطابق آراستہ کیا کتابوں کی درجہ بن
کا مستند اور بین الاقوامی ضابطہ (ڈیوی ڈیسیمل کلاسی فیکیشن) رائج کرایا اور ا
بھی یاد رکھیئے کہ اسی ادارہ سے ۱۹۱۶ء میں لائبریری سائنس کی انگریزی کتاب (پنجاب لائبریری پرائم[1]

[1] اس کتاب میں آتھر نمبرس کا وہ جدول بھی شامل ہے جس کا نام "ڈکنس آتھر نمبرس" ہے یہ نمبر علیگ
مسلم یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ انگریزی میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ یہ جدول تقریباً نایاب
ہو گیا ہے لیکن راقم نے اسے حاصل کر کے اپنے کتابچہ (کتاب نمبر کیا ہے) کے ہندی ترجمے (لیشتک
سنکھیا پر ویشکا) کے ساتھ شائع کرا دیا ہے جب ڈکنس آتھر نمبرس کو اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابو
لئے استعمال کرنا دشوار معلوم ہوا تو راقم الحروف نے مصنفی نمبر کا ایک نہایت سادہ اور عام فہم جدول ۱۹۵۲
میں علیگڑھ سے شائع کرا دیا۔ مصنفی نمبر کے اس جدول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ہر رسم الخط میں لکھی ہوئی کت
کے مصنفی یا کتابی نمبر بنائے جا سکتے ہیں یہ ہی نمبر مسلم یونیورسٹی لائبریری کے اردو، عربی، فارسی اور ہند
و سنسکرت کے شعبوں اور جامعہ ملیہ لائبریری ملیر (کراچی) اور ہمدرد لائبریری (کراچی) میں بھی رائج ہیں

کی اشاعت ہوئی جو ہند و پاک میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جاتی ہے اس کتاب کے مصنف ASA DON DICKINSON ۱۹۱۵ء میں امریکہ سے لاہور آئے تھے اور یہاں لائبریری سائنس کی تعلیم جاری کی تھی ۔ جو اب تک جاری و ساری ہے ۔

لائبریری سائنس کے ضمن میں لاہور کو یہ امتیاز بھی حاصل ہوا تھا کہ ۱۹۱۸ء میں یہاں آل انڈیا لائبریری کانفرنس منعقد ہوئی تھی ہند و پاک میں وہ اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع تھا جو کتب خانوں کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔

غرض لاہور کی سرزمین سے مختلف علوم و فنون کے جو چشمے پھوٹے ۔ انھوں نے نہ صرف کتب خانوں کی آبیاری کی ہے بلکہ لاہور کا نام بھی علم و ثقافت کی دنیا میں روشن کر دیا ہے ۔

سیالکوٹ

سیالکوٹ بھی قرونِ وسطیٰ میں علم و فضل کا بہت بڑا مرکز تھا یہاں کے علماء میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی غیر فانی عظمت کے مالک ہیں ان کی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کی وجہ سے اس شہر کو جو علمی مرکزیت حاصل ہوئی وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے ان کی تصانیف آج بھی ہند و پاک سے لے کر استنبول تک کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں

خیال رہے کہ اس زمانہ کی درس گاہوں میں ملا صاحب کا مدرسہ بڑی اہمیت کا حامل تھا ۔ اسی لحاظ سے مدرسہ کا کتب خانہ بھی نہایت وقیع ہوگا ان کے بارے میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں ۔

ملا عبدالحکیم

"ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے موجب افتخار ہیں یقیناً تمام درسی علوم میں ہندوستان کی سرزمین سے ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا اور کمیت و کیفیت اور حسن قبول میں اس قدر علمی یادگاریں ان کی طرح کسی نے دنیا میں نہیں چھوڑیں ۔ سیالکوٹ ان کا مولد ہے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی جب ان کے سنِ شعور کا آغاز ہوا تو طالب علمی شروع کی اور زیادہ تر ملا کمال الدین

لہ ملاحظہ ہو بزم تیموریہ (سید صباح الدین عبدالرحمٰن) ص ۲۱۳ ۔

کشمیری سے جو سیالکوٹ میں رہتے تھے فیض حاصل کیا اور تھوڑی سی
مدت میں بدرِ کامل ہو کر چمکے اور دنیا کو اپنے علمی فیوض و برکات سے بھر دیا
جہانگیر کے زمانہ میں ضروری معاش پر قناعت کر کے اپنے وطن میں ہی زندگی بسر کی
لیکن جب شاہجہان کا زمانہ آیا اور علماء و شعراء کی گرم بازاری ہوئی تو وہ اس کے دربار
میں حاضر ہوئے اور جب دربار میں باریابی حاصل کرتے تھے صلہ گراں پاتے تھے دو مرتبہ روپیہ
میں تولے گئے اور وزن میں جس قدر روپیہ چڑھا ان کو مل گیا اور چند گاؤں بطور جاگیر کے
انعام میں پائے اب وہ نہایت اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ اپنے وطن میں
مقیم رہ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے علم کی اشاعت
کرنے لگے ان کی تصنیفات عرب و عجم میں پھیلی ہوئی ہیں۔"

اس اہم تحریر سے ملا صاحب کے مدرسہ اور اس کے کتب خانہ کے وقیع ہونے کا ثبوت ملتا ہے ان کی رحلت (۱۰۶۷ھ۔۱۶۵۶ء) کے بعد ان کے صاحبزادے ملا عبداللہ نے اس مدرسہ کے فیض کو جاری رکھا۔

ملا عبدالحکیم کے بعد دورِ جدید میں علامہ اقبال کی عظیم شخصیت نے اس شہر کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے علامہ کے بارے میں بڑی اچھی اور سچی بات کہی گئی ہے کہ "جانے کتنے سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی رہی پھر کہیں جا کر ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ اقبال پیدا ہوئے۔"

کاغذسازی خیال رہے کہ سیالکوٹ کی علمی مرکزیت کو کاغذسازی سے بھی تقویت ملی اس زمانہ میں یہ شہر کاغذسازی کے لئے بھی مشہور تھا یہاں جو کاغذ بنتا تھا ان میں مان سنگھی اور ریشمی کاغذ نہایت عمدہ اور پائدار ہوتا تھا لکھا ہے کہ سیالکوٹ کے نواح میں تین گاؤں کاغذسازوں سے آباد تھے یہاں سے کاغذ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جاتا تھا اور شاہانِ دہلی کے دفاتر میں زیادہ تر یہ ہی کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ کاغذسازی کی صنعت سے کتب خانوں کو جو وسعتیں حاصل ہوئیں ان کے لحاظ سے سیالکوٹ کا نام بھی کتب خانوں کی تاریخ میں نمایاں رہے گا۔

بہاولپور

پنجاب میں مشائخ اور ارباب علم کی سرگرمیوں کی وجہ سے علوم و فنون بڑی تیزی سے پھیلے۔ شہر ہو کہ قصبہ ہر جگہ علم کی گرم بازاری ہوئی چنانچہ جب اوچ کی علمی بستی سے اڑتیس ۳۸ میل دور سندھ کے داؤد پوتا خاندان کے دوسرے حکمران (محمد بہاول خان) نے ۱۷۴۸ء میں شہر بہاول پور کی بنیاد رکھی تو اس نے بھی رفتہ رفتہ ایک علمی و ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ ریاست بہاول پور کے علم دوست حکمران کے عہد میں علم کو ترقی دینے کیلئے جو کام ہوئے ان کی نشانیاں جامعہ اسلامیہ بہاولپور، عجائب گھر، اردو اکیڈمی اور لائبریری ہیں۔

سنٹرل لائبریری بہاول پور کے کتب خانوں میں سنٹرل لائبریری کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ اپنی پرشکوہ عمارت، اپنے اعلیٰ ذخائر اور اپنی افادیت کے لحاظ سے ایک عظیم لائبریری کہلانے کی مستحق ہے اس کی اہمیت اور افادیت ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "اس علاقہ کے لئے سنٹرل لائبریری کی افادیت لامحدود ہے یہ گویا علم کا سرچشمہ ہے جو تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھا رہا ہے" اس مفید لائبریری کی تفصیلات[۱] جاننا فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ المختصر یہ ہے کہ اس لائبریری میں کتابوں کی کل تعداد ۳۸۱۷۰ ہے تقریباً ۵۰ قلمی نسخے خطاطی و آرٹ کے نادر نمونے تصاویر، نقشے اور چارٹ اس کے علاوہ ہیں کتب کی سالانہ گردش ساٹھ سے ستر ہزار تک ہے۔

بچوں کے مطالعہ کے لئے انگریزی اور اردو میں کہانیوں کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں بچوں کے رسائل بھی بڑی تعداد میں منگوائے جاتے ہیں۔ یہ کتب اور رسائل تقریباً سب کے سب وضاحتی تصاویر سے مزین ہیں جن سے بچوں کو کہانی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

خواتین کے لئے خاص کتب کا اسٹاک علیحدہ رکھا گیا ہے تاہم انہیں لائبریری کے مرکزی شعبہ سے بھی حسب منشا استفادہ کی اجازت ہے۔

گشتی کتب خانے میں تقریباً تین ہزار کتابیں ہیں۔ یہ فلم یونٹ کے ساتھ

---

[۱] مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو سنٹرل لائبریری بہاولپور از علی احمد رفعت (الزبیر کتب خانہ نمبر) ص ۲۵۹

بہاولپور ڈویژن کے اطراف واکناف میں بھیجی جاتی ہیں تاکہ دور افتادہ دیہات کے باشندے ان سے مستفید ہوسکیں۔"

تحقیقی شعبے اردو اور انگریزی کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں جن میں حوالہ کے لئے الگ الگ کتب رکھی ہوئی ہیں اگر کسی کو دوسرے شعبوں کی کتابوں کی ضرورت پیش آجائے تو یہ کتابیں وہیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔

اس طرح یہ سنٹرل لائبریری کئی شعبوں پر مشتمل ہے مرکزی شعبہ، خواتین کا شعبہ بچوں کا شعبہ، گشتی کتب خانہ اور تحقیقی شعبے۔ ان کے علاوہ ایک دارالمطالعہ ہے جس سے تقریباً چار سو افراد روزانہ استفادہ کرتے ہیں۔

کتب خانہ مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی یہ ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے جس میں کتابوں کی تعداد تقریباً دس بارہ[1] ہزار ہوگی۔ ایک دینی درس گاہ کا کتب خانہ ہونے کی وجہ سے یہاں بیشتر کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں ہیں ان کے علاوہ انگریزی، ہندی اور گورمکھی کی بھی موجود ہیں۔ علوم قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم تاریخ ہند و پاکستان، سیاسیات، فلسفہ، ادب، نجوم اور فلکیات وغیرہ کی کتابیں، اور ہند و پاک کے مشہور اخبارات و رسائل کے فائل بھی ہیں۔ مخطوطات کے ذخیرے میں بعض نسخے نادر کہے جاتے ہیں۔ اس کتب خانہ میں انجیل کے بیس نسخے ہیں اور سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کا ایک نہایت ضخیم نسخہ بھی ہے چونکہ اس مدرسہ کے بانی مولانا فضل محمد دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں اس تعلق کی بناء پر انھوں نے یہاں کے اکابر و اساتذہ کے مکتوبات اور تحریرات کو نہایت احتیاط و حفاظت کے ساتھ کتب خانہ میں رکھا ہے۔

مدرسہ عربیہ قاسم العلوم ضلع بہاولنگر (بہاولپور ڈویژن) کی ایک چھوٹی سی بستی فقیر والی میں واقع ہے مدرسہ میں طلباء کی خاصی تعداد ہے جو طلباء دارالا...

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد ایوب قادری کا مضمون مندرجہ البلاغ کراچی (جمادی ۱۳۹۱ھ - ص ۴۲)

یں رہتے ہیں ان کو خوراک یا وظیفہ بھی مدرسہ کی طرف سے ملتا ہے غرض ایک نہایت معمولی بستی میں ایسا وقیع مدرسہ اور کتب خانہ قائم کر دینا مولانا فضل محمد کی علم دوستی، ہمت اور استقامت کا ایک بے مثل کارنامہ ہے۔

مبارک لائبریری محمد آباد

بہاول پور کے ضلع رحیم یار خاں کے موضع محمد آباد (متصل سنجر پور) میں سید مبارک شاہ جیلانی نے ایک اردو لائبریری قائم کی تھی جو مبارک لائبریری کے نام سے مشہور و معروف ہے اس کی برصغیر کے مشاہیر[1] نے بڑی تعریف کی ہے۔ چراغ حسن حسرت نے تو یہ لکھا ہے کہ "بہاولپور کے ریگستان میں ادب اردو کا گلستاں کھلایا ہے"

لائبریری میں کتابوں کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ قدیم رسائل و جرائد کے فائل بھی کافی تعداد میں ہیں۔ یہ کتابیں جس محنت، لگن اور شوق سے جمع کی گئی ہیں اس کا اندازہ لگانے کے لئے سید صاحب کی یہ تحریر پڑھیئے جو خود انھوں نے کتب خانہ کی ایک کتاب پر لکھی ہے۔

> "مجھے اس کتاب کو خریدنے کا شوق تھا مالی حالت سقیم ہونے کے باعث اپنا یہ ارمان پورا کرنے کی کوئی سبیل دکھائی نہ دیتی اس زمانہ میں روساء کے ہاں موڑھے کرسیوں کا کام دیتے تھے اور کرسیاں ڈھونڈے سے بھی نہ ملتی تھیں میں نے آری بسولا سنبھالا اور ایک کرسی بنا ڈالی جو ایک رئیس کو پسند آگئی میں نے موقع غنیمت سمجھا، کرسی فروخت کی اور یہ کتاب خرید لی۔"

سید مبارک شاہ جیلانی کا انتقال ۱۹۷۰ء میں ہو گیا لیکن ان کے بعد بھی ان کا قیمتی ذخیرۂ کتب نہ صرف محفوظ رہیگا بلکہ ترقی کرتا رہے گا کیونکہ ان کے صاحبزادے انیس شاہ جیلانی بھی کتابوں کے شائق اور بڑے اچھے ادیب و مصنف ہیں ان کی دو کتابیں "نوازش نامے" (چند مشاہیر کے خطوط اور مختصر حالات) اور "نیاز فتحپوری" شائع ہو چکی ہیں۔ انیس شاہ کی نسبت محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ اُن کے پاس برصغیر کے نامور

---

[1] مشاہیر کی نگارشات کے لئے ملاحظہ کیجئے "مبارک اردو لائبریری" از میرزا بد حسین (الزبیر کا کتب خانہ نمبر۔ ص ۵۱۴ تا ۵۱۷)

ادبار و شعرا و مشاہیر و اکابر کے خطوط ہزاروں کی تعداد میں محفوظ ہیں۔ حسرت شملوی مرحوم کا تو تمام و کمال ذخیرہ انھوں نے حاصل کر کے تلف ہونے سے بچالیا اور اب وہ اس کی اشاعت میں کوشاں ہیں۔

کتب خانہ میر زاہد حسین صادق آباد

یہ نفیس کتب خانہ بھاول پور کی تحصیل صادق آباد کے ایک رئیس میر زاہد حسین کے ذوقِ کتب اندوزی کی آئینہ داری کر رہا ہے اس میں تقریباً دس بارہ ہزار کتابیں ہیں ان میں سے بہت سی کمیاب اور نایاب ہیں۔ تحریک پاکستان، مسلم لیگ اور برصغیر کی دیگر تحریکات پر نہایت نادر ذخیرہ یہاں جمع ہے۔ قدیم رسائل و جرائد کی فائلیں بھی ہیں ان میں سرسید احمد خاں کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے تقریباً تمام شمارے محفوظ ہیں۔

میر صاحب نے اپنے کتب خانہ کی درجہ بندی حسب ذیل شعبوں میں کی ہے

اسلامیات، اقبالیات، جناحیات (قائداعظم، مسلم لیگ، پاکستان) غالبیات حافظیات (حافظ شیرازی) شعر و شاعری، تذکرہ، ادب، سوانح، نام و پیام (مکتوبات) سیاست، تاریخ، زراعت، طب، سیر و سیاحت، تہذیب و تمدن، فلسفہ، اخلاقیات لغت، تصوف، فقہ، منطق، صنعت و حرفت، آرٹ، انشار، درس و تدریس، لسانیات تلاش و تجسس، آثار قدیمہ، جغرافیہ، نفسیات، جنسیات، نسوانیات، ضبطِ تولید، مخطوطات و متفرقات۔

میر صاحب کے آبار و اجداد کا وطن ڈاسنہ (ضلع میرٹھ) ہے اُن کے دادا میر محمد یاسین کے زمانہ سے ان کا خاندان ریاست بہاول پور میں آباد ہے انھیں کتابیں جمع کرنے کا شوق ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے دادا نے مذہبی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا تھا وہ اب تک ان کے چچا کے پاس محفوظ ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ میر صاحب کتابوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ اس محبت کا آغاز ان کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو گیا تھا آگے چل کر یہ محبت اتنی شدید ہو گئی کہ اس کی خاطر انھوں نے روحانی اذیتیں اُٹھائیں اور رسوائیاں بھی سہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "کتابوں کے عشق نے مجھے رسوائیوں سے بھی ہمکنار کیا ہے"

اس رسوائی کا ذکر انھوں نے بڑی تفصیل سے کیا ہے جو طوالت کے خیال سے ہمنے بیان نہیں کیا ہے
یہ کتب خانہ برابر ترقی کر رہا ہے اس کی تعمیر و ترقی میں ایک علم دوست تاجر کتب مولوی شمس الدین (متوفی ۱۹۶۰ء) نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا پورا عکس میر صاحب کی تحریر میں نظر آرہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مسلم مسجد چوک انار کلی لاہور کے نامور تاجر کتب مولوی محمد شمس الدین کے خلوص اور تاجرانہ عظمت کا اعتراف مصر، ہندوستان، ایران، افغانستان تک میں کیا جاتا ہے انھوں نے میرے شوق کتب اندوزی کو جنون میں بدل کر رکھ دیا ہے مولوی صاحب کی زندگی کا مقصد ہی صرف ایک ہے کہ نادر و نایاب کتابیں کم سے کم قیمت پر ارباب ذوق کو مہیا کر کے ملک میں زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ کتابوں کا جال سا بچھا دیا جائے۔ میرے کتب خانہ کی اہمیت کا راز مولوی شمس الدین کی مشفقانہ رہنمائی میں مضمر ہے بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ملک میں جس قدر اعلیٰ کتب خانے ہیں ان میں سے اسی نوے فی صد مولوی شمس الدین صاحب کے مرہون فیض ہیں ؎

یک چراغست کہ از پرتو آں
ہر کجا کہ می نگریم انجمنے ساختہ اند

---

۵ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "میراذوق کتب اندوزی" از میر زاہد حسین (الزبیر کا کتب خانہ نمبر ص ۵۰۵)

دیگر ذاتی کتب خانے

حکیم عبداللہ اور عبدالمجید قریشی کے کتب خانے

بہاول پور ڈویژن کے بعد ضلع ملتان کے بھی دو کتب خا[نے] دیکھ لیجئے اس ضلع کے ایک قصبہ جہانیاں میں حکیم محم[د] عبداللہ مرحوم اور مولوی عبدالمجید قریشی کے کتب خانے ہیں۔

حکیم صاحب نے تقسیم ہند سے قبل قصبہ روڑی (ضلع حصار، مشرقی پنجاب) میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا وہ دس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا مگر یہ تمام کتابیں ۱۹۴۷ کے بعد انقلاب کی نذر ہوگئیں پاکستان آکر انھوں نے نئے سرے سے کتب خانہ قائم کیا جس میں کتابوں کی تعداد چار پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ حکیم صاحب مرحوم کو کتابوں سے بڑی محبت تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے اللہ اور رسول کے بعد دنیا میں کتاب سے زیادہ پیارا کوئی نہیں" کہا جاتا ہے کہ کتابوں سے ان کے قلبی تعلق کا یہ عالم تھا کہ کسی نئی یا نایاب کتاب کا ذکر سنتے ہی وہ بے چین ہوجاتے اور کوشش کرتے کہ وہ کتاب جلد سے جلد ان کے کتب خانہ میں پہنچ جائے۔ ان کی اس کیفیت کا ایک تجربہ خاکسار کو بھی ہوا جب ۱۹۵۱ء میں میرا سفرنامہ حج (چند دن حجاز میں) شائع ہونے کی انہیں اطلاع ملی تو اسے منگانے کے لئے ان کا خط میرے پاس علی گڑھ آیا۔ اس سفرنامہ کے ساتھ میں نے اپنی اور کتابیں بھی انہیں ارسال کر دیں۔ یہ تحفے پاکر انھوں نے اپنی ایک کتاب "کنز المجربات" مجھے عطا کر دی حکیم صاحب کی یادگار کئی کتابیں ہیں جن میں مقبول ترین کتاب یہ ہی ہے اس میں ہر بیماری کے اسباب، علامات اور ہر مرض کے علاج کے لئے زود اثر مجرب نسخے

آسان زبان میں لکھے گئے ہیں جن سے معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

مولوی عبد المجید قریشی کا کتب خانہ اُن کی کتابوں سے گہری دلچسپی کا آئینہ دار ہے پوسٹل ڈیپارٹمنٹ کے اس عہدہ دار کو کتابوں سے محبت اوائل عمری ہی میں ہو گئی تھی جو عمر بڑھنے کے ساتھ مجنونانہ انداز اختیار کرتی رہی اس علم پر درجنوں کی کیفیت قریشی صاحب ہی کی زبان قلم سے سنئے وہ رقم طراز ہیں کہ "اب میں چند واقعات[1] ایسے سپرد قلم کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ میں نے اپنی پسندیدہ کتابیں حاصل کرنے کی خاطر کس طرح اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹا کس قدر ذہنی پریشانیاں مجھے اس راہ میں لاحق ہوئیں کیسے شب و روز ان کے فراق میں گذرے اور کس کس در کی خاک میں نے ان کی تلاش میں چھانی تب کہیں جا کر یہ گوہر مقصود ہاتھ آئے"

قریشی صاحب نے اپنے کتب خانہ کے متعلق یہ تحریر کیا ہے۔

> "یہاں میں بہت ہی ڈرتے ڈرتے اپنی چار پانچ سو کتابوں کو ایک کتب خانہ کا نام دے رہا ہوں وہ بھی محض اس وجہ سے کہ لغات میں اس سے کمتر درجہ کا کوئی لفظ نہیں پاتا ورنہ جہاں تک کتب خانہ کی اصطلاح اور اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا تعلق ہے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اپنی کتابوں کے اس انتہائی محدود سے ذخیرہ کو کتب خانہ کہوں میں کیا اور میرا کتب خانہ کیا۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ والی بات ہے"

چند ذاتی کتب خانے مندرجہ بالا ذاتی کتب خانوں کے ساتھ ہی چند اور کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے خیال رہے کہ پاکستان کے ہر قصبہ اور ہر شہر میں کتابوں کے ایسے شیدائی موجود ہیں جو اپنے ذخائر کتب کو حرز جاں بنائے ہوتے ہیں۔ ان میں سے یہ اسمائے گرامی بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ کراچی میں پیر حسام الدین راشدی، محمد ایوب قادری اور سید محمد حیدری۔ لاہور میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری،

---

[1] ان واقعات کے لئے دیکھئے "میں اور میرا کتب خانہ" از عبد المجید قریشی ذالزبیر کا کتب خانہ نمبر۔ ص ۷۹۴)

اقبال مجددی اور محمد عالم مختار حق ۔ شرق پور شریف (ضلع شیخوپورہ) میں میاں جمیل احمد (سجادہ نشین حضرت میاں شیر محمدؒ) اور مولانا شاہ شریف حسین شرافت نوشاہی (سجادہ نشین خانقاہ نوشاہیہ، ساہن پال ضلع گجرات) کے ذخائر کتب نہایت نادر کتب خانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سرحد کے کتب خانے

پشاور

یہاں مولانا غلام جیلانی نے بھی کتابوں کا بڑا نادر ذخیرہ جمع کرلیا تھا
انہیں کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا وہ تیرھویں صدی ہجری کے علما میں اتنا بلند
رتبہ رکھتے تھے کہ ان سے استفادہ کرنے غزنی، ہرات، سمرقند، بخارا اور کابل تک سے
طلبا آیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحیم (سابق لائبریرین اسلامیہ کالج پشاور) لکھتے ہیں
"ان کے تبحر علمی کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس عظیم الشان کتب خانہ میں ایسی
کتابیں کم تر ہوں گی جن پر علامہ موصوف نے مطالعہ کرکے کچھ حاشیے یا کوئی مفید
یادداشت نہ لکھی ہو"، بقول محمد امیر شاہ قادری آپ کی یہ عادت تھی کہ اپنے مطالعہ میں
ٹہنیوں کے بل بیٹھے بیٹھے رات گزار دیتے تھے۔

کتب خانہ غلام جیلانی

مولانا غلام جیلانی کے کتب خانہ کی جھلک مولانا عبدالرحیم کی تحریر
میں دیکھئے انھوں نے ہی اس کی فہرست مرتب کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ
"اس میں مختلف علوم وفنون کی تین ہزار کتابیں موجود ہیں جن میں
سے اکثر کتابیں اپنی قدامت، کمیابی، خوش خطی اور دیگر خصوصیات کی وجہ سے نہایت
اہمیت رکھتی ہیں بعض کتابیں تو ایسی نایاب ہیں کہ ہندوستان بھر کے کتب خانوں میں ان
کا وجود نہیں ملتا۔ ۵ دسمبر ۱۹۱۵ء کو جب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم دہلوی
نے اس کتب خانہ کا معائنہ کیا تو باوجود اس وسعتِ نظر کے جوان کو فنِ طب میں حاصل
ہے انھوں نے بعض طبی کتابیں خاص طور پر نکلوائیں۔ غور و خوض سے دیر تک ان کا
مطالعہ کیا اور ان کو درِ نایاب سے تعبیر کیا"

مولانا صاحب اپنے کتب خانہ سے اتنی گہری دلچسپی رکھتے تھے کہ حج کے فریضہ کی

ملاحظہ ہو مولانا محمد امیر شاہ قادری کی کتاب "تذکرہ علماء و مشائخ سرحد" ص ۱۱۶۔

اداتیگی کے دوران بھی اسے فراموش نہیں کیا وہ اس موقع پر عرب سے نایاب کتابیں لا
تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں انجیل مقدس کا بھی ایک ایسا اعلیٰ نسخہ تھا جس کی زیارت کے
لئے بڑے بڑے عیسائی آیا کرتے تھے چنانچہ ان کی وفات (۱۸۷۶ء) کے بعد اسے یورپ بھیجد
گیا اور ان کا کتب خانہ پشاور کالج لائبریری میں شامل کر دیا گیا تھا۔

یہ کالج صاحبزادے سر عبدالقیوم خاں مرحوم نے ۱۹۱۳ء میں قائم کیا تھا کالج کی ترقی
کے ساتھ اس کتب خانہ کی بھی ترقی ہوتی رہی اب سے چند سال بیشتر یہاں کتابوں کی
تعداد پینتیس ۳۵ ہزار تھی جواب بڑھ کر پچپن ۵۵ یا ساٹھ ہزار تک پہنچ چکی ہوگی مولانا غلام جیلا
کے بے بہا علمی ذخیرے کے شامل ہو جانے سے اس کتب خانہ کے مرتبہ میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔

دیگر کتب خانے پشاور میں مولانا محمد امیر شاہ قادری، مولوی محمد اسرائیل
اور ڈاکٹر بشیر احمد خاں کے کتب خانے بھی قابل ذکر ہیں اول الذکر دونوں کتب خانوں میں
نادر مخطوطات ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا کتب خانہ تصوف کی کتابوں پر مشتمل ہے پشتو اکیڈ
یونیورسٹی لائبریری اور محکمہ آثار قدیمہ (آرکائوز) کی لائبریریاں بھی یہاں موجود ہیں
ان کے علاوہ سرحد کے متعدد شہروں میں گیارہ عوامی کتب خانے ہیں۔

اسی علاقے میں ایک مقام حضرو ضلع کیمبلپور میں ایک ذی علم زمیندار خواجہ محمد خا
اسد ہیں جو کتابوں کے شیدائی ہیں انھوں نے اس قصبہ میں ایک کتب خانہ "میرا کتب خا
کے نام سے قائم کر رکھا ہے جس میں تین چار ہزار کتابیں ہونگی تمام کتابیں نہایت سل
اور جلد بندی کیساتھ الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں تقریباً ایک سو کے قریب مخطوطات ہیں
پرانے رسائل کا بھی اچھا ذخیرہ ہے۔ ملک کے مختلف اہل علم اس کتب خانے کو دیکھنے آ
رہتے ہیں ان کے ایک عزیز سکندر خاں اور ایک دوست اختر صاحب بھی کتابوں کے
شوقین ہیں اور اپنے اپنے ذاتی کتب خانے بنا رہے ہیں۔

خواجہ محمد خاں کے رفقاء نے ایک اہم کام یہ کیا ہے کہ ضلع کیمبلپور کے ذاتی کتب خانوں کے
مخطوطات کی فہرست مرتب کر رہے ہیں اور اس سلسلہ کی اب تک دو تین فہرستیں شائع کر چکے ہیں۔

---

۵۹ اس کتب خانہ کے بارے میں ڈاکٹر کے۔ بی نسیم کا مضمون ملاحظہ کیجئے۔ دالزبیر کا کتب خانہ نمبر ص ۵۹

بلوچستان کے کتب خانے

بلوچستان

بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین سے علم و ادب کے جو چشمے پھوٹے ان سے کتب خانے بھی سیراب ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کی ترقی کے لئے صورتیں نکلتی رہیں خیال رہے کہ انگریزوں نے اس علاقہ پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد اپنے سیاسی مصالح کے پیش نظر یہاں تعلیم کی اشاعت کے لئے کوئی موثر اقدامات نہیں کئے اور اس میدان میں کام کرنے والوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی بھی نہیں کی لیکن اہل بلوچستان کے دلوں میں اسلام کی محبت اور خدمت کا جو جذبہ کارفرما تھا اسی نے اشاعتِ علم کا شوق ابھارا اور متعدد دینی مدارس قائم ہوئے۔

درس گاہیں درخاں میں ایک دینی درس گاہ موسومہ "مدرسہ درخانی" کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر مدرس اور موسس مولانا فاضل رئیسانی تھے۔ یہ مدرسہ اصل میں تو عیسائی مشنریوں کے تبلیغی کاموں کا سدباب کرنے کے لئے قائم ہوا تھا لیکن اس کے اثرات سے علمی وسیاسی ترقیوں کی ایک لہر دوڑ گئی اور سیاسی شعور بھی بیدار ہوگیا "مدرسہ درخانی" کے علماء کرام کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے بلوچی زبان کی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا اور تحریک خلافت اور تحریک پاکستان کی سرگرمیوں میں بھی شریک رہے۔

بلوچستان میں قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد جو مدارس عربیہ قائم ہوئے ان کی تعداد چوالیس بتائی گئی ہے ان سے کتب خانہ بھی منسلک ہیں اس سلسلہ میں حافظ نذر احمد نے لکھا ہے[1]۔

"ہر دینی درس گاہ میں خواہ وہ ایک چھوٹا مدرسہ ہو یا بڑا دارالعلوم، دارالکتب موجود ہیں ان کے علاوہ مدارس عربیہ کے اساتذہ کرام اور مہتمم حضرات کے ذاتی کتب خانے بھی ہیں ان کتب خانوں میں عام طور پر دو چار قلمی کتب، مخطوطات اور نادر کتابیں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان" مرتب حافظ نذر احمد (مسلم اکاڈمی، لاہور) ص ۶۷۲۔

جمع ہیں خصوصاً عربی فارسی زبانوں کے نادر اور نایاب نسخے موجود ہیں۔"

علمی و ادبی انجمنیں یہاں علمی و ادبی انجمنوں کے قیام سے بھی کتابیں جمع کرنے کے ذوق کو تقویت ملی، ۱۹۲۷ء میں "بزم ادب" بمقام کوئٹہ قائم ہوئی تھی ان علمی انجمنوں کے ضمن میں یہ اہم نکتہ یاد رہے کہ ان کے دائرہ عمل میں بلوچی زبان کی توسیع و ترقی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی ترویج بھی شامل رہی چنانچہ اس بزم کی جانب سے ایک رسالہ "نوشیرواں" نکلتا تھا یہاں کی ادبی مجالس میں اردو سے متعلق بھی مقالے پڑھے جاتے تھے سن ۱۹۴۲ء کے ایک جلسہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں موضوع بحث یہ تھا "اردو کی خدمت نثر سے زیادہ ہوسکتی ہے یا نظم سے"

لیکن "ادارۂ ادب بلوچستان" (کوئٹہ) کو بلوچستان کا سب سے بڑا علمی ادارہ کہا جاتا ہے جس کی بنیاد ۱۹۵۴ء میں رکھی گئی تھی یہاں بھی ادبی جلسے ہوتے تھے اور اس ادارہ سے بھی ایک لائبریری منسلک تھی۔ یاد رکھیئے کہ اس ادارے کے مقاصد بڑے بلند تھے ان کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان کے یہ اجزاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"بلوچستان میں دستیاب ہونے والے مخطوطات کی حفاظت و اشاعت کا انتظام کرنا نیز بلوچستان سے متعلق نادر و نایاب مطبوعات اور ان کے تراجم شائع کرنا۔ اردو، فارسی کی علمی، ادبی، تاریخی بلند پایہ کتب کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کروانا اور ایک ریسرچ لائبریری کا قیام۔"

کتب خانوں کی ترقی غرض دریگاہوں اور علمی انجمنوں کی تعداد بڑھتی رہی اور ان کے ساتھ کتب خانوں کی بھی ترقی ہوئی۔ بلوچستان کے مختلف شہروں میں تو عوامی کتب خانے قائم ہو گئے ہیں۔ کوئٹہ میں یونیورسٹی بھی قائم ہو چکی ہے اور اس میں کتب خانہ کا قیام عمل میں آگیا ہے توقع ہے کہ یہ ترقی کر کے ملک کے درس گاہی کتب خانوں میں ایک معزز مقام حاصل کرلے گا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو "بلوچستان میں اردو" از ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ [۲] علم و آگہی ص ۱۹۱۔
[۳] علم و آگہی۔ ص۔ ۱۸۰ - ۱۸۱

اسلام آباد

...ی کتب خانہ ...سلام آباد

پاکستانی کتب خانوں کی داستان کو قومی کتب خانے کے ذکر پر ختم کیا جاتا ہے گو اس کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن اس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کا شمار پاکستان کے عظیم کتب خانوں میں ہوتا ہے ...عرصہ پہلے یہاں اردو، عربی اور انگریزی کتابوں کی تعداد[۱] انتالیس[۳۹] ہزار تھی جواب ایک ...تک پہنچی ہوگی کیونکہ یہ کتب خانہ توسیع و ترقی کے منازل بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے ...ی اور معیاری کتابوں کے اضافے کیے جا رہے ہیں۔ یہاں کے اردو، عربی اور انگریزی ...ائر کی یہ خصوصیات[۲] بتائی گئی ہیں کہ "اردو ادب پر جس قدر اچھی کتابیں یہاں موجود ...ہ کسی دوسرے سرکاری کتب خانہ میں نہیں۔ عربی زبان میں اتنا اچھا ذخیرہ پاکستان ...کم کتب خانوں میں ملے گا۔ انگریزی ادب پر تحقیق کرنے والے حضرات کو یہاں کافی مواد ...ستیاب ہو سکتا ہے شعبۂ انگریزی میں تاریخ اقوام عالم پر بیش قیمت ذخیرۂ کتب بے ...بڑی کاوشوں اور محنت سے فراہم کیا گیا ہے" اس موقع پر بھی یہ حقیقت یاد رکھئے ...کتب خانہ کی اہمیت کا انحصار تعداد کتب پر نہیں ہوتا بلکہ کتابوں کی نوعیت اور افادیت ...ہوتا ہے۔

...ں کتب خانے

اسلام آباد کی درس گاہوں کے کتب خانوں میں یہاں کی "یونیورسٹی لائبریری" کو خاص امتیاز حاصل ہے اس میں سال بہ سال جملہ ...لوم و فنون کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے پاکستان کے نامور دانشور پیر حسام الدین ...ے بیش قیمت کتب خانہ کے شامل ہو جانے سے اس لائبریری کی قدر و قیمت میں بڑا ...ضافہ ہو گیا ہے۔

سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کتب خانہ بھی نہایت عالی شان ہے

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے "پاکستان کا قومی کتب خانہ" از اشرف علی (کتب خانہ نمبر ...لبنزیر۔ ص ۱۹۸۔۱۹۹)

اس میں علوم اسلامی پر ایسا اعلیٰ ذخیرہ ہے جو پاکستان کی کسی اور لائبریری میں نہیں
یہاں محققین کو تحقیق کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ فوٹو اسٹیٹس کا سیکشن بھی اس
سے منسلک ہے۔

"کتب خانہ گنج بخش" مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کا یہ عظیم الشان کتب خانہ
حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کے نام پر قائم کیا گیا ہے یہاں بارہ ہزار مطبوعات اور آٹھ ہزار
مخطوطات جمع ہیں جن میں بہت سے بیش قیمت ہیں مخطوطات کی تفصیلی فہرست دو جلدوں
میں شائع ہو گئی ہے اس مرکز سے علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت بھی ہوتی رہتی ہے
کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہاں سے محمد حسین تسبیحی کے مضامین "فارسی پاکستانی و پاکستان
شناسی" کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ پاکستان کا دارالخلافہ اسلام آباد بھی ہر قسم کے کتب خانوں سے معمور ہے
یہاں وفاقی اسمبلی اور سکریٹریٹ وغیرہ کے دفاتر اور سفارت خانوں کے علاوہ اسلام آباد
یونیورسٹی، پیپلز اوپن یونیورسٹی، اٹامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور بہت سے تعلیمی، علمی
وادبی اور سماجی ادارے بھی ہیں۔ ان سب سے جو کتب خانے منسلک ہیں ان میں کے بیشتر
بڑے نایاب اور اعلیٰ شمار کئے جاتے ہیں۔

کتب خانوں کی کثرت

حاصل کلام یہ ہے کہ پاکستان میں کتب خانے بڑی کثیر تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں
ان میں عوامی، مرکزی سرکار کی وزارتوں، صوبہ جاتی حکومتوں کے محکموں، پاکستان نیشنل سینٹر کے مرکزوں،
اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، مذہبی، سماجی، سیاسی، علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں
کے کتب خانے شامل ہیں علاوہ ازیں میونسپل کارپوریشنوں اور میونسپلٹیوں نے بھی تمام
شہروں کے مختلف علاقوں میں عوامی کتب خانے کھول رکھے ہیں۔ خیال رہے کہ پاکستان
میں کتابوں کے ایسے شائقین کتب بھی ہیں جن کے پاس کتابوں کے نایاب ذخیرے موجود ہیں
ان ہزارہا کتب خانوں کا احاطہ کرنا ان محدود اوراق میں ممکن نہیں ہے تاہم کچھ کتب خانوں

تفصیلات پچھلے صفحات میں پیش کر دی گئی ہیں۔ اور پبلک کتب خانوں کی تعداد کا ایک گوشوارہ آخر میں دیدیا گیا ہے۔

جہاں تک کتب خانوں میں کتابوں کی مجموعی تعداد کا تعلق ہے ان کے اعداد و شمار پیش کرنا مشکل ہے لیکن پاکستان نیشنل سینٹر کے ضمن میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ان کی تمام شاخوں کے کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ چھہتر ہزار ہے[1] اس پر قیاس کر کے اگر تمام پاکستانی کتب خانوں کی کتابوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو وہ پانچ یا چھ کروڑ ہوگی۔

یہ بھی پاکستان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ کتب خانے قائم کرنے کا رجحان برابر بڑھتا جا رہا ہے اور ان کی اس اہمیت کا اب پورا احساس ہو گیا ہے کہ علمی، تعلیمی، اور تحقیقی ضرورتیں پورا کرنے اور عوام میں کتب بینی کا ذوق پھیلانے کا نہایت موثر ذریعہ کتب خانے ہی ہیں۔ اس اہم ذریعہ کی توسیع کے لئے سابق حکومت نے پچاس ہزار کتب خانوں کے قیام کا منصوبہ بنایا تھا اگر اس کی تکمیل ہو گئی تو پاکستان کتابوں کے معاملہ میں خود کفیل ہو جائے گا۔

کتب خانوں کی توسیع کے ساتھ ان کی افادیت بڑھانے کا مسئلہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیا اچھا ہو کہ اہم کتب خانوں کا ایک "یونین کٹلاگ" مرتب کر دیا جائے جس سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ کون سی کتابیں کس کتب خانے میں ہیں۔ اس کٹلاگ سے ایک طرف تو علمی حلقوں بالخصوص ریسرچ اسکالرس کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسری طرف ملک کی علمی دولت کا قابلِ قدر حصہ عوام کی نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

---

[1] علم و آگہی۔ ص ۲۷۷۔

پبلک کتب خانوں کا گوشوارہ

ان کتب خانوں کی تعداد[1] صوبہ وار پیش کی جا رہی ہے

پنجاب - ۱۶۱			
اسلام آباد	۲	شیخوپورہ	۷
بھاول پور	۸	ساہیوال	۹
بھاول نگر	۷	کیمبل پور	۷
جھنگ	۷	گجرات	۸
جہلم	۵	گجرانوالہ	۹
ڈیرہ غازی خاں	۷	لاہور	۱۶
راولپنڈی	۸	فیصل آباد	۱۱
رحیم یار خاں	۶	مظفر گڑھ	۴
سرگودھا	۹	ملتان	۱۷
سیالکوٹ	۸	میاں والی	۶

صوبہ سرحد	۱۱
بنوں	۲
پشاور	۵
ڈیرہ اسمٰعیل خاں	۲
کوہاٹ	۱
مردان	۱

بلوچستان	۹
سبی	۲
قلات	۲
کوئٹہ	۴
لورالائی	۱

سندھ - ۵۸			
تھرپارکر	۳	خیرپور	۱
ٹھٹھہ	۱۰	سانگھڑ	۲
دادو	۲	سکھر	۴
جیکب آباد	۳	کراچی	۲۵
حیدرآباد	۹	لاڑکانہ	۴
		نواب شاہ	۴

آزاد کشمیر	۱
مظفر آباد	۱

ان کتب خانوں کی مجموعی تعداد دو سو چالیس ہوتی ہے۔

[1] یہ تعداد ذیل کی گورنمنٹ رپورٹ سے لی گئی ہے اس میں کتب خانوں کے نام بھی دئے ہوئے ہیں

A GUIDE TO PUBLIC LIBRARIES, MINISTRY OF EDUCATION, KARACHI (QUAID-E-AZAM CENTENARY CELEBRATIONS-1976)

ہندوستان کے کتب خانے

دہلی

ہندوستان کا دارالحکومت دہلی، علم وفضل اور ذخائر کتب کے لحاظ سے ہمیشہ مالامال رہا ہے ہند کے دور قدیم سے لے کر آج تک یہ طرح طرح کے تہذیب وتمدن کا گہوارہ اور بڑی بڑی بادشاہتوں کی راجدھانی بنا رہا۔ اس کی سرزمین سے فخرِ روزگار مشائخ، عالم، نثار، شاعر اور ارباب کمال اٹھے تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اور یہ بات کسی سے پوشیدہ بھی نہیں کہ دہلی کے حضرت امیر خسرو، حضرت شاہ ولی اللہ، میر تقی میر، غالب، سرسید، آزاد، نذیر احمد اور ذکاءاللہ کی قلمی کاوشوں سے مذہب، تاریخ، اردو ادب اور موسیقی وغیرہ کے بہت سے چشمے جاری ہوئے۔ ہندوپاک کی مقبول عام زبان اردو اسی شہر کے گہوارے میں پلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ یہیں کی اردو زبان اور اس کے محاورے معیاری اور ٹکسالی قرار پائے۔

یہ تاریخی شہر علوم باطنی کا بھی مرکز و منبع رہا ہے۔ اسے بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ کہا جاتا ہے یہاں سلسلہ چشتیہ کے بائیس عظیم بزرگ اور دیگر ممتاز صوفیائے کرام، علماء اور سخنوران باکمال زیرِ زمیں محوِ خواب ہیں جن کا عکس حالی کے اس شعر میں نظر آتا ہے ؎

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک ÷ دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

دہلی کے تخت شاہی پر ۱۲۰۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک بہت سے مسلم حکمران جلوہ افروز رہے ان میں بیشتر علم اور کتابوں سے بے حد رغبت رکھتے تھے اور بعض تو کتابوں کے ایسے دلدادہ تھے کہ مہمات اور سفر کے دوران بھی کتابیں اپنے ساتھ رکھتے تھے ایسے

صاحب ذوق بادشاہوں کے عہد میں کتابیں جمع کرنے کے شوق کو بڑھنے اور پھیلنے کے
سنہرے موقع ملے اور خاص بات یہ ہوئی کہ یہ ذوق دہلی تک محدود نہ رہا۔ بلکہ شاہان دہلی
فتوحات کی جلو میں دکن، گجرات، بنگال اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی پہنچ
گیا۔ یاد رکھیئے کہ اس ۶۵۲ (۱۲۰۶ - ۱۸۵۷ء) برس کے عرصہ میں جو بے شمار کتب خانے
قائم ہوئے ان کی جھلکیاں پچھلے صفحات میں دکھا دی گئی ہیں۔

کتب خانے کتب خانوں کی تاریخ کا یہ پہلو ایک خاص امتیاز رکھتا ہے کہ سن ستاون
کے انقلاب میں ہند کی مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا مگر کتب خانوں
کے پھیلنے کی راہیں مسدود نہ ہوئیں اور اس انقلاب کی خاکستر سے ان کیلئے نئے جہان پیدا
ہوتے رہے۔

ہارڈنگ لائبریری قدرت کی یہ کرم فرمائی بھی دیکھئے کہ دہلی کے جس چاندنی
چوک میں شہدائے سن ستاون کے خون کی ندیاں بہیں وہیں کتب خانوں کی ترقی کا
ایک چشمہ بھی اُبل آیا۔ یہاں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ (۱۹۱۰ - ۱۹۱۶ء) پر بم
گرا تھا ان کے اس حادثہ سے بچ جانے کی یاد قائم کرنے کے لئے جو چندے دیے گئے ان
ہی سے ۱۹۱۶ء میں موجودہ "ہارڈنگ لائبریری" کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

دہلی کی یہ قدیم پبلک لائبریری انیسویں صدی کے اختتام پر قائم ہوئی تھی
اس وقت اس کا نام "دہلی انسٹی ٹیوٹ لائبریری" تھا مگر بم کے اس حادثہ کے بعد
یہ "ہارڈنگ لائبریری" کہلاتی ہے اور شہر کے مرکزی مقام چاندنی چوک کے قریب
کمپنی باغ میں واقع ہے اب یہاں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ ہو گی جس میں انگریزی
اور ہندی کے علاوہ عربی فارسی اور اردو کی بھی کافی کتابیں ہیں۔ ریڈنگ روم
میں تقریباً دو سو اصحاب بہ یک وقت اخبار و رسائل وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔
تقسیم ہند سے پیشتر یہاں لائبریری سائنس کی تعلیم بھی دی جاتی تھی مگر اس کا سلسلہ
صرف چند سال تک جاری رہا۔

اس کتب خانے کے علاوہ اور بھی عوامی کتب خانے ہیں۔ برطانوی حکومت

کے دور میں بھی یہ شہر کتب خانوں سے خالی نہ رہا اور ان کی توسیع و ترقی کے لئے ہر طبقہ کے افراد کوشاں رہے اسی زمانہ کی یادگار "نذیریہ پبلک لائبریری" ہے جو شمس العلماء مولوی نذیر حسین محدث دہلوی کے قیمتی ذخیرۂ کتب سے قائم ہوئی ہے "مارواڑی پبلک لائبریری" مہابیر جین پبلک لائبریری اور اندر پرست پبلک لائبریری بھی دہلی کے عمدہ کتب خانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان میں مارواڑی پبلک لائبریری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دہلی کی سب سے پرانی پبلک لائبریری ہے لیکن آج کل یہاں کے عوامی کتب خانوں میں "دہلی پبلک لائبریری" نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے جو تقسیم ہند کے بعد قائم ہوئی ہے

دہلی میں شاہی مسجد فتح پوری کے مدرسہ، جامعہ ملیہ، دہلی یونیورسٹی جواہر لال یونیورسٹی اور دیگر درس گاہوں کے بہت سے کتب خانے ہیں۔ یہاں نیشنل آرکائوز لائبریری" نہایت قیمتی علمی سرمایہ کا مخزن و مسکن ہے اور ایک زراعتی لائبریری موسومہ لنلتھگو لائبریری میں زراعت کی بڑی اعلیٰ کتابیں محفوظ ہیں۔

سرکاری کتب خانوں میں "سکریٹریٹ لائبریری" سرکاری کتب ۱۰ ا ا ور رپورٹوں کے بڑے اہم ذخیرے رکھتی ہے۔ اس میں مختلف علوم کی کتابیں اور کچھ قدیم مخطوطات بھی ہیں۔ یہاں کے ذخائر کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے اس لائبریری میں لائبریری سائنس کی تعلیم بھی دیجاتی ہے۔ مرکزی گورنمنٹ کی وزارتوں کے مختلف شعبوں سے بھی کافی کتب خانے منسلک ہیں۔ اس مختصر جائزہ سے دہلی میں کتب خانوں کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دہلی کا ذکر تشنہ رہے گا اگر یہ نہ کہا جائے کہ یہاں بھی کتابوں کے ایسے عاشق زار رہے ہیں جن کے عشق کی آگ کسی زمانہ میں بھی سرد نہیں ہوئی اس عشق کا ایک دلکش نمونہ خان بہادر میر ناصر علی (مدیر صلائے عام دہلی) کی شخصیت ہے جن کا کتب خانہ دہلی میں ہزاروں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا ان گرانقدر کتابوں سے میر صاحب کو جو قلبی تعلق تھا اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہوتا ہے جو

انھوں نے اپنے پوتے سید انصار ناصری (ڈپٹی ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان) کو کبھی لکھ
میر ناصر علی لکھتے ہیں۔

"بیٹا میری آرزو ہے کہ کتب خانہ والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں کوئی نایاب کتاب نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ دنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں۔ سب میرے پاس ہوں جاڑے میں انگیٹھی اور گرمیوں میں برف، برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو رات کو جلانے کے لئے خوبصورت شمع دان کی روشنی ہو اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔ تم اتنا سامان میرے لئے کر دو تو" I WILL DIE HAPPY

کتب خانہ نذیریہ دہلی یہ وہ ممتاز عوامی کتب خانہ ہے جو مسلمانانِ دہلی نے ایک نہا عالی مرتبت عالم مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کی یاد برقرار رکھنے کے لئے قائم کیا تھا، اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی تحریک پر سید صاحب کے نواسے مولوی عبدالروف نے اس کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کا افتتاح مولانا ابوالکلا آزاد نے ۱۹۲۶ء میں کیا تھا۔ شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین (متوفی ۱۹۰۲ء) اہلِ حد علماء میں اتنا اعلیٰ مقام رکھتے تھے کہ موج کوثر کے مصنف نے انھیں ان علماء کا سرتاج لکھا ہے انھوں نے تقریباً پچاس برس تک درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور سیکڑوں شاگرد اپنی یادگار چھوڑے۔

سید صاحب مرحوم و مغفور کو کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اپنے کتب خانے کے لئے خود اپنے ہاتھ سے کتابیں نقل کرتے تھے اور رسل و رسائل کی شدید مشکلات کے باوجود بیرونِ دہلی سے بھی کتابیں منگاتے تھے لکھا ہے کہ "ریل جاری ہونے سے قبل ایک کتاب کسی طالب علم کو پاپیادہ لکھنؤ بھیج کر منگوائی تھی"۔ اس طرح جو کتب خانہ قائم ہوا اس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں تباہ ہو گیا مگر

سید صاحب کے دل میں کتابیں جمع کرنے کی لگن برقرار رہی اور پھر جو کچھ کتابیں اپنی رحلت کے بعد چھوڑیں ان ہی میں سے موجودہ نذیریہ لائبریری کی بنیاد پڑی اس میں اضافے ہوئے اور بہت سی کتابیں جمع ہوگئیں جن میں مذہبی کتابوں بالخصوص علمائے اہل حدیث کی کتابوں اور مخطوطات کے قابلِ قدر ذخیرے بھی شامل ہیں' اردو فارسی' اور عربی رسائل کی جلدیں بھی موجود ہیں۔

اس کتب خانہ کو تقسیم ہند سے یہ فائدہ پہنچا کہ دہلی سے ہجرت کرنے والے اپنے ذخائرِ کتب یہاں داخل کر گئے' اس طرح کتب خانہ کے ذخائر کی تعداد بیس[۲] ہزار تک پہنچ گئی۔ خیال رہے کہ اس کتب خانہ نے ایک عرصہ دراز تک تشنگانِ علوم کو خوب سیراب کیا لیکن سن سینتالیس کے انقلاب کے اثرات سے اس کا نظم ونسق درہم برہم ہو گیا تھا اور ۱۹۶۳ء میں یہ بدانتظامی[۱] اتنی بڑھ گئی تھی کہ لائبریری سے خاطر خواہ استفادہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ توقع کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ عظیم کتب خانہ بدنظمی کے گرداب سے نکل چکا ہوگا اور اب اس سے استفادہ کی سہولتیں مہیا ہونگی۔

نیشنل آرکائیوز لائبریری

یہ لائبریری نئی دہلی کی ایک عالیشان' وسیع اور خوبصورت عمارت میں ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی تمام کتابیں ایک سیدھی قطار میں رکھدی جائیں تو یہ قطار تیرہ[۱۳] میل لمبی ہو گی۔ یہ ۱۸۹۱ء میں بمقام کلکتہ قائم ہوئی اور ۱۹۳۷ء میں دہلی منتقل کر دی گئی تھی۔ اس علمی خزانہ میں قدیم تاریخی دستاویزات' پرانے سرکاری ریکارڈ' مختلف زبانوں کی مطبوعات' فارسی اور اردو کے دیوان اور مخطوطات' گزٹ آف انڈیا اور آرمی لسٹ کی ۱۸۶۰ء سے لے کر آج تک کی جلدیں' ملکہ وکٹوریہ کا ۱۸۵۸ء کا مشہور ومعروف اعلان اور دیگر نوادر محفوظ ہیں اور ان سے استفادہ کی تمام سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

کتابیں اسٹیل کی الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں جن کی صفائی بجلی کے ذریعہ سے

---

[۱] اس بدنظمی کی کیفیت پروفیسر نصیب اختر کے مضمون مندرجہ الزبیر کتب خانہ نمبر (ص ۱۶۸) میں بیان کی گئی ہے۔

کی جاتی ہے۔ مخطوطات وغیرہ کے بوسیدہ اوراق کی مرمت ایک خاص سائنٹیفک طریقہ سے ہوتی ہے جسے ورق سازی (LUMINATION) کہتے ہیں اس مرمت کے بعد کتابوں کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔

اس لائبریری میں مائکرو فلم کیمرے کے علاوہ اور کئی قسم کے آلے ہیں۔ ان میں ایک "ماؤگرافک آلہ" ہے جس سے مشکوک دستاویزات کی صحت معلوم کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔

یہاں آرکائوز سے متعلق ٹریننگ کورس بھی جاری ہے جس میں آرکائوز کے نظم ونسق اور اس کی حفاظت کے جدید طریقوں، انڈیکسنگ، کلنڈرنگ اور دیگر اہم امور کی تعلیم دیجاتی ہے۔

لنالتھگو لائبریری یہ ۱۹۰۵ء میں بمقام پوسا (بہار) قائم ہوئی اور ۱۹۳۶ء میں دہلی منتقل ہوگئی تھی۔ یہ ایک زراعتی لائبریری ہے جو ریسرچ اسکالرس کے لئے بڑی جاذبیت رکھتی ہے اس میں زراعت کے تمام شعبوں سے متعلق ۱۶۶۵ء سے لے کر آج تک کا لٹریچر موجود ہے۔ ہر سال کئی ہزار کتابوں اور پمفلٹ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ لائبریری کی طرف سے ببلیوگرافیز مرتب ہوکر شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے سائنسداں مستفید ہوتے ہیں۔ لائبریری کی اہمیت کے سلسلہ میں یہ بھی لائق ذکر ہے کہ جب ۱۹۲۷ء میں زراعتی رائل کمیشن ہندوستان آیا تھا تو اس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "یہ لائبریری بڑی آسانی سے اپنی قسم کی دنیا کی دیگر لائبریریوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔"

دہلی پبلک لائبریری یہ لائبریری یونیسکو اور ہند سرکار کی باہمی امداد سے ۱۹۵۱ء میں دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایسے مرکزی مقام پر قائم ہوئی تھی جہاں ہر طبقہ کے افراد بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں اس کی ابتداء صرف آٹھ ہزار کتابوں سے ہوئی لیکن ۱۹۵۲ء کی لائبریری رپورٹ کے مطابق ایک ہی سال کے اندر یہ تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی تھی یہاں اردو، ہندی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کی کتابیں

ہیں جن میں سال بہ سال کافی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لائبریری میں بچوں کے لئے ایک علیحدہ سیکشن ہے جس میں ان کے مطلب کی بہت سی کتابیں ایسی الماریوں میں قرینے سے سجی ہوئی ہیں جن کے قد بچوں کے قد کے مطابق رکھے گئے ہیں یہاں ایک وسیع ریڈنگ روم ہے جو تقریباً بارہ گھنٹہ کھلا رہتا ہے۔

لائبریری کا ممبر بننے کے لئے کوئی فیس نہیں لیجاتی۔ بطور ضمانت بھی کوئی رقم جمع نہیں کیجاتی اس کے باوجود مستعرین کی اکثریت کتابیں واپس کردیتی ہے اور کتابوں کی صورت بھی خراب نہیں کرتی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عوامی لائبریری نے عوام میں کتابیں استعمال کرنے کا شعور پیدا کردیا ہے۔

یہاں ایک "سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ" بھی ہے جس کے وسیع ہال میں مختلف موضوعات پر تقریریں ہوتی ہیں۔ موسیقی کی رنگین محفلیں سجائی جاتی ہیں لیکن ان تقریبات سے لائبریری استعمال کرنے میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

اس لائبریری کی حیثیت ایک سنٹرل پبلک لائبریری کی ہے جس کی شاخیں شہر کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں ایک گردش کرنیوالی (MOBILE LIBRARY) بھی ہے ایک خوبصورت بس میں چھوٹی چھوٹی الماریوں کے اندر کتابیں رکھی رہتی ہیں۔ یہ متحرک لائبریری مقررہ پروگرام کے مطابق دہلی کے نواحی علاقوں کا چکر لگاتی ہے اور لوگوں کے پاس ان کی پسندیدہ کتابیں پہنچا دیتی ہے پرانی کہاوت تو یہ ہے کہ پیاسا اپنی پیاس بجھانے کنوئیں کے پاس جاتا ہے مگر متحرک لائبریریاں کتابوں کے ایسے چشمے ہیں جو خود پیاسوں کے پاس جاکر ان کی پیاس بجھا دیتے ہیں۔

کلکتہ

ہند کے برطانوی عہد میں اس ملک کا پہلا دارالحکومت کلکتہ تھا اس کے بعد دہلی مقرر ہوا تھا لیکن اسے یاد رکھیے کہ اس عہد میں درس گاہوں اور کتب خانوں کے قیام کے پہلے منظم نقوش کلکتہ میں ہی اُبھرے تھے یہاں ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم

ہوا اور ۱۸۳۵ء میں وہ کتب خانہ کھلا جو آج ہندوستان کا قومی کتب خانہ ہے۔
اس کالج کے قیام کا اصل مقصد حکومت کے انگریز ملازمین کو اردو سے واقف کرانا
تھا جس نے اس وقت بڑی حد تک ایسی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی جو ملک کے
ہر حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی گو حکومت نے یہ اقدام ہندوستان پر اپنے تسلط کو
مضبوط بنانے کے لئے کیا تھا مگر یہ اردو کے حق میں دور رس نتائج کا حامل بن گیا
اس علمی مرکز سے مسلم اور ہندو اہل قلم نے کالج کی بیس سالہ زندگی میں پچاس کتابوں
کے جو ترجمے سادہ اور عام فہم اردو میں کئے وہ سادہ نثر نگاری کی بنیاد دے کر اس زبان
کو عوامی زبان بنانے میں بڑے معاون ہوئے اس طرح یہ کالج اردو زبان و ادب کی
ترقی کا ایک مرکز بن گیا اور کتب خانوں کی تشکیل و ترقی کے لئے بھی خوش گوار اور
توانا ماحول مل گیا۔

بھارت کی قومی لائبریری

اس لائبریری کی بنیاد اب سے ایک سو اکتالیس (۱۴۱) برس
پیشتر رکھی گئی تھی پھر اس کی اتنی ترقی ہوئی کہ آج کل تعداد کتب
کے لحاظ سے وہی ہند و پاک کی سب سے بڑی لائبریری ہے اس
کے قیام کی صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ ۳۱ اگست ۱۸۳۶ء کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں
کچھ سرکردہ اصحاب نے کلکتہ پبلک لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ۸ مارچ ۱۸۳۶
کو یہ ڈاکٹر گرانٹ کے مکان میں کھولی گئی جو تھوڑے عرصہ کے بعد مٹکاف ہال[1] میں منتقل کر دی

[1] یہ ہال ہندوستان کے عارضی گورنر جنرل سر چارلس مٹکاف (۱۸۳۵-۳۶ء) کی ان خدمات کی یاد میں
تعمیر کیا گیا تھا جو انھوں نے ہندوستانی اخبارات کو آزادی دینے میں انجام دی تھیں وہ انگریزوں کی اس
تعلیمی پالیسی کے خلاف تھے جس کا مقصد اہل ہند کے لئے ایک رسمی اور بے مقصد تعلیم جاری کرنا تھی اور
پالیسی کی حمایت کرنے والوں سے انھوں نے کہا "اگر ان کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان میں علمی ترقی ہماری حکومت
کے لئے پیام اجل ثابت ہوگی تو ان کے اس استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ اسکے نتائج جو بھی ہوں
لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کو علم کی دولت سے بہرہ اندوز کریں، ہندوستان کو سلطنت برطانیہ
کا ایک حصہ بنائے رکھنے کے لئے اگر یہ ضروری ہے کہ وہاں کے باشندوں کو جاہل رکھا جائے تو (باقی اگلے صفحے)

گئی۔ لارڈ کرزن کے عہد (۱۸۹۹ - ۱۹۰۵ء) میں اسے قومی لائبریری کی حیثیت دیدی گئی اور اس کا نام "امپریل لائبریری" رکھدیا گیا، ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ہی بھارت کی نیشنل لائبریری ہوگئی۔

لائبریری قائم ہوجانے کے بعد اس کا پہلا لائبریرین بنگال کا مشہور ناول نویس پیارے چندمترا مقرر ہوا تھا اس کے بعد جو لائبریرین ہوئے ان میں میکفارلین، خان بہادر اسداللہ خاں اور بی۔ ایس۔ کیسوں[1] خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہاں کے عملے کا ایک اہم رکن شولفیلڈ (A.F. SCHOLFIELD) اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے یہاں کے ذخائر کی کیٹلاگ سازی کے لئے جو قواعد وضوابط مرتب کئے تھے وہ اس فن کی تاریخ کا ایک اہم جزو سمجھے جاتے ہیں۔

خان[2] بہادر اسداللہ خاں ہندوستان میں پہلے مسلمان تھے جنہیں ملک کے سب سے بڑے کتب خانہ کا سربراہ بننے کا شرف ملا تھا یہاں انھوں نے لائبریری سائنس کی تعلیم بھی جاری کی تھی ان سے پہلے یہاں اس تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا یہاں کے تعلیم یافتہ آج کل ہندو پاک کے کتب خانوں میں کام کر رہے ہیں۔

لائبریری میں کتابوں کے اضافے کی رفتار خاصی تیز رہی اب اس میں نو لاکھ سے زیادہ کتابیں اور دستاویزات وغیرہ ہونگی۔ پاک و ہند کی کسی اور لائبریری میں ذخائر کی اتنی کثیر تعداد نہیں ملے گی ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد پانچ سال کے عرصہ میں کتابوں کا جو اضافہ ہوا ہے اس کی تعداد ڈیرھ لاکھ بتائی گئی ہے اس لائبریری کو تحفہ کے طور پر جو ذخائر ملتے رہے ان

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ہماری حکومت اس ملک کے لئے باعث لعنت ثابت ہوگی۔" (ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں) از محمد عتیق صدیقی۔ ص ۲۲۲۔

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کیسوں کی انگریزی کتاب "انڈین نیشنل لائبریری" [2] خان بہادر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین رہے اس کے بعد دہلی میں گورنمنٹ سکریٹریٹ لائبریری کے لائبریرین ہوگئے پھر امپیریل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین ہوئے وہ انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی رہے تھے ان کا انتقال ان کے وطن لاہور میں ہوا۔

میں مسٹر آستوش مکرجی کی اسّی ہزار کتابیں، ایک ڈاکٹر رامداس کی ساڑھے تین ہزار اور حیدر آباد ریذیڈنسی کی چار ہزار کتابوں کے گرانقدر تحفے بھی شامل ہیں۔

اس لائبریری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے استفادہ کی سہولتیں بڑے وسیع پیمانہ پر مہیا کی گئی ہیں اس علمی ذخیرے سے ہر سال تقریباً ۴۰ ہزار اشخاص مستفید ہوتے ہیں۔ یہاں کے ریڈنگ روم سارا سال صبح ۷ بجے سے رات کے دس بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کے لئے ایک مخصوص دارالمطالعہ ہے۔ ایک دارالمطالعہ شہر کے مرکزی حصہ میں اس لائبریری کی پرانی عمارت میں ہے اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ جب یہ لائبریری نئی عمارت میں منتقل ہو گئی تو وہاں جانے کے لئے ریاستی سرکار نے بسوں کے خاص انتظامات کر دیئے تھے۔

اس لائبریری کی مرکزیت اور افادیت کے یہ دو پہلو بھی دیکھ لیجئے ایک یہ کہ ہندوستان میں شائع ہونے والی ہر کتاب کا نسخہ خود بخود اس مرکزی لائبریری میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ مرکزیت "ڈلیوری آف ٹیکسٹ بکس، ۵۶ء" سے پیدا ہوئی ہے اس ایکٹ نے شائع شدہ کتاب کا ہر نسخہ یہاں جمع کرانا لازمی قرار دیدیا ہے۔

دوسرا افادی پہلو "انڈین نیشنل ببلیو گرافی" کی اشاعت ہے جو آئی۔ این۔ بی کہلاتی ہے یہ برٹش نیشنل ببلیوگرافی (بی۔ این۔ بی) کے طرز پر مرتب کیجاتی ہے۔ آئی۔ این۔ بی کے متعلق یہ یاد رکھیئے کہ اس میں ہر وہ کتاب مل جاتی ہے جو ہندوستان میں شائع ہوتی ہے اور اردو، فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت، تلگو اور تامل وغیرہ کی کتابیں رومن رسم الخط میں درج کیجاتی ہیں۔ یہ ببلیوگرافی کتابی شکل میں سال بہ سال شائع ہوتی رہتی ہے جن سے دنیا کی تمام لائبریریوں اور علمی حلقوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بھارت میں فلاں سال کتنے موضوعات پر اور کتنی زبانوں میں کتابیں شائع ہوئی ہیں یوں اس ببلیوگرافی کے ذریعہ بھارت کی "نیشنل لائبریری" کی افادیت کے اثرات ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔

حیدرآباد دکن

جس طرح ریاست حیدرآباد کا رقبہ ہند کی تمام ریاستوں سے بڑا تھا ایسا ہی علم و فضل کے میدان میں اس کی خدمات کا دائرہ بھی سب سے وسیع رہا یہ ریاست ۱۷۲۴ء میں اس وقت قائم ہوئی جب شہنشاہ عالمگیر کی ۱۷۰۷ء میں رحلت کے بعد مغلیہ سلطنت مائل بہ زوال ہوگئی اور صوبے مرکز سے قطع تعلق کرنے لگے تو دکن کے صوبہ دار نظام الملک آصف جاہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرکے سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد ڈال دی جس کے عالی وقار حکمراں بڑے کروفر کے ساتھ ۲۱۹ برس تک حکومت کرتے رہے ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اس آصفیہ دورِ حکومت میں علمی و تعلیمی ترقیوں کے لحاظ سے نظامِ دکن نواب میر عثمان علی خاں کا زمانہ عہدِ زریں تھا ان کی علم نوازی بیدار مغزی اور شاہانہ فیاضیوں نے نہ صرف حیدرآباد بلکہ بیرونِ ہند کی درس گاہوں کو اس شان سے نوازا کہ مسلم اور غیر مسلم کا اس معاملہ میں کوئی امتیاز نہ رکھا ان ہی کی شاہانہ کاوشوں سے حیدرآباد اردو کا گھر بن گیا۔ کلکتہ، علی گڑھ اور دہلی کے بعد یہ شہر اردو کا چوتھا اہم اور قابلِ قدر مرکز قرار پایا اسے یاد رکھیئے کہ عہدِ عثمان علی خاں میں علم، تعلیم اور کتابوں کی اشاعت نہایت وسیع پیمانہ پر ہوئی، درس گاہوں اور کتب خانوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ان ہی کے عہد میں ایک بے مثل درس گاہ "جامعہ عثمانیہ" ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی حکومتِ آصفیہ کا چراغ ان ہی کے سامنے گل ہوا، ۱۹۶۷ء میں وہ بھی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس کے بعد یہ محسوس ہوا کہ گویا ذیل کا شعر اسی آخری فرماں روائے دکن کے لئے کہا گیا تھا۔

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں ÷ بہت چراغ جلائے جائیں گے روشنی کے لئے

عثمانیہ یونیورسٹی یہ ہند و پاک کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا پہلا تجربہ ہوا اور کامیاب رہا یہ اس زمانہ کی بات ہے جب

ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ذہنوں پر انگریزی زبان و تہذیب کا اتنا تسلط تھا کہ وہ اپنے قومی اداروں میں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اردو اس عالی مقام کو حاصل کرنے کی صلاحیت و اہلیت ہی نہیں رکھتی ایسی فضا میں حیدرآباد کا اردو کو اپنی یونیورسٹی کی زبان بنانا اور اپنے اس انقلابی اقدام کو کامیاب کر کے دکھانا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو زبان و ادب اور تعلیم و تعلّم کی تاریخ میں ہمیشہ ثبت رہیگا۔ اس کارنامے نے اردو کی صلاحیتیں روشن کر کے نہ صرف اردو دنیا کو متحیر کر دیا بلکہ ماہرینِ تعلیمات کی آنکھیں بھی خیرہ کر دیں خیال رہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی صرف اشاعتِ علم کا مرکز نہ رہی بلکہ کتابوں کی اشاعت بھی یہاں سے ہوتی رہی اس سے ایک دار الترجمہ منسلک رہا جس نے مختلف علوم و فنون کی بڑی بڑی اہم اور مستند کتابیں اردو میں منتقل کر کے لائبریریوں میں ایسی کتابوں کا اضافہ کر دیا جن سے وہ اسوقت تک خالی تھیں۔

اس یونیورسٹی کی اہمیت کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

> "یہ پہلا وقت ہے کہ اردو زبان کو یہ رتبہ ملا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار پائی ہے۔ احیائے علوم کے لئے جو کام اگسٹس نے رومہ میں، خلافتِ عباسیہ میں ہارون الرشید اور مامون الرشید نے، ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث نے، بکرماجیت و اکبر نے ہندوستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹرِ اعظم و کیتھرائن نے روس میں اور مُت شی ہو، نے جاپان میں کیا وہی فرماں روائے آصفیہ نے اس ملک کے لئے کیا اعلیحضرت واقدس کا یہ کارنامہ ہندوستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا جائیگا۔"

کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی

اس عظیم الشان کتب خانہ میں کتابوں کی مجموعی تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ ہوگی یہ ذخیرہ پندرہ زبانوں کی کتابوں پر مشتمل ہے بالخصوص اردو زبان و ادب کی بڑی اعلیٰ کتابیں اس میں ہیں۔ یہاں

انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، روسی، اور چینی زبانوں کی کتابیں ۔ فارسی، عربی، اردو، ترکی، سنسکرت، ہندی، مرہٹی، تلگو، کنڑی اور تامل کے مطبوعات و مخطوطات ورتاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے نوشتے بھی موجود ہیں یونیورسٹی دارالترجمہ کے تمام تراجم یہاں محفوظ ہیں جو آج کل نادر و نایاب کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ دکن کی بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی اور دیگر سلطنتوں کی تواریخ کا نہایت اعلیٰ اور مستند سرمایہ یہاں ہے ۔ جو ریسرچ اسکالرس کے بہت کام آسکتا ہے کتب خانہ میں اضافے عطیات کی شکل میں بھی ہوتے رہتے ہیں ۔ نواب سرورالملک، نواب سر سالار جنگ اور سر اکبر حیدری کے قیمتی عطیات نے اس کتب خانہ کی اہمیت اور بڑھادی ہے ۔

کتب خانہ آصفیہ یہ بھی سلطنت آصفیہ کے علمی کارناموں کی ایک لافانی یادگار ہے جس کی ابتدا ۱۸۹۱ء میں ہوئی اس کی تعمیر و ترقی میں نواب عمادالملک (سید حسین بلگرامی) نے نمایاں حصہ لیا تھا پھر اس میں اضافے ہوتے رہے کتابوں وغیرہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچی اور یہ حکومت آصفیہ کا قومی کتب خانہ قرار دیدیا گیا ۔ عہد عثمان علی خاں میں اسے بڑا عروج ملا ۔ مخطوطات اور مطبوعات کے ذخیروں میں نہایت قابل قدر اضافے ہوئے عوام کے لئے استفادہ کی سہولتیں بھی بڑھیں ۔ لائبریری ذخائر کی فہرستیں شائع ہوجانے کے بعد اس کی افادیت کا دائرہ ریسرچ اسکالرس کیلئے اور وسیع ہوگیا ۔ اس میں وقتاً فوقتاً کتابوں کے اچھے اچھے ذخیروں کے عطیات شامل ہوئے مثلاً نواب عمادالملک اور مولوی چراغ علی وغیرہ کے اعلیٰ ذخائر بعض اصحاب کے ذخیرۂ کتب اس کے لئے خریدے بھی گئے اس طرح یہاں بہترین مخطوطات و نوادرات جمع ہوگئے ۔ جب سقوط حیدرآباد کے بعد اس کا علاقہ صوبہ آندھرا بنایا گیا تو اس کتب خانہ کا نام ' اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ' ہوگیا ۔ آج کل بھی یہ اپنے قیمتی ذخائر اور اپنی عالیشان عمارت کے لحاظ سے پاک و ہند کی عظیم لائبریریوں میں شمار ہوتی ہے ۔

سالار جنگ میوزیم یہ بے نظیر میوزیم تاریخی نوادرات، نایاب مخطوطات، آرٹ، مصوری، مجسمہ سازی، نقاشی، خطاطی اور خوش نویسی کے لاجواب نمونوں

کا ایسا بے بہا مخزن و معدن ہے جس پر سرزمین ہند بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اس کا ایک بہت بڑا خصوصی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ صرف ایک شخصیت کا وہ کارنامہ ہے جو دنیا کے عظیم ترین کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے یہ اپنے بانی نواب یوسف علی خاں (۱۸۹۰ء۔ ۱۹۴۹ء) سر سالار جنگ سوم کی ایک بے نظیر یادگار ہے ان کا محبوب ترین مشغلہ طرح طرح کے تاریخی نوادرات کی تلاش و جستجو اور ان کا حصول رہا۔ راقم الحروف نے اس میوزیم کی ۱۹۵۸ء میں ایک جھلک دیکھی تھی اس زمانہ میں یہ سر سالار جنگ کے وسیع و عریض آبائی محل میں تھا حیدر آباد کے مختصر قیام میں مجھے میوزیم کے بے شمار ذخائر پر ایک نظر ڈالنے کا ہی موقع مل سکا تھا۔ اب اس کے لئے اسی ایکڑ کے رقبہ پر ایک نہایت رفیع الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے جس کی لاگت ایک کروڑ روپیہ بتائی گئی ہے۔ نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۹۶۱ء میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے رکھا تھا اس سے چند سال پہلے میوزیم کو افادۂ عام کی خاطر کھولنے کی رسم بھی پنڈت جی نے ہی ادا کی تھی بھارت سرکار نے اسے "نیشنل میوزیم" کا مرتبہ دیدیا ہے۔

نوادرات کے اس خزانے میں کتابوں کے بھی نہایت قیمتی ذخیرے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی وغیرہ کے نادر مخطوطات کی تعداد ۹۶۵۰ بتائی گئی ہے قرآن مجید کے بھی تین سو اڑسٹھ ۳۶۸ مخطوطے ہیں جو خوش خطی کے لحاظ سے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔

میوزیم کے تمام ذخیروں کی خصوصیات کا یہاں احاطہ نہیں کیا جا سکا لہذا صرف ایک ذخیرہ کی کیفیت سن لیجئے۔ ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں۔[۱]

"مخطوطات کے عظیم ذخیرے سے قطع نظر دوسری نادر اشیاء بھی بے شمار ہیں جن میں ہاتھی دانت کی وہ چار کرسیاں بھی ہیں جو فرانس کے لوئی پانزدھم نے ٹیپو سلطان کو تحفتاً بھیجی تھیں سلطان ٹیپو کی تلوار اور عمامہ، لوئی چہاردہم اور نپولین کا مکمل فرنیچر سیٹ، مشہور مصور ٹی سڈنی، کوپر کی مصوری کا ایک مشہور نمونہ کیٹلزان ری پوز، گوئٹے کے فاؤسٹ

---

[۱] ملاحظہ ہو الزبیر، کتب خانہ نمبر ص ۱۲۱۔

کے دو کرداروں پر مبنی منقش لکڑی کا ایک دل آویز نمونہ اور بیرونی کا سنگِ مرمر کا شہرۂ آفاق مجسمہ ہے۔"

یہ گرانقدر اور بے مثل ذخائر اپنے بانی کے اس اعلیٰ ذوق کی آئینہ داری کر رہے ہیں جس کی تکمیل کے لئے سر سالار جنگ نے اپنی توانائیاں اور کوئی پچاس کروڑ روپے نہایت فیاضی کے ساتھ صرف کر دیئے اور اس طرح وہ اپنی علم نوازی کی ایک نادر یادگار چھوڑ گئے، بقول میر تقی میر ؎

"ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو"

ذاتی کتب خانے جہاں تک ذاتی کتب خانوں کا تعلق ہے حیدرآباد کی علمی فضا میں ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ مگر ان سب کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں لہٰذا تین ایسے کتب خانوں کے حالات[1] پر ایک نظر ڈالی جا رہی ہے جن کو خاص امتیاز حاصل تھا ان کے علم دوست مالک بھی ریاست کے اعلیٰ عہدہ داروں میں نہایت ممتاز تھے وہ کتابوں سے جو بے پناہ شغف رکھتے تھے اس کا اندازہ ناظرین کو اگلی سطور پڑھنے کے بعد ہو جائے گا۔

"کتب خانہ نواب عماد الملک" نہایت بیش قیمت کتابوں پر مشتمل تھا نواب صاحب کتابوں کے بے حد شوقین اور قدردان تھے کتابیں بڑی فراخدلی کے ساتھ خریدتے اور ان کی منہ مانگی قیمت دیتے تھے۔ ان کی فیاضی کا شہرہ سن کر کتب فروش اور دیگر اصحاب اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے اسطرح نایاب اور نادر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے کتب خانے میں جمع ہو گیا تھا۔

نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی، متوفی ۱۹۲۵ء) عربی اور فارسی

---

[1] ان حالات کے کچھ حصے مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" سے لئے گئے ہیں۔ اس کتاب سے خاص طور پر استفادہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں نواب عماد الملک، سید علی بلگرامی مولوی چراغ علی کی علمی سرگرمیوں اور کتابوں سے ان کی دلچسپیوں کے وہ حالات درج ہیں جو مولوی صاحب نے بچشم خود دیکھے ہیں۔

کے زبردست عالم تھے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی خوب جانتے تھے انھوں نے حیدر
کی علمی زندگی کو فروغ دینے اور یہاں کتب خانوں کے قیام میں بڑا اہم کردار ادا کیا
آصفیہ لائبریری کی تشکیل و ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ بقول مولوی عبدالحق " ان کے
کاموں کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی
کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف اس کتب خانے کے لئے مطبوعہ کتب
کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس براعظم کے بہتر
کتب خانوں میں ہوگیا "۔ دائرۃ المعارف کا قیام ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں ہوا تھا
ادارہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے عربی کی بہت سی ایسی نادر کتابیں شائع کی ہیں جن
قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے
ان کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلادِ یورپ میں ہوئی۔

حیدرآباد میں نواب صاحب کی قدر و منزلت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ
نظامِ دکن نواب میر عثمان علی خاں کے استاد رہ چکے تھے لیکن وہ اپنے علم و فضل اور
بلند پایہ علمی اور تعلیمی خدمات کے باعث بھی بڑی عزت و احترام کے مستحق ہیں۔

" کتب خانہ سید علی بلگرامی " نواب عماد الملک کے چھوٹے بھائی مولوی سید
بلگرامی (۱۸۵۱ - ۱۹۱۱ء) کے کتب خانہ میں متعدد علوم کی تقریباً دس ہزار کتابیں تھ
انھوں نے اپنے کتب خانہ کے لئے وہ تمام مطبوعات بھی یورپ سے منگوالی تھیں جو اس
زمانہ میں اسلامی علوم و فنون پر وہاں شائع ہوئی تھیں۔ لکھا ہے کہ " مولوی صاحب
صرف ان کتابوں ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یورپ کے مختلف زبانوں کے
رسالے بھی جمع کئے جن میں اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شائع ہوئے
اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان
کسی دوسری جگہ ایسا بیش بہا مجموعہ موجود نہیں "۔

حیدرآباد کی علمی ترقیوں میں مولوی صاحب کا بھی بڑا ہاتھ رہا انھوں نے ا
سررشتہ علوم و فنون قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ

تالیف وترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے یہ ادارہ جاری نہ رہ سکا مگر ان کی علمی
گرمیاں زندگی کے آخر وقت تک جاری رہیں۔ مولوی صاحب بڑے عالم فاضل، کئی
بانوں کے ماہر اور کتابوں کے اتنے شوقین تھے کہ بقول مولوی عبدالحق وہ ہمیشہ عمدہ اور
در الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔

مولوی صاحب عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی،
مراقی، انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی بہت اچھی طرح جانتے تھے ان کی سنسکرت دانی کے
سلسلہ میں لکھا ہے کہ ان کا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے وید پڑھتے
یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہے۔

مولوی صاحب نے ایک بڑا اہم کام یہ انجام دیا کہ تراجم کے ذریعہ اردو کا دائرہ
ڑھا کر کتب خانوں کے ذخائر میں قابل قدر اضافہ کر دیا۔ انھوں نے ایک فرانسیسی مورخ
سیبولیبان کی عرب اور ہندی تہذیب پر تاریخی تصانیف کا اردو ترجمہ "تمدن عرب اور
رن ہند" کے نام سے اتنے سلیس اور خوبصورت انداز میں کیا ہے کہ ان تراجم میں تصانیف کی
ی شان پیدا ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب کی ایک مختصر مگر بڑی تحقیقی تالیف "کلیلہ دمنہ"
ے متعلق ہے جس میں بقول مولوی عبدالحق "یہ پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں یہ کتاب
بان کی ہے پھر کہاں گئی اور کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیرات عمل میں
ے اسے مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں
پڑھا تھا ان کی رائے میں اگر مسلمانوں کے تمام آثار اور ان کے کارنامے دنیا سے نابود ہو جا
ں اور دو کی دو کتابیں "کلیلہ دمنہ" اور "الف لیلہ" باقی رہ جائیں تو ان کے کارہائے نمایاں
لئے کافی ہیں ان کا ارادہ تھا کہ کلیلہ دمنہ کی طرح ایک رسالہ الف لیلہ پر بھی لکھیں اور
ن کیلئے دو الماری بھر کتابیں جمع کی تھیں"۔

مولوی صاحب ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد سے انگلینڈ چلے گئے تھے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی
مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں وہ انڈیا آفس میں عربی فارسی کے قلمی
ں کی فہرست مرتب کرنے پر بھی مامور ہوئے تھے ان نسخوں کے سلسلہ میں لکھا ہے

کہ ان کی تعداد تقریباً چھ ہزار تھی یہ انڈیا آفس (لندن) کے جس حصہ میں رکھے ہوئے تھے
دہلی مینوسکرپٹ (مخطوطات دہلی) کے نام سے مشہور رہا یہ دہلی کا شاہی کتب خ
جو لنڈن بھیجدیا گیا تھا۔

"کتب خانہ مولوی چراغ علی"، قابل دید کہا جاتا ہے بقول مولوی عبدالحق
میں بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع تھیں اور ان میں بہت کم ایسی تھیں جو مولوی ص
کی نظر سے نہ گذری ہوں وہ تصنیف وتالیف اور کتب بینی سے غیر معمولی دلچسپی ر
تھے اس سلسلہ میں کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام سے
کتابیں تلاش کر کے بہم پہنچاتے تھے۔

حیدرآباد میں شائقین کتب کے درمیان مولوی چراغ علی (اعظم یار جنگ)
عجب شان رکھتا تھا ان کے مذاق کتب بینی نے بڑا والہانہ انداز اختیار کر لیا تھ
ذوق کی فراوانی اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب ان کے
رہتی حتیٰ کہ بیت الخلاء میں بھی کتابیں پڑھتے رہتے۔ دوران مطالعہ ان پر ایسی
محویت طاری ہوتی کہ گرد و پیش کے حالات کی انہیں خبر نہ رہتی ایک بار یہ ہوا کہ
وہ کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے وہیں قریب میں آگ لگ گئی، شعلے بھڑکے، دھو
لوگ خوب چیخے چلائے مگر انھیں کچھ خبر نہ ہوئی محویت طاری رہی اور وہ بدستور م
میں منہمک رہنے اس غیر معمولی انہماک اور توجہ سے مطالعہ کرنیکا اثر یہ ہوا کہ مولوی ص
علم وفضل میں یکتائے روزگار ہو گئے اور انہیں متعدد زبانوں پر بڑا عبور حاصل ہو گ

مولوی چراغ علی سرسید کے مذہبی نظریات اور علی گڑھ تحریک کے بڑ
اور علمبردار تھے انھوں نے مذہبی مسائل پر اردو اور انگریزی میں بہت کچھ لک
ان میں "تعلیقات" اور "اسلام کی دینی برکتیں" قابل ذکر ہیں اول الذکر ایک پا
کی کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں لکھی گئی تھی انھوں نے انگریزی کی دو
کے ترجمے اردو میں "تحقیق جہاد" اور "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے نا
کئے ہیں۔ ان کے مضامین کا ترجمہ "رسائل چراغ علی" کے نام سے شائع ہوا

موجِ کوثر کے مصنف کا بیان ہے کہ "رسائل چراغ علی" کی پہلی جلد کے آخر میں جو فہرست ماخذ شائع ہوئی ہے اس میں قریبًا ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) کتابوں کے نام درج ہیں جن سے مولوی صاحب نے اپنے مضامین اخذ کئے ہیں اور جن میں بیشتر عربی ہیں" مختصر یہ کہ مولوی صاحب اسلامیات اور دیگر موضوعات پر اپنی کتابوں اور اپنے مضامین کے اعلیٰ ذخائر چھوڑ کر ۱۸۹۵ء میں انتقال کر گئے۔

ان تین عالی مرتبت بزرگوں کے علاوہ حیدرآباد میں بہت سے اصحاب علم و فن حکومتِ آصفیہ کے زیر سایہ ۲۱۷ برس تک قدر و منزلت کی پرسکون فضا میں علمی و تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے یہاں اس دور میں سینکڑوں درس گاہیں، عوامی ذاتی اور درس گاہی کتب خانے قائم ہوتے۔ جن میں کے بہت سے سن سینتالیس کے انقلاب میں تباہ و برباد ہوگئے یہ عظیم ریاست بھی دنیا کے نقشے پر نہ رہی لیکن اس کی تین لاثانی اور لافانی یادگاریں (کتب خانہ آصفیہ سالار جنگ میوزیم اور عثمانیہ یونیورسٹی) مرحوم ریاست کی یادیں زندہ و پائندہ رکھیں گی۔

ٹونک

ٹونک کی چھوٹی سی ریاست کے فرماں رواؤں کے دل بڑے اور حوصلے بلند تھے وہ علم دوستی کے ساتھ حب الوطنی کے جذبات سے بھی سرشار رہتے تھے اور یہ امر خاص طور پر لائق ذکر ہے کہ علم پروری اور کتابوں سے شغف رکھنے کے معاملے میں یہ ریاست ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے پیچھے نہیں رہی یہاں کتابیں جمع کرنے کے ذوق نے ایسا فروغ پایا کہ ریاست کے دوسرے فرماں روا وزیرالدولہ نواب محمد وزیر خاں (متوفی ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) نے ایک مضبوط منصوبہ کے تحت اتنا اعلیٰ کتب خانہ قائم کر لیا تھا جو آج تک ارباب علم سے خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔

کتب خانہ وزیرالدولہ۔ اس عظیم کتب خانہ کی نسبت مولوی سید منظور الحسن برکاتی تحریر[۱] کرتے ہیں

[۱] یہ تحریر رسالہ معارف (اعظم گڑھ) ج ۸۴۔ ص ۱۲۰ سے لی گئی ہے۔

"اس کتب خانہ کو جب وہ قلعہ معلی کی ایک شاندار عمارت میں سجا ہوا تھا میں نے بھی دیکھا تھا۔ کتابیں فن دار الماریوں میں بڑے سلیقے سے چنی ہوئی تھیں کتابوں کی کئی فہرستیں تھیں۔ ان میں کتاب کے نام اور فن کے ساتھ صاحب تصنیف کا بھی مختصر حال درج تھا۔ کتابوں پر خوبصورت اور پھول دار کپڑے کی چولیاں چڑھی ہوئی تھیں جو مختلف رنگوں کی تھیں۔ ہر فن کے لئے ایک قسم کی چھینٹ، یا جامہ وار مخصوص تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خوشنما گلزار ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ الماریوں پر رنگین اور خوبصورت پردے آویزاں تھے اور بیٹھوں پر جو پوشش تھی وہ بھی دیدہ زیب اور خوشنما چھینٹ کی تھی۔ کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے سے قبل ہی ان کے ظاہری حسن سے جو خوشگوار اثر قلب و نظر پر پڑا اس سے ایک خاص سرور حاصل ہوا بہت دیر تک تو مجھے اس دل فریب نظارہ ہی سے فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد جب کتابوں کا مطالعہ کیا تو ہر فن میں بیسیوں نوادر نظر آئے۔ اور کئی گھنٹے اس علمی گلزار میں گذارے جس سے روح و دماغ کو تازگی و بالیدگی حاصل ہوئی"۔

بیت الحکمت ٹونک کے ممتاز علماء اور حکماء میں حکیم سید برکات احمد ٹونکی کا نام سرفہرست آتا ہے انھوں نے یہاں ۱۹۱۸ء میں ایک علمی ادارہ "بیت الحکمت" قائم کیا تھا جس نے ان کی کتاب "اتقان الفرقان فی ماہیۃ الزمان" شائع کی تھی۔ اب حکیم صاحب کے پوتے حکیم سید محمود احمد برکاتی نے ان کے نام پر ایک علمی ادارہ "برکات اکیڈمی" کراچی میں قائم کیا ہے اور اپنا کتب خانہ اس کے لئے وقف کر دیا ہے۔

حکیم سید برکات احمد مرحوم و مغفور بڑے جید عالم اور حاذق طبیب تھے انھوں نے ٹونک میں طبابت اور درس و تدریس کی اعلیٰ مسندیں بچھا دی تھیں ان میدانوں میں ان کی اہم خدمات کے نقوش کتابوں میں محفوظ ہیں۔ لاہور کے رفیق الاطباء کی شائع کردہ کتاب "رموز الاطباء" میں ہے کہ "انکے درس سے سینکڑوں عالم اور حکیم بن کر نکلے اور انھوں نے بہت سے معرکے کے علاج کئے"۔

سینکڑوں کتب خانے ٹونک کے کتب خانوں کی کیفیت وہیں کے ایک اہل قلم حکیم محمود احمد برکاتی سے سنئے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ٹونک چونکہ علم کا مرکز تھا، علماء کا مرکز تھا، طلباء کا مرکز تھا اس لئے کتابوں کا بھی مرکز تھا کتابوں کا نہیں کتب خانوں کا مرکز تھا چھوٹے بڑے کتب خانے ایک دو نہیں، دس، بیس نہیں سینکڑوں تھے ہر مدرسہ میں ایک کتب خانہ، ہر عالم کے یہاں ایک کتب خانہ، ہر رئیس کے یہاں ایک کتب خانہ اور ان میں سے دس بیس کتب خانے تو وہ تھے جنکی شہرت اپنے نوادر کی کثرت کے باعث اسلامی ممالک اور یورپ تک پہنچ چکی تھی"

لائبریریوں کی کثرت کی وجہ سے جلد سازی کی بھی خوب ترقی ہوئی اور ٹونک میں ایسے ماہر جلد ساز پیدا ہو گئے جو پائدار اور خوشنما جلدیں باندھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور پرانی کتابوں کی بوسیدہ جلدیں اس خوبی سے باندھتے ہیں کہ ان کی صورت نئی کتابوں جیسی ہو جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان فنون کی قدر افزائیاں نوابانِ ٹونک کے دم سے تھیں جو ۱۳۰ سال تک حکمرانی کرتے رہے ان کی ریاست ۱۹۴۸ء میں بھارت کے راجستان کا ایک ضلع بن گئی۔

پٹنہ

بہار میں علمی ترقیوں اور وہاں کے بعض قدیم کتب خانوں اور خانقاہوں کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے اور اب اس کے ایک عظیم ترین کتب خانہ خدا بخش لائبریری کی مختصر کیفیت پیش کی جا رہی ہے۔ یہ ہی وہ کتب خانہ ہے جس کی بدولت بقول مولوی صلاح الدین (فرزند مولوی خدا بخش) "پٹنہ کو اسلامی علوم کے طلباء اور دیگر فضلاء کی زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہے"

خدا بخش لائبریری

اس لائبریری کی بنیاد ان چودہ سو قلمی کتابوں سے پڑی تھی جو مولوی خدا بخش کے علم دوست باپ محمد بخش نے ۱۸۷۶ء میں بستر مرگ پر اپنے بیٹے کے حوالے کی تھیں پھر مولوی صاحب اس میں برابر اضافے کرتے رہے ۱۸۹۱ء میں کتابوں کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی گویا پندرہ برس میں دو ہزار چھ سو

کتابوں کا اضافہ ہوا اس کے بعد یہ تعداد پانچ ہزار ہوگئی۔ اس طرح یہاں ایسے نا
و بیش قیمت مخطوطات و مطبوعات جمع ہو گئے جنہیں دیکھکر "ایسٹرن[1] لائبریری" کے
مصنف نے تحریر کیا ہے کہ "یہ دنیا میں اسلامی ادبیات کے بے بہا خزانوں میں ایک نفیس
ترین خزانہ ہے"۔

علم کے اس نفیس خزانہ کو محفوظ رکھنے کے لئے عمارت بھی نہایت اعلیٰ اور خوبصورت
تعمیر کیگئی ہے اس دو منزلہ عمارت کے بیشتر کمروں کا فرش سنگِ مرمر کا ہے اس کی تعمیر
صرفہ اسی ہزار روپیہ بتایا گیا ہے جو آج کل کے ایک کروڑ سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔

اس لائبریری کی تعمیر و ترقی میں مولوی خدابخش نے ایسی بے نفسی اور بے غرضی
دکھائی کہ نہ اُسے اپنی ذاتی ملکیت میں رکھا اور نہ اپنے نام سے موسوم کیا بلکہ اسے عوام
لئے وقف کر دیا اور اس کا نام "پٹنہ اورنٹیل پبلک لائبریری" رکھدیا لیکن اس
"خدابخش لائبریری" کے نام سے شہرت پائی۔ مولوی صاحب نے ایک بڑا ایثار یہ کیا کہ اپنا
سارا سرمایہ کتابیں فراہم کرنے اور اس کے لئے عمارت تعمیر کرنے میں صرف کر دیا اور جب ۰۸
میں وہ مرے تو ایک غریب آدمی کی طرح اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

مولوی خدابخش مرحوم (۱۸۴۲ - ۱۹۰۸ء) اتنے بڑے قانون داں تھے کہ پٹنہ کے
لائق وکلاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ حیدرآباد دکن کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس
چار سال تک رہے جہاں تک ان کی مذہبی زندگی کا تعلق ہے وہ نہایت دیندار آدمی
تھے کتب خانہ کے قیام میں ان کے پیش نظر اسلامی تعلیمات بھی رہیں جن کی رو سے علم کی
اشاعت ایک فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور چونکہ اس اشاعت کا بہترین ذریعہ
کتابیں ہیں اس لئے انھوں نے عوام کے استفادہ کے لئے کتابیں جمع کر دینا ایک دینی سعادت
بھی سمجھا ان پاکیزہ تصورات کا یہ اثر ہوا کہ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت

[1] اس انگریزی کتاب کے مصنف وی۔ سی۔ اسکاٹ اوکنر ہیں اس کا اردو ترجمہ
سید مبارزالدین رفعت نے "ایک مشرقی کتب خانہ" کے نام سے کیا جو انجمن ترقی اردو
ہند نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کتب خانے میں تشریف لائے ہیں یہ دیکھتے ہی وہ کتب خانہ کی طرف دوڑے اس وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا چکے تھے مگر وہاں دو کتابیں کھلی ہوئی رکھی تھیں جنہیں حضور ملاحظہ فرما رہے تھے۔

مولوی صاحب کے کتابیں جمع کرنے کے طریقے بھی بڑے دلچسپ اور نہایت عجیب و غریب رہے اس کام میں انھوں نے قانونی اور اخلاقی ضابطوں کو مزاحم نہیں ہونے دیا وہ کہا کرتے تھے کہ "نادر چیزیں جمع کرنے کا فن ہر چیز سے مستثنیٰ اور فوجداری قانون سے بالا ہے" چنانچہ جہاں کہیں کسی نایاب کتاب پر ان کی نظر پڑتی وہ اسے جائز و ناجائز طریقہ سے حاصل کئے بغیر دم نہ لیتے۔ مثلاً ایک نایاب قلمی کتاب جب وہ قیمت ادا کرنے کے بعد بھی حاصل نہ کر سکے تو اسے مطالعہ کے لئے مانگ لیا پھر یہ کیا کہ اصل کتاب کو اس کی جلد سے جدا کر کے ایک اور کتاب کی ویسی ہی جلد بندھوا کر اُسے واپس کر دیا اور اصل کتاب اپنے کتب خانہ میں داخل کر دی۔

اس طرح کتابیں حاصل کرنے کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک یہ کہ مولوی خدا بخش کتابوں کا کتب خانوں میں رہنا گھروں میں بند رہنے سے ہزار درجہ بہتر خیال کرتے تھے دوسرے وہ ایک سچے عاشق کی طرح اپنے کتب خانہ کی محبت میں ایسے سرشار رکھتے کہ اس کے لئے کتابیں فراہم کرنے میں روا اور ناروا کا فرق قائم رکھنا آئینِ محبت کے خلاف سمجھتے تھے اسی جذبہ کے تحت وہ کتابیں حاصل کرنے کے لئے ہر جتن کرتے، ہر دکھ سہتے اور ہر قانون و قاعدے سے بے نیاز رہتے اس سلسلہ کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ایک بار برٹش میوزیم (لندن) نے ان کا کتب خانہ خریدنے کے لئے ایک بھاری رقم کی پیشکش کی تھی مگر انھوں نے اسے قبول نہ کیا اور یہ فرمایا[1]

"میں غریب آدمی ہوں لیکن کیا میں صرف پیسے کے لئے اس چیز سے دست بردار ہو جاؤں جس کے پیچھے میں نے اور میرے والد نے اپنی زندگیاں صرف کر دی ہیں جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو اس وقت ان کا نمایاں خدوخال والا

---

[1] ایک مشرقی کتب خانہ ص ۱۰ - ۱۱ -

چہرہ ایک اندرونی خوشی سے تمتما رہا تھا اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو کھیل رہے تھے"۔

انھوں نے پھر کہا "نہیں۔ یہ میرا کتب خانہ پٹنہ کے لئے ہے یہ تحفہ پٹنہ کے عوام کے لئے ہے اور انھیں کی خدمت میں پیش کیا جائیگا"۔

چنانچہ ۱۸۹۱ء میں یہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا یعنی عوام کے لئے کھول دیا گیا وہ زمانہ مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی کا زمانہ تھا اس وقت ہندوستان میں درس گاہوں اور کتب خانوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو کتب خانے تھے ان کے استعمال پر بڑی پابندیاں عائد تھیں۔ جدید تعلیم کے سلسلہ میں بھی مسلمان ہندوستان کی غیر مسلم اقوام سے بہت پیچھے تھے۔ سرسید کی درس گاہ کو قائم ہوئے تقریباً سترہ برس گذر چکے تھے مگر وہاں تعلیم حاصل کرنے کے مسئلہ پر مسلمانوں میں ہم خیالی و یکجہتی نہ تھی ایک جماعت انگریزی تعلیم حاصل کرنا جائز اور دوسری ناجائز سمجھتی تھی ایسے نامساعد زمانہ میں خدابخش لائبریری کا قیام بڑا سودمند ثابت ہوا ایک طرف تو مسلمانوں کی علم اور کتابوں سے بے لوث محبت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا اور دوسری طرف علم و ادب کا میدان ایسی لاجواب اور بے نظیر کتابوں سے معمور ہو گیا جن کی زیارت کے نہ صرف ارباب علم بلکہ اصحاب اقتدار بھی مشتاق رہتے تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ کرزن بھی دلکش کتابوں کے اس مخزن کو دیکھنے کے لئے پٹنہ آئے تھے وہ ان سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ کتابوں کی مفصل فہرست بنوانے اور ایک دارالمطالعہ تعمیر کرانے کا حکم دیگئے تھے۔

فہرستیں لائبریری کی افادیت اس کی مطبوعہ فہرستوں کی وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے یہاں کے ذخائر کی بھی مفصل کٹلاگ سازی کیجاتی ہے کٹلاگ کی بائیس ضخیم جلدوں کے شائع ہو جانے کا ذکر "ایک مشرقی کتب خانہ" میں آیا ہے اس کتاب میں بھی اسکاٹ اوکنر نے بعض کتابوں کا تعارف ایسے دل نشین اور لطیف انداز میں کرایا ہے کہ اُسے پڑھ کر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بچشم خود ان کتابوں کو دیکھ رہا ہے۔ اسکاٹ ان نوادر کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ دیکھئے یہ دمشق یا ازہر کے کسی غریب عالم کی لکھی ہوئی کتاب کا دنیا میں ایک ہی نسخہ ہے۔ یہ دیکھئے یہ کتاب کسی شہنشاہ یا کسی بادشاہ کو تحفہ میں پیش کی گئی ہے۔ یہ دیکھئے یہ کتاب مال غنیمت کا ایک حصہ ہے جو کسی فاتح کے ہاتھ لگا ہے۔ یہ دیکھئے یہ ایک اجڑے دربار کا آخری خزانہ۔ چرایا گیا، چھپا کر رکھا گیا ہاتھوں ہاتھ ایک دوسرے تک پہنچایا گیا، پانی میں بھیگا، دیمک نے چاٹا اور کیڑوں نے اس سے اپنا پیٹ بھرا، پھر کسی بھوکے خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے بیچا گیا۔"

"یہاں تاریخ خاندان تیموریہ کا ایک نہایت نادر انتہائی مُطلّا اور نفیس نسخہ بھی ہے، مصوری اور صناعی کے لحاظ سے یہ کتاب آرٹ کا ایک بے بہا خزانہ ہے اس کے کم سے کم (۱۳۳) ورق مصور ہیں ان تصویروں میں سے چاہے کوئی تصویر لے لیجئے ہر ایک میں بس واقعات ہی واقعات دکھائے گئے ہیں۔ جملہ تصویروں میں سے اناسی تصویریں تیمور کی زندگی سے متعلق ہیں یہ اُس تیمور کی تصویریں ہیں جو فتنۂ عالم تھا آخر میں ان (۱۳۳) رنگین صفحوں سے جو کتاب کی جان ہے ایک اور تصویر پیش کی جاتی ہے یہ اکبر کی جوانی کی تصویر ہے اور اس تصویر میں چتوڑ کے قلعہ کے محاصرہ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ایسے مناظر ہمیں زندگی کے اُس قلب تک پہنچا دیتے ہیں جو اب براعظم ہند سے مٹ چکی ہے اب چتوڑ کا قلعہ اپنی پچھلی شان و شوکت کے مناظر کے درمیان فکرمند اور اُداس کھڑا ہے اور مغلوں کا نام بھی اب کسی زمانہ کی کڑک کی مدھم سی بازگشت کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔"

اسے کتب خانہ کی خوش بختی کہئے یا مولوی خدابخش کے حسنِ عمل کا اثر کہ انقلاب سن سینتالیس کے سلسلہ میں پٹنہ بھی فرقہ وارانہ فسادات کا بڑا سخت شکار رہا لیکن بفضلہٖ اس کتب خانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کا نظم و نسق اب بھارتی حکومت

چلا رہی ہے اور یہ اہل علم کے لئے بڑے اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ اس نظام میں بھی خدا بخش لائبریری کی افادیت بدستور برقرار ہے۔

رام پور

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد جب دہلی اور لکھنؤ میں امن اور چین غارت ہو گیا اور وہاں علم و ادب کی رونقیں ماند پڑ گئیں تو یوپی کی ریاست رام پور شاعروں ادیبوں اور دیگر اصحاب کمال کی جائے پناہ بن گئی تھی، فلسفہ و منطق کے نامور عالم مولوی عبدالحق خیرآبادی، اردو شاعری کی دبستان دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ داغ، امیر مینائی اور دیگر مشاہیر رام پور میں جمع ہو گئے تھے یہاں ایک بہت بڑا علمی کام یہ بھی انجام پایا کہ مختلف کتب خانوں کی جو کتابیں زمانہ کے دست برد سے بچ کر رامپور پہنچیں ان کی بھرپور حفاظت کی گئی ریاست کے حکمرانوں نے اس نازک دور میں علم و ادب اور اردو شعر و شاعری کی اعلیٰ روایات جس خوبی سے برقرار رکھیں اس کا ایک اہم باب یہ ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم (متوفی ۱۸۶۵ء) نے شعرائے دہلی اور لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنا ڈالی ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں بھی بڑے قادر الکلام تھے نواب تخلص تھا چار دیوان یادگار چھوڑے نواب صاحب سے غالب کی مراسلت[1] اردو نثری ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ غرض ریاست کے پہلے نواب فیض اللہ خاں (متوفی ۱۷۹۴ء) سے لے کر آخری نواب رضا علی خاں تک سب ہی علم کے دلدادہ کتابوں کے شائق اور اہل علم کے مربی رہے بقول مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری (مصنف تاریخ جام جہاں نما) فیض اللہ خاں سے ہزار علماء وظیفہ پا رہے تھے۔ ان کے جانشینوں نے اس علم نوازی کا سلسلہ قائم رکھا اور رام پور کو ایک علم پرور سلطنت بنا دیا۔ یہ سلطنت پونے دو سو برس تک قائم رہی تقسیم ہند کے بعد یوپی میں مدغم ہو کر اس کا ایک ضلع بن گئی۔ لیکن اس مرحوم دور کی

---

[1] یہ مراسلت "مکاتیب غالب" کے نام سے امتیاز علی عرشی کے ایک تحقیقی مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

و یادگاریں اسٹیٹ لائبریری (حال رضا لائبریری) اور مدرسہ عالیہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔

رضا لائبریری اس کا نام ایک عرصہ دراز تک اسٹیٹ لائبریری رہا ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ریاست کے آخری حکمران نواب رضا علی خاں کے نام سے موسوم ہوکر "رضا لائبریری" کہلائی۔ اس لائبریری کی داغ بیل ریاست کے پہلے نواب فیض اللہ کے زمانہ میں ہی پڑ گئی تھی اس کے بعد ان کے جانشینوں کے عہد میں اس کی برابر ترقی ہوتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی باقاعدہ تاریخ نواب محمد سعید خاں (متوفی ۱۸۵۵ء) کے عہد سے شروع ہوتی ہے اس زمانہ میں کتب خانہ کی جو ترتیب و تنظیم کی گئی اس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ "کتب خانے کیلئے علیحدہ الماریاں تیار ہوئیں اور ان میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھوائی گئیں۔ کئی خوش نویس، طلاساز، نقاش، وصلی ساز اور جلد ساز ملازم تھے نئی کتابیں نقل ہوتی تھیں اور نادر کتابوں پر سونے کا کام کرایا جاتا تھا۔"

نواب کلب علی خاں (متوفی ۱۸۸۷ء) کے عہد میں یہاں کے ذخائر میں کافی اضافے ہوئے چونکہ وہ کتابوں کے بڑے شائق تھے لکھا ہے کہ "دہلی، لکھنؤ، لاہور سے خاص ملازم بھیج کر کتابیں منگواتے تھے زمانۂ ولی عہدی کی اکثر کتابوں پر دست خاص سے لکھا ہوا ہے کہ آج اس کتاب کے دستیاب ہونے سے جو مجھے خوشی ہوئی ہے کبھی ایسی مسرت نہیں ہوئی۔ سرسید کی آثار الصنادید کے ایڈیشن پر جو اسی زمانہ میں نکلا تھا ان کا ایک تفصیلی نوٹ رضا لائبریری کے آثار کے نسخہ کے سرورق پر آج بھی محفوظ ہے۔"

لائبریری کے عملہ میں بھی اضافے ہوتے رہے۔ اس کے لئے مہتمم اور فہرست نگار بڑے بلند پایہ اہل قلم مقرر ہوئے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں جیسی شہرۂ آفاق شخصیت سات برس تک اسکی افسر اعلیٰ رہی۔ اس کے ممتاز کارکنوں میں امیر مینائی (منشی امیر احمد) نے امیر اللغات کی دو جلدیں (الف اور ب) لکھیں انھوں نے نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر رام پور کے شعراء کا تذکرہ "انتخاب یادگار" کے نام سے مرتب کیا حافظ احمد علی خاں شوق نے "تذکرہ کاملان رام پور" لکھا اور مولوی نجم الغنی نے

حیدرآباد، اودھ، روہلکھنڈ اور راجپستان کی تاریخ، علوم اسلامی اور طب وغیرہ پر بہت سی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ لائبریری کے موجودہ سربراہ امتیاز علی عرشی کا سب سے بڑا کارنامہ دیوان غالب کی ترتیب واشاعت ہے جو ادبی دنیا میں "عرشی ایڈیشن" کے نام سے مشہور ہے۔

اس کتب خانہ کے ذخائر کی جو تفصیلات[1] بیان کیگئی ہیں ان کے مطابق یہاں ۲۷ ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں اردو کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہے یعنی پندرہ ہزار کے قریب عربی تقریباً چار ہزار فارسی لگ بھگ تین ہزار اور انگریزی پانچ ہزار کے قریب ہوں گی اردو مطبوعات میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس ذخیرے کے ہمسر مشکل ہی سے اور ایک دو نکلیں گے۔

لیکن یہاں کی اصل دولت اس کا غیر مطبوعہ یا قلمی سرمایہ ہے حیدرآباد (دکن) کے بعد ہندوستان میں اسلامی زبانوں کا سب سے بڑا قیمتی ذخیرہ ہے جس کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔

مخطوطات فارسی میں عہد مغل کی تاریخ اور علوم اسلامیہ سے متعلق جتنے نوادر یہاں جمع ہیں وہ خود ایرانیوں کے لئے قابل رشک ہیں اسی طرح فارسی شعراء کا بے حد نایاب ذخیرہ موجود ہے ان میں کشمیر کے فارسی گو شعراء کے دواوین خصوصاً قابل ذکر ہیں فارسی اور عربی کے تقریباً چھ چھ ہزار اور اردو کے لگ بھگ ڈیڑھ ہزار مخطوطات کے ساتھ ساتھ ترکی اور پشتو میں تقریباً پچاس کتابیں، ہندی سنسکرت کی تقریباً ایک ہزار جدید کتابیں اور چھال پر لکھی ہوئی تامل کی ڈیڑھ سو کتابیں اس قلمی سرمایہ میں مزید اضافہ ہوئی ہیں۔

اس لائبریری کو جو ذخیرے نذر کئے گئے ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک اُستاد مولوی بدرالدین علوی کا قیمتی ذخیرۂ کتب بھی شامل ہے۔ دہلی کے لوہارو خاندان

---

[1] یہ تفصیلات وغیرہ عابد رضا بیدار کے مضمون "کتب خانہ رضائیہ رام پور" سے لی گئی ہیں (الزبیر کتب خانہ نمبر ص ۸۷)

یاب قلمی و مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ بھی یہاں منتقل ہو گیا ہے اس میں غالب سے
تعلق جو کتابیں ہیں ان میں برہان قاطع کا نسخہ بھی ہے جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے
اس پر غالب نے اپنی بے تکلف یادداشتیں قلمبند کی تھیں جو قاطع برہان کی بنیاد
ثابت ہوئیں۔

یہاں ایک ہزار کے قریب تصاویر بھی ہیں ان میں اکثر ایسی ہیں جن کا وجود دنیا
میں کسی اور جگہ نہیں ہے اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "تصویروں کا یہ مجموعہ اپنی
کیفیت کے اعتبار سے کسی بھی بڑے میوزیم کے مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے" اور یہ
توقع بھی ظاہر کی گئی ہے کہ "لائبریری کی طرف سے جلد ہی ان تصاویر کا ایک تفصیلی کیٹلاگ
اور ایک مرقع شائع کیا جائیگا"۔

لائبریری ذخائر کی کیٹلاگ سازی میں بڑے بڑے لائق و فائق اصحاب نے حصہ لیا
ہے مثلاً ایک زمانہ میں امیر مینائی یہاں کے چیف کیٹلاگر تھے اس سلسلہ میں حکیم اجمل خاں
اور احمد علی خاں شوق کے نام بھی آئے ہیں۔ عربی مخطوطات کی جلد اول حکیم صاحب نے اور
جلد دوم شوق صاحب نے مرتب کی ہے آخر الذکر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ فہرستیں
مرتب کرنے کا کام جاری ہے۔ ان کی ایک یا دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ
فہرست جب مکمل ہو گی تو عالمی فہرستوں میں ایک شاہکار ہو گی"۔

جہاں تک لائبریری کے موجودہ نظم و نسق کا تعلق ہے اس کے لئے حکومت یوپی
نے ایک بورڈ مقرر کر دیا ہے جس کے صدر مرحوم نواب رضا علی خاں تھے لائق ذکر بات یہ ہے
کہ اس نظام میں بھی لائبریری کی افادیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اہل علم اور شائقین کتب
اس سے برابر استفادہ کر رہے ہیں۔

کتب خانے

رام پور کے علم پرور ماحول میں اور بھی متعدد کتب خانے تھے جن میں
احمد شاہ (قاضی شہر) کا ذاتی کتب خانہ بڑا قابل قدر تھا اس کے
ذخیرۂ کتب کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی صدیوں پرانی بیش
قیمت کتابیں موجود ہیں۔

یہاں کی "صولت پبلک لائبریری" کا شمار بھی عمدہ اور اہم لائبریریوں میں ہوتا ہے اس میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کے جواہم مخطوطات ہیں ان کی تعداد ہزار آٹھ سو بتائی گئی ہے۔

مدرسۂ عالیہ رام پور کے عہد رفتہ کی علمی نشانیوں میں یہ مدرسہ خاص اہمیت رکھتا ہے ہندوستان کے بہت سے نامور علما اسی دار العلوم کے تربیت یافتہ ہیں اس ادارے کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ نوابان رامپور کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کا فیض بدستور جاری ہے۔

دیوبند

دیوبند کا دار العلوم[1] ہندوپاک میں علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی کا بہت بڑا مرکز ہے اس کی ابتدا ضلع سہارن پور کے اس قدیم قصبہ کی ایک قدیم مسجد چھتہ میں چند متقی علماء کے متبرک ہاتھوں سے ۱۸۶۷ء میں ہوئی جسے ایک متبحر عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۲ء - ۱۸۸۰ء) نے ترقی دے کر دار العلوم کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ وہی اس کے پہلے مہتمم و سرپرست تھے یہاں کے سرپرستوں اور اساتذہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کے پہلے صدر مدرس محمد یعقوب نانوتوی ہی تھے۔ اس درس گاہ کے قیام کا مقصد ایسے علماء و فضلاء تیار کرنا تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مسلک و تعلیمات کی اشاعت و حفاظت اور علوم دینی کا احیا بھی کر سکیں۔ خیال رہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ علماء نے علم اور سیاست کے میدانوں میں جو نمایاں کام انجام دیئے ان کا دائرہ ہندوستان تک محدود نہیں رہا ان کی تعلیمی خدمات کا ایک نمونہ مولانا مفتی محمد شفیع کا دار العلوم کورنگی (کراچی) بھی

[1] دار العلوم کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "دار العلوم دیوبند" از مولانا محمد طیب (دفتر اہتمام دار العلوم دیوبند)

کستان کے کچھ مدارس (جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور، مدرسہ عربی
مدارس ملتان، دارالعلوم ٹنڈو الٰہ یار خان، دارالعلوم کھڈہ کراچی اور دارالعلوم
نیہ اکوڑہ خٹک پشاور) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ "دیوبندی مکتب فکر کی
یادگاروں کو زندہ رکھے ہوتے ہیں۔"

دارالعلوم کا کتب خانہ بڑا وسیع اور عظیم الشان ہے اس میں کتابوں
ب خانہ کی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے مذہبی علوم پہ جتنا ذخیرہ یہاں ہے
شاید ہی کہیں اور یکجا مل سکے۔ یہاں کے ذخائر میں عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ
یزی، ہندی اور گجراتی کی کتابیں بھی ہیں مخطوطات کا بھی بڑا نادر ذخیرہ موجود ہے۔

اس کتب خانہ میں بڑے قیمتی عطیات بھی شامل ہوتے رہے ایک زمانہ میں
ی نولکشور (لکھنؤ) اپنے مطبع کی مطبوعات تحفتاً بھیجا کرتے تھے چونکہ اس مطبع
ردو وغیرہ کی قدیم اور نایاب مطبوعات شائع ہوا کرتی تھیں اس لئے یہاں
بڑا قابل قدر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کے بہت سے فیض یافتہ علماء و فضلاء
کے ورثاء بھی کتابوں کے عطیات دیتے رہتے ہیں مثلاً مفتی سعد اللہ مرادآبادی کے
ند مولوی لطف اللہ نے مفتی صاحب کا کتب خانہ دارالعلوم کو دیدیا تھا جس
بخاری شریف کا وہ نسخہ بھی موجود ہے جس کو شاہ ولی اللہ نے حجاز میں خریدا تھا
یہ شاہ صاحب کی تحریر اور دستخط موجود ہیں۔ علاوہ ازیں منشی جمال الدین
الملہام ریاست بھوپال کا کتب خانہ بھی اس درس گاہ کو مل گیا تھا اور نہ معلوم
اعلیٰ ذخائر اسے ملے ہوں گے ان عطیات سے بھی کتب خانہ کے ذخائر میں بڑے
ب اضافے ہوئے اس طرح یہ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف و نحو، منطق، علم کلام
دیگر اسلامی علوم کی کتابوں سے معمور ہو گیا ہے۔

روہیلکھنڈ

روہیلکھنڈ میں بدایوں وہ شہر ہے جہاں مسلمان بقول مورخین مسلمانوں کی

سلطنت سے پہلے آباد ہو گئے تھے اسے قطب الدین ایبک نے فتح کیا، شمس الدین التمش یہاں کا گورنر رہا اسی نے یہاں جامع مسجد اور مدرسہ معزی قائم کرائے اس طرح دہلی میں پہلی مسلم سلطنت قائم ہونے کے بعد ہی بدایوں میں علمی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں کہ "دہلی کے بعد مسلمانوں کا موکب اقتدار بدایوں جاکر ٹھیرا" اس کے بعد بہت سے علماء و فضلا ممالک اسلامیہ سے آکر یہاں سکونت پذیر ہو گئے۔ رضی الدین حسن صغانی، حضرت نظام الدین اولیاء اور ضیاء الدین نخشبی جیسے مشاہیر کا یہاں سے تعلق رہا۔ ہر دور میں اس شہر کی سرزمین سے نامور مصنفین اور اصحاب شعر و ادب اٹھے اور مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے۔

اسے بھی یاد رکھیے کہ روہیلہ نواب حافظ الملک رحمت خاں کے زمانہ یعنی اٹھارویں صدی میں روہیلکھنڈ کا گوشہ گوشہ علم اور تعلیم کی روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا انھوں نے بہت سے مدرسے، مکتب اور کتب خانے قائم کرائے خود نواب بھی اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ رکھتے تھے جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں کر دیا گیا ہے۔

کتب خانے اسے یاد رکھیں کہ بدایوں اور روہیلکھنڈ کے دیگر شہروں میں قرون وسطیٰ سے اب تک کتب خانوں کے قیام کا سلسلہ جاری ہے بہت سے قدیم خاندانوں کے پاس کتابوں کے اعلیٰ ذخیرے موجود ہیں جن پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں ان پوشیدہ ذخائر کی چند جھلکیاں ذیل کی سطور میں دیکھئے اس سلسلہ میں وہ علمی شخصیتیں بھی سامنے آجائیں گی جو گو اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر انکے نام کتب خانوں سے وابستہ ہیں۔

انیسویں صدی میں مولانا فضل رسول بدایونی (متوفی ۱۸۷۲ء) اور مولانا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۹۰۱ء) بھی صاحب درس علماء میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے انھوں نے ہی مدرسہ قادریہ (بدایوں) کے کتب خانہ کو پروان چڑھایا اور اس میں بڑی اعلیٰ کتابیں جمع کر دیں جن کی تعداد تقریباً بیس ہزار تھی، چار ہزار مخطوطات تھے افسوس کہ اس کا بڑا حصہ اب تباہ ہو چکا ہے مدرسہ شمس العلوم (بدایوں) کی تعمیر و

تمام تر سہرا مولانا عبدالماجد بدایونی (متوفی ۱۹۳۱ء) کے سر ہے وہ ایک ممتاز عالم
زبردست خطیب تھے خلافت تحریک کے رہنما کی حیثیت سے خاصے مشہور رہے
کل اس مدرسہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث مفتی محمد ابراہیم فریدی سمستی پوری ہیں
مدرسہ کے کتب خانہ میں پچیس ہزار کتابیں ہونگی ۔

ذاتی کتب خانوں میں میر محفوظ علی بدایونی اور بلبسی کے ایک رئیس نواب سعادت
خاں کے پاس علوم مشرقی کے بہت عمدہ ذخیرے تھے جو اسلامیہ کالج بدایوں کے کتب خانہ
منتقل ہو کر محفوظ ہو گئے اس کالج کے کتب خانہ میں بھی پچاس ہزار کتابیں ہونگی ۔

یہاں میر محفوظ علی بدایونی (متوفی ۱۹۴۳ء) کے متعلق یہ بیان کر دینا بھی مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے ادیب اور مولانا محمد علی جوہر کے مقربان خاص میں تھے
ن کے اخبار ہمدرد کے ایڈیٹر بھی رہے تھے وہ اردو کے مزاح نگاروں میں نہایت
بند مقام رکھتے تھے اور یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان کے مضامین فرضی ناموں
شمع بے نور" اور "ملا علی بودھاموی" سے بھی شائع ہوتے تھے۔ غور فرمائیے کہ
نور پھول کی کلی کو کہتے ہیں جس سے یہاں نقطے مراد لئے ہیں چنانچہ بے نور کا مطلب
شمع کے تین نقطے حذف کر دینا ہوا اب سمع رہ گیا۔ اور س سے سید م سے محفوظ اور
ع سے علی بن کر سید محفوظ علی ہو گیا اور بودھاموی بدایوں کے قدیم نام (بودھامئو)
کی نسبت سے لکھا کرتے تھے ۔

میر محفوظ علی کتابوں کے ایسے شائق تھے کہ وہ بدایوں کے کتب خانوں کو ترقی
دینے میں اعانت بھی کرتے رہتے تھے وہ وہاں کے کتب خانہ میونسپل بورڈ کی کمیٹی کے ممبر
بھی تھے اس کتب خانہ میں اردو، عربی اور فارسی کی کتابوں کے بڑے نادر ذخیرے
موجود ہیں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی تمام و کمال مطبوعات یہاں ہیں۔
کتابوں کی کل تعداد پچاس ساٹھ ہزار سے کسی طرح کم نہ ہوگی ۔

بدایوں میں مولوی رضی الدین بسمل (متوفی ۱۹۲۵ء) کا کتب خانہ بھی نہایت
اعلیٰ تھا اس میں نہایت قیمتی خطی نسخے تھے ان قیمتی کتابوں کے جمع ہو جانے کی وجہ یہ

بھی بھی کہ ان کے مالک صاحب تصانیف تھے انھوں نے "کنز التاریخ
تذکرۃ الواصلین" لکھی ہیں اول الذکر بدایوں کی تاریخ ہے اور دوسری میں مشا
کے حالات ہیں مولوی رضی الدین کا کتب خانہ بُری طرح برباد ہو گیا بچی کچھی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھیجدی گئیں۔

سید ضیاء علی مرحوم مفتی حافظ بخش بدایونی (متوفی ۱۹۲۱ء - صدر
و شیخ الحدیث مدرسہ محمدیہ، بدایوں) مولوی محمود الحسن (مدیر مومن بدایوں۔
۱۹۷۵ء) اور مولوی علی بخش (صدر الصدور) کے پاس بھی کتابوں کے نہایت اع
تھے اول الذکر نے تو اپنے مردانہ مکان میں ایک دار المطالعہ بھی قائم کر لیا تھا۔ آخ
سرسید کے بڑے مخالف تھے لیکن عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ان کی رحلت کے بعد ان
کا بڑا حصہ مولوی یعقوب بخش راغب کو ملا جو سرسید کی درس گاہ مسلم یونیو
اُستاد مقرر ہو گئے تھے۔ یہ کتب خانہ ابھی تک مولوی صاحب کے صاحبزادے
طیّب بخش کے پاس محفوظ ہے۔

مولوی نظام الدین حسین نظامی (متوفی ۱۹۴۷ء) مالک نظامی پریس بد
کے کتب خانہ میں ان کی صحافتی اور تصنیفی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑی اعلیٰ کتا
ہو گئی تھیں۔ انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار ذوالقرنین بدایوں سے نکالا تھا جو
جاری ہے ان کی ایک اہم تالیف "قاموس المشاہیر" کی دو جلدیں بھی ۱۹۲۴ء
سے شائع ہوتی تھیں ان میں زمانہ قدیم اور جدید کے سینکڑوں مشائخ علماء، مص
شعراء، حکمرانوں اور دیگر مشاہیر کے مختصر حالات بہ اعتبار حروف تہجی درج کئے
چند غیر مسلم اکابر کے حالات بھی اس میں موجود ہیں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہو
سید جالب دہلوی (مدیر روزنامہ ہمدم، لکھنؤ) اور دیگر مشاہیر نے لکھ
اردو زبان میں یہ کتاب اپنی قسم کی سب سے پہلی کتاب ہے۔

بدایوں کے مضافات اور قصبات کی مسلم آبادیوں میں بھی بہت اچھے اچھے
تھے بدایوں سے سات میل کے فاصلے پر قصبہ اوجھیانی میں اگرچہ مسلمانوں کی

زیادہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود ان میں کتابوں کے شائق اور قدردان موجود ہیں۔ یہاں مولوی صوفی عبدالحمید اشرفی (متوفی ۱۹۴۵ء) کا کتب خانہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اس میں کم و بیش چار ہزار کتابیں ہیں۔ مختلف علوم کی کتابوں کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں اور علمائے بدایوں وغیرہ کی تمام تصانیف یہاں موجود ہیں اور کتب خانہ بھی ابھی تک محفوظ ہے۔

بدایوں کے قریب قصبہ سہسوان میں بھی اہل علم کے پاس اچھے اچھے کتب خانے تھے یہ بھی ایک زمانہ میں مشہور علماء کا مرکز تھا۔ گنّور، لبسولی اور گورامئی جیسے چھوٹے چھوٹے قصبات میں بعض لوگوں کے پاس بھی کتابوں کے ذخیرے تھے غرض اس علاقے میں کتب خانوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔

بریلی بھی ممتاز مشائخ اور علماء کا بہت بڑا مرکز رہا ہے بیسویں صدی کے علماء میں مولانا احمد رضا خاںؒ بریلوی (۱۸۵۶ - ۱۹۲۱) بڑے جید عالم، بلند پایہ مصنف اور شاعر تھے وہ حضرت شاہ آل رسولؒ مارہروی کے خاص مرید و خلیفہ تھے انھوں نے کئی سو کتابیں لکھیں۔ بریلی میں "جامعہ منظر الاسلام" کی بناء ڈالی اور ایک نہایت اعلیٰ کتب خانہ بھی قائم کیا جو اب ان کے فرزند مولوی مصطفےٰ رضا خاں کے پاس ہے۔

یہاں حضرت شاہ نیاز احمدؒ (متوفی ۱۸۳۴ء) کی خانقاہ کا کتب خانہ نہایت نفیس ہے اس میں خطی کتابوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ حضرت شاہ فخرالدین دہلوی کے نامور خلیفہ اور اپنے وقت کے ممتاز عالم اور شیخ طریقت تھے انکی خانقاہ کے متعلق "مشائخ چشت" میں ہے کہ وہ قائم ہونے کے بعد بہت جلد "معدن فیوض ربانی اور مطلع انوار سبحانی بنگئی"۔

اس شہر میں علم و فضل کے اعتبار سے مفتیوں کا خاندان بھی مشہور رہے یہ بدایوں کے عثمانی خاندان کی شاخ ہے اس خاندان کے کتب خانوں میں قاضی عبدالجمیل جنون تلمیذ غالب کا کتب خانہ نہایت عمدہ تھا عثمانی خاندان کے آخری رکن قاضی محمد خلیل حیران تھے ان کے کتب خانہ میں بلا شبہ دس ہزار کتابیں ہونگی جوان کے بعد ان کے متبنّیٰ حکیم عبدالوحید کو مل گئیں قاضی حیران کا خطی دیوان پروفیسر محمد ایوب قادری

کے پاس موجود ومحفوظ ہے۔ بریلی کے قریب پیلی بھیت کے ذاتی کتب خانوں میں مولانا و
احمد محدث سورتی کا کتب خانہ نہایت اعلیٰ تھا ان کے پوتے اس کی کچھ کتابیں اپنے ہمراہ کرا
لے آئے تھے۔ مرحوم ایک نامور مصنف تھے اور کراچی میں مطب کیا کرتے تھے حکیم قاری احمد نا
آنولہ ضلع بریلی میں مسلمانوں کی قدیم بستی ہے روہیلوں کا پہلا دارالحکومت یہ ہ
قصبہ تھا اس کے متعلق لکھا ہے کہ "ریاست رام پور کے قیام سے پہلے روہیلوں کا تہذیبی مرکز
آنولہ اور اس کے مضافات میں ٹانڈا تھا اس عہد کے شمالی ہند کے شعرا اور ادبا کی ایک اچھی تعداد
یہاں جمع ہو گئی تھی اردو کے مشہور شعرا میں سوز، قائم، اور مصحفی یہاں موجود تھے سودا آ
آتے رہ گئے پھر یہ بزم رام پور کی مستقل ریاست بننے کے بعد ادھر منتقل ہو گئی" لیکن علمی
ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہاں بھی قدیم خاندانوں میں اچھے اچھے کتب خانے تھے حکیموں کے
خاندان میں ایک بہت اچھا کتب خانہ تھا جس میں مولوی محبوب علی خاں (متوفی ۱۹۲۸) نے
خاصا اضافہ کیا کئی ہزار کتابیں یہاں جمع ہو گئی تھیں مولوی صاحب کے بعد ان کے صاحبزاد
نے نصف کتب خانہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مدرسہ اور نصف دارالعلوم دیوبند
کی نذر کر دیا تھا۔

یہاں مولوی عبدالمجید قادری (متوفی ۱۹۴۳ء) بھی بڑا نفیس کتب خانہ
رکھتے تھے جسے ان کے علم دوست صاحبزادے مفتی عبدالحفیظ (متوفی ۱۹۵۸ء) نے بڑی ترقی
دی۔ وہ آگرہ کے مفتی اعظم اور مشہور مصنف تھے ان کے نامور فرزند مولانا محمد حسن حقانی
(سابق ممبر صوبائی اسمبلی سندھ) دارالعلوم امجدیہ (کراچی) میں ناظم تعلیمات ہیں۔

حکیم عبدالغفور (فرزند ملا قادر بخش) کا ذخیرۂ کتب بھی بڑا اعلیٰ ہے
اس میں تاریخ اور طب پر نہایت قیمتی اور نایاب کتابیں موجود ہیں بعض اہم خطی
نسخے بھی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی مشہور کتاب "ازالۃ الخفاء" کا ایک نہایت اچھا
خطی نسخہ ۱۱۸۴ھ کا مکتوبہ موجود ہے حکیم صاحب بڑے اچھے شاعر اور مصنف
تھے انھوں نے مشاہیر آنولہ کے حالات میں ایک کتاب "سوانحات المتاخرین آنولہ"
لکھی ہے جو کراچی سے شائع ہو رہی ہے ان کا انتقال ۱۹۶۴ء میں ہو گیا۔

اسی طرح شیخ تنویر احمد کی کوٹھی میں ایک کتب خانہ قائم ہوا تھا جس میں بڑا اچھا ذخیرۂ کتب تھا اس کی ترقی میں محمد عارفین کی کوششوں کو بڑا دخل رہا وہ کتب بینی کے بڑے شائق تھے۔

مولوی حکیم سعید اللہ قادری (متوفی ۱۹۰۷ء) کا کتب خانہ بھی قابل ذکر ہے حکیم صاحب کے والد ماجد اشرف الحکماء مولوی حکیم عظیم اللہ قادری (متوفی ۱۸۶۷ء) نامور طبیب اور مصنف تھے انھوں نے "کاشف الحقیقت فی تاریخ مشائخ الطریقت" فارسی میں لکھی جواب تک محفوظ ہے دراصل اس کتاب خانہ کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی تھی پھر حکیم سعید اللہ قادری کے صاحبزادے مولوی رحیم بخش قادری (متوفی ۱۹۲۰ء) نے اسے خاصی ترقی دی تھی یہ کتب خانہ ان کے پوتے پروفیسر محمد ایوب قادری (صاحبزادے مولانا مشیت اللہ قادری) آنولہ سے منتقل کر کے کراچی لے آئے ہیں۔ انھوں نے اس کتب خانہ میں کافی اضافے کئے ہیں اس میں تقریباً چھ ہزار کتابیں[1] اور تین سو مخطوطات ہیں[2] بعض مخطوطات بڑے نادر ہیں۔

اور لائق ذکر بات یہ بھی ہے کہ آنولہ کے بہت سے خاندانوں نے اپنے ذخائر کتب مدرسہ اسلامیہ کے کتب خانہ کو دیدیئے تھے اس طرح اس میں تقریباً بیس ہزار کتابیں جمع ہو گئی تھیں مگر یہ نفیس کتب خانہ تقسیم ہند کے بعد برباد ہو گیا۔

فرخ آباد

فرخ آباد اور اس کے نواحی علاقوں کو نواب محمد خاں بنگش کے زمانہ (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۴۳ء) میں بڑی علمی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی نواب صاحب کا قائم کردہ مدرسہ مفتی محمد ولی اللہ فرخ آبادی کا مدرسہ "فخر المرابع و ربیع المفاخر" اور ملا قطب الدین

---

[1] [2] ان کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مولوی ثناء الحق کا مضمون کراچی کے ذاتی کتب خانے (الزبیر، کتب خانہ نمبر ص ۳۰۲)

شمس آبادی (متوفی ۱۷۰۹ء) کے علم وفضل کا ذکر گزشتہ صفحات میں آگیا ہے اب ان چند ذاتی کتب خانوں کا کچھ ذکر کیا جارہا ہے جو اہل علم مسلمانوں کے قدیم خاندان نے چھوٹے چھوٹے قصبات تک میں قائم کرلئے تھے۔

ضلع فرخ آباد کے قصبہ قائم گنج میں مولوی عنایت اللہ خاں کا کتب خانہ تھا جس میں قلمی کتابوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ یہاں شاہ رفیع الدین کی "تنبیہ الغافلین" (اردو) کا خطی نسخہ محمد ایوب قادری کی نظر سے گزرا ہے اس کتب خانہ کی بچی کھچی کتابیں مولوی صاحب کے برلواسے حکیم آلِ علی خاں کے پاس موجود ہیں قائم گنج کے ایک نامور طبیب حکیم محمد یحییٰ کا کتب خانہ بھی قابل ذکر ہے ان کے پاس مطبوعہ اور خطی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔

اس مردم خیز قصبہ میں بڑی نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (بھارت کے صدر) اور ان کے دو بھائی قابل ذکر ہیں ان میں ڈاکٹر محمود حسین خاں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے یہ تینوں بزرگ صاحب تصانیف بھی ہیں آخر الذکر کی "روحِ اقبال" نے علمی دنیا میں جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

قصبہ رائے پور (ضلع فرخ آباد) میں مولوی محمد نور کا کتب خانہ بھی جملہ علوم و فنون کی کتابوں پر مشتمل تھا وہ صاحب تصانیف اور صاحب سلسلہ بزرگ تھے مولوی خدا بخش ملتانی کے خاص مرید وخلیفہ تھے انھوں نے "پنج گنج نوری، صلوٰۃ محمدیہ، مخزن الرزق والفتوحات، مصباح العبادت، اور فوائد الکبرائی" لکھی تھیں یہ تمام کتابیں حکیم آل علی خاں کے پاس کراچی میں محفوظ ہیں مگر مولوی محمد نور کے قیمتی کتب خانہ کا بڑا دردناک حشر ہوا چونکہ ان کی اولاد میں کوئی اس کا سنبھالنے والا نہ تھا اس لئے انھوں نے خود یہ نایاب سرمایہ دریا برد کردیا۔

رائے پور میں مولوی نصیر الزماں چشتی نیازی اور ان کے چھوٹے بھائی منور الزماں چشتی کے پاس بھی کتابوں کے عمدہ ذخیرے تھے اول الذکر کے کتب خانہ میں تصوف

کی بھی نایاب کتابیں جمع تھیں اور مخطوطات کا بھی خاصا ذخیرہ تھا نیازی صاحب ذی علم بزرگ تھے اور شاہ نیاز احمدؒ کے چھوٹے صاحبزادے نصیرالدین میاں (بدایونی) کے سلسلۂ بیعت سے منسلک تھے نیازی صاحب کے صاحبزاد عثمان شبلی آج کل ان کے جانشین ہیں نصیر الزماں نیازی کے ایک مرید بشیر الزماں بشیر کے پاس بھی بہت سی کتابیں تھیں بشیر صاحب اچھے شاعر تھے مراثی اور سلام خوب لکھتے تھے خوش گو اور خوش خط بھی تھے اس قصبہ میں مولوی فضل احمد اور ان کے چھوٹے بھائی ولایت حسین کے پاس بھی اچھے خاصے کتب خانے تھے جن میں بہت سی خطی کتابیں بھی تھیں اول الذکر صاحب سلسلہ بزرگ تھے انکے مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ کانپور کے بہت سے کایستھ (ہندو) بھی ان کے مرید تھے۔ یہاں ملا حکیم محمد خاں کے کتب خانہ میں بھی ہر علم وفن کی کتابیں موجود تھیں وہ رائے پور میں فارسی کے مشہور استاد تھے ان کا حلقۂ تلمذ نہایت وسیع تھا۔

ان علاقوں کے کتب خانے بطور نمونہ پیش کر دیے گئے ہیں اسی طرح تمام ہندوستان کے علم دوست مسلم گھرانوں میں کتابوں کے ذخیرے موجود تھے ان میں جو باقی رہ گئے ہیں وہ اُن کے مالک اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اگر ان بکھرے ہوئے نوادر کو جمع کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ کر دیا جائے تو ان کی افادیت اور عمر دونوں بڑھ جائیں گی ورنہ ؎

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

مُسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

گو اصل میں اس دار العلوم کا کتب خانہ (مولانا آزاد لائبریری) کی جھلکیاں دکھانا مقصود ہے۔ مگر اس سے پہلے تبرکاً سر سیّد کا ذکر کر دینا ضروری ہے کیونکہ ان ہی کے با برکت ہاتھوں سے اس کی بنیادی پڑی تھی ان کا سارا علمی سرمایہ بھی اسی میں لگا ہوا ہے ان کی ذاتی کتابیں اس کتب خانہ میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں جنکا فیضان آج بھی جاری وساری ہے اور چونکہ سرسید یونیورسٹی اور مولانا آزاد لائبریری ایک مربوط رشتہ میں منسلک ہیں اس لئے لائبریری کے ساتھ ان دونوں کا بھی کچھ ذکر کر دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔

اور اسے بھی پیش نظر رکھیئے کہ سر سیّد نے اپنے دار العلوم سے ایک رفیع الشان کتب خانہ منسلک کر دینے کا منصوبہ اُس زمانہ میں بنایا تھا جب ہندوستان میں کتب خانوں کا تصور ٹھٹھرا ہوا پڑا تھا۔ اور اس ملک کے موجودہ عظیم الشان کتب خانے رآصفیہ لائبریری حیدرآباد دکن۔ خدابخش لائبریری، پٹنہ وجود میں نہ آئے تھے اور نہ پنجاب[1] اور کلکتہ[2] یونیورسٹیوں کی بنیادیں رکھی گئی تھیں اس لحاظ سے یہ دار العلوم اور اس کا کتب خانہ کتنے اہم اداروں اور کتب خانوں کے پیشرو کہے جا سکتے ہیں۔

(۱ - ۲) پنجاب یونیورسٹی کی ۱۸۸۲ء میں اور کلکتہ یونیورسٹی کی ۱۸۸۷ء میں بنیادیں رکھی گئی تھیں لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منصوبہ کی بنیاد کالج کی شکل میں ان سے پہلے رکھ گئی تھی اور اس کا باقاعدہ افتتاح بھی ۱۸۷۷ء میں ہو گیا تھا۔

علیگڑھ کے دار العلوم سے پہلے ایک اسلامی درس گاہ "مدرسہ عالیہ" اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سرسید احمد خاں

مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ "سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک کی حیثیت پر اس کی شان اور اس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے جو خود بھی سرسید کی طرح جامع حیثیات ہو"۔

بہر حال ان کی شخصیت کے یہ خاص پہلو پیش نظر رکھیئے کہ وہ اسلام کے شیدائی مسلمانوں کے رہبر، اردو کے فادر[۵]، تصنیف و تالیف کے شائق اور کتابوں کے عاشق تھے ساری عمر اپنی قوم کی خدمت کرنے اور لکھنے پڑھنے میں گذار دی وہ خود کہتے تھے کہ "جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ایسا کسی کام میں نہیں لگتا"۔

سرسید ۱۸۱۷ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۰ء سے تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ ۱۸۹۸ء تک جاری رہا اس سال جب ایک عیسائی مصنف کا رسالہ

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) "ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" کلکتہ میں قائم ہو گئے تھے اول الذکر کا قیام ۱۷۸۰ء میں ہوا تھا جو ابتک بدستور قائم ہے اس سے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ بھی منسلک ہے تفصیل کے لئے دیکھئے "مدرسہ عالیہ کلکتہ" از پروفیسر امراؤ الاسلام۔ مطبوعہ مجلہ علم و آگہی، گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی، بابتہ ۷۴۔۱۹۷۳ء ص ۴۳)
ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سر ولیم جونز کی کوششوں سے ۱۷۸۴ء میں قائم ہوئی تھی اس سے ایک عظیم الشان کتب خانہ اور ایک دارالاشاعت بھی منسلک ہے، جن کے فیض ابتک جاری ہیں اس دارالاشاعت نے ہندوستان کی تاریخ کے قدیم فارسی ماخذ شائع کر کے تاریخ و ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے (تفصیل کیلئے دیکھیئے انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ از علامہ عبداللہ یوسف علی مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد ۱۹۳۶ء) ص ۵۲۔

[۵] حالی نے سرسید کو فادر آف اردو لٹریچر کہا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "جو چیزیں خصوصیت سے سرسید کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین زور اور اثر، وسعت، جامعیت، سادگی و صفائی سے ادا کر سکتی ہے"۔

شائع ہوا جس میں اس نے ازواجِ مطہرات کے بارے میں سخت نکتہ چینی کی تھی تو سرسید کے دل پر گہرا اثر ہوا اور اس کے جواب میں ایک کتابچہ "جواب امہات المومنین" کے نام سے لکھنا شروع کر دیا حالانکہ وہ اس زمانہ میں اتنے شدید علیل تھے کہ اسے مکمل کرنے سے پہلے ہی رحلت فرما گئے اس اٹھاون برس میں انھوں نے چھوٹی بڑی تقریباً پچاس کتابیں لکھیں جس میں "آثار الصنادید" بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے اس میں دہلی کی تاریخی عمارات اور اکابر کے حالات بڑی تحقیق اور محنت سے لکھے گئے ہیں یہ پہلی بار ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی ان کی تصانیف میں "خطباتِ احمدیہ" بڑے پایہ کی کتاب ہے جو انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں نہایت تحقیق و تدقیق سے حُبِّ رسول میں ڈوب کر لکھی ہے ان کی تفسیر القرآن اور تبئین الکلام مذہبی کتابوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "دونوں کے مطالب و مضامین سے شدید اختلافات کا اظہار کیا گیا مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان تصانیف نے آنے والے دینی ادب پر گہرا اثر ڈالا" علاوہ ازیں سرسید نے تزکِ جہانگیری، آئینِ اکبری اور تاریخِ فیروز شاہی کی تصحیح و ترتیب میں جو تحقیق و تلاش اور کد و کاوش کی ہے اس کی اہل علم نے بڑی داد دی ہے۔

ان تصانیف کا مطالعہ کرتے وقت مولوی حامد حسن قادری (مصنف داستانِ تاریخ اردو) کے سرسید کے بارے میں یہ الفاظ بھی پیش نظر رکھیں۔

"پوری اُنیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ، مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ، فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع کتابیں تصنیف کی ہوں۔"

کتب خانہ سرسیدؒ سرسید نے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی قائم کر لیا تھا جس میں مطبوعہ اور خطی کتابوں کے بڑے نایاب ذخائر تھے۔ ان کے جمع ہو جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے تصنیفی اور تحقیقی کاموں کے لئے اعلیٰ اور مستند کتابیں

حاصل کرنے کی کاوش کرتے رہتے تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ کتابوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے لکھا ہے کہ "انھیں فارسی اور عربی کی قدیم مؤلفات سے بڑا شغف تھا اور یورپ میں جوں ہی کوئی نئی کتاب ان کی دلچسپی کی چھپتی وہ فوراً منگوا لیتے۔"

سرسید تنگ دستی کے عالم میں بھی کتابوں پر روپیہ صرف کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے انھوں نے گاڈفرے ہگنس (HIGGONS) کی ایک نایاب کتاب جو اسلام کی حمایت میں ہے دس گنی میں بمقام لندن خریدی پھر ہندوستان آکر اس کا ترجمہ پانچ سو روپیہ میں کرایا اور اسے "حمایت اسلام" کے نام سے شائع کر دیا

اس کتابی ذوق کے اثر سے سرسید کے کتب خانہ میں انگریزی، فارسی، عربی، اردو وغیرہ میں متعدد مضامین کی جو مستند کتابیں جمع ہو گئی تھیں ان سے اہل علم نے سرسید کی زندگی میں خوب فائدے اٹھائے اور اب بھی ان سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

علامہ شبلی جب ایم۔ اے۔ او کالج (علی گڑھ) میں عربی کے پروفیسر تھے اس وقت انھوں نے اس قیمتی کتب خانہ سے استفادہ کیا تھا وہ لکھتے ہیں۔

"میں سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھکو دیدی ہے اس وجہ سے مجھکو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ اور عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں، میں کیا بڑے بڑے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئیں اور مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ میں کرایا ہے۔ میرے مطالعہ میں ہے۔"

ان کتابوں کا مطالعہ علامہ شبلی جس انہماک سے کیا کرتے تھے اسے بھی ان ہی کی زبانی سنیئے۔ فرماتے تھے "میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا تھا کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی۔"

سرسید کے کتب خانہ کا ذکر کرنل گریہم کی کتاب "لائف اینڈ ورکس آف سید احمد خاں" (مطبوعہ ۱۸۹۵ء) میں بھی کیا گیا ہے۔ گریہم تحریر کرتے ہیں ۔

"سرسید اب کئی برس سے علی گڑھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہتے ہیں ۔ اس پر ادبی ماحول چھایا ہوا ہے اور ان کے بیٹھنے کے کمرہ میں جہاں وہ اپنے دن کا زیادہ حصہ گذارتے ہیں۔ ایک میز ہے جو کتابوں اور کاغذوں سے بھری ہوئی ہے ان کے کھانے کے کمرہ میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی ہیں جن میں معیاری انگریزی کتابیں ہیں ان کی ایک لائبریری بھی ہے۔ جس کا کمرہ نہایت شاندار ہے۔ یہ بے شمار مختلف قسم کی کتابوں سے بھرا ہوا ہے جن میں بہت سی مذہبی کتابیں ہیں جو انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر اور انجیل مقدس کی شرح لکھنے پر استعمال کی ہیں ان میں سید محمود کا وہ دلچسپ مقالہ بھی ہے جو ان کو کیمبرج یونیورسٹی سے انعام میں ملا تھا۔"

کالج کا قیام اس کالج کے بارے میں یہ خاص نکتہ پیش نظر رکھئے کہ یہ محض ایک تعلیمی درس گاہ نہیں ہے بلکہ یہ سرسید اور ان کے رفقائے خاص کی قومی خدمات کا ایک عظیم کارنامہ ہے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ناکام ہو جانے کے بعد جب مسلمانوں پر افسردگی اور مایوسی چھا گئی تو سرسید نے تعلیم کے ذریعہ ان کے حوصلے بڑھائے اور انھیں زبوں حالی، بے اطمینانی اور اضطراب کے اندھیروں سے نکالنے اور جدید علوم و فنون کی روشن راہوں پر گامزن کرنے میں اپنا تن من دھن لگا دیا وہ مسلمانوں کی حیات کے تمام شعبوں (مذہب، علم و ادب، معاشرت اور سیاست وغیرہ) کو حقائقِ زندگی سے ہم آہنگ کرنے اور ان کا ذہنی جمود توڑ کر ان کے فکر و عمل میں وسعت اور بلندی پیدا کرنے کی اپنی حیات کے آخری لمحوں تک جد و جہد کرتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کے لئے ایک تعلیمی و تہذیبی تحریک بھی جاری کی جو "علی گڑھ تحریک" کہلائی وہی مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوئی اور علیگڑھ

مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا ایک مرکز بن گیا یہاں ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول کی بنا پڑی جو "محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج" (ایم۔اے۔او کالج) کی صورت اختیار کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی بن گیا تاریخ گواہ ہے کہ اس ادارے کے تعلیم یافتہ ملک کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی تحریکوں کے بڑے پرخلوص کارکن ثابت ہوئے اور بعض نے تو ان تحریکات کی ایسی کامیاب رہبری کی کہ دنیا میں اس دارالعلوم کا نام خوب روشن ہو گیا

لیکن تقسیم ہند کے بعد مسلم یونیورسٹی کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا اس انقلاب کے اثرات سے اس پر کچھ عرصہ تک یاس و ہراس کے بادل چھائے رہے اُن پریشان کن ایام کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے تاہم اس امید افزا پیغام کا ذکر کر دینا ہے جو اُن دنوں لاہور سے علی گڑھ کے نام آیا تھا جس میں اسی دارالعلوم کے ایک اولڈ بوائے مولانا ظفر علی خاں نے یہ تحریر[۱] فرمایا تھا: "میں مسلم یونیورسٹی کے نوجوانوں سے یہی توقع رکھتا ہوں کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں تک ممکن ہو اپنی امتیازی شان کو برقرار رکھنا اپنا ملّی فرض سمجھیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ وہ ہندوستان میں جہاں جائیں اور جس جگہ رہیں ذہنی ترقی، اخلاقی برتری اور شہری ذمہ داری کے نقطۂ خیال سے ممتاز نظر آئیں۔ میرا ایمان ہے کہ وہ شدید سے شدید رکاوٹوں کے باوجود اپنے علم و عمل سے موجودہ فضا کی یاس انگیز تاریکی کو روح افزا روشنی میں تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد یونیورسٹی کی بعض امتیازی خصوصیات باقی نہیں رہیں پھر بھی وہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایسا علمی و ثقافتی مرکز ہے جس کی عظمت و اہمیت کا یہ عالم ہے کہ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین[۲] خاں

"علی گڑھ جس طرح کام کرے گا علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا

علی گڑھ ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں کی خدمت کے لئے جو

---

[۱] ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین کا شمارۂ خصوصی، علی گڑھ نمبر ۵۴-۱۹۵۳ - ۵۵-۱۹۵۴ء۔

[۲] یہ باتیں ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے عہد وائس چانسلری کے ایک جلسہ میں کہی تھیں جس میں راقم بھی شریک تھا۔

پیش کش دیگا اس سے متعین ہوگا ہندوستان کی قومی زندگی میں مسلمانوں
کا مقام ۔ ہندوستان علی گڑھ کے ساتھ جو سلوک کرے گا اس پر بہاں
بڑی حد تک اس پر منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل
میں اختیار کرے گی "

یونیورسٹی کے کتب خانے

اسے ملحوظ خاطر رکھئے کہ کتب خانوں کے لحاظ سے بھی یہ یونیورسٹی ہمیشہ مالامال رہی ہے۔ ایم۔ اے او کالج کے قائم ہونے کے ساتھ ہی کتب خانوں کا قیام عمل میں آگیا تھا یہ سلسلہ برابر بڑھتا رہا اور آج کل تو یہاں کتب خانوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری کے علاوہ اور بہت سے کتب خانے ہیں تمام تعلیمی شعبوں سے کتب خانے منسلک ہیں۔ شعبہ جاتی کتب خانوں میں سب سے قدیم لا لائبریری ہے۔ شعبہ قانون کی اس لائبریری کی بنیاد جسٹس محمود کی قانونی کتابوں سے رکھی گئی تھی۔ بقول مؤلف "محمڈن کالج ہسٹری"[1] انھوں نے تقریباً دس ہزار روپیہ کی قیمتی قانونی کتابیں اس شعبہ کو عنایت فرمائی تھیں ان میں کی اکثر کتابوں پر ان کے دستخط بھی موجود ہیں سید محمود بھی اپنے والد ماجد سرسید کی طرح کتابوں کے بڑے شائق تھے ان کے ذاتی کتب خانہ میں قانون کی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم کی بھی کتابیں تھیں ان میں "قانون ابن سینا" کا ایک قدیم نسخہ (مطبوعہ ۱۵۹۲ء) بھی تھا جو اب مولانا آزاد لائبریری میں ہے۔

شعبہ جاتی کتب خانوں کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ بھی کتابوں کے اعلیٰ ذخائر رکھتے ہیں ان میں بعض بڑے اہم اور نادر ہیں۔ یونیورسٹی کے ملحقہ اداروں، طلباء کی انجمنوں، اقامت گاہوں کے مرکزوں سے بھی کتب خانے وابستہ ہیں ہر کتب خانے میں اس کی نوعیت کے مطابق کتابیں مہیا کی گئی ہیں بعض میں کتابوں کی تعداد ہزاروں تک ہے یونیورسٹی کے "انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" (ادارۂ علوم اسلامیہ) کا کتب خانہ اسلامی علوم

[1] ملاحظہ ہو "محمڈن کالج ہسٹری یعنی تاریخ مدرستہ العلوم مسلمانان" مرتبہ سید افتخار عالم مارہروی (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) ص ۱۳۹ -

سلامی تاریخ وغیرہ کی کتابوں کا نہایت قیمتی خزانہ ہے ملحقہ اداروں (طبیہ کالج
یکل کالج، انجنیرنگ کالج، یونیورسٹی ہائی اسکول اور یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول وغیرہ)
تب خانے نہایت وسیع ہیں۔ طلبار کی مرکزی انجمن، مسلم یونیورسٹی یونین (سابق سٹڈنس
کلب) کا کتب خانہ بھی کافی بڑا ہے اس سے ایک وسیع ریڈنگ روم بھی منسلک ہے۔
شعبہ جاتی کتب خانوں میں ہر ایک اپنے شعبہ سے متعلق مضامین کی تمام کتابیں
ا ہے سائنس کے شعبوں کے کتب خانوں میں کتابوں کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی
نس کے قدیم اور جدید رسائل کی ہزاروں نایاب اور قیمتی جلدیں موجود ہیں غور فرمائیں
ی ایک مخصوص موضوع کی سینکڑوں اور ہزاروں کتابوں کا یکجا میسر آجانا اہل علم
موص ریسرچ اسکالرس کے لئے کس قدر سودمند ہوتا ہے۔
یونیورسٹی کے ملحقہ اداروں میں "ویمنس کالج" بھی شامل ہے جس کی عمارت
ت حسین اور وسیع ہے اس کا کتب خانہ بھی بڑا نفیس ہے یہ کالج دو علم نواز ہستیوں
عبداللہ (ایڈوکیٹ علی گڑھ) اور ان کی نیک بخت بیگم نے ہندوستان کی
خواتین کیلئے علیگڑھ میں قائم کیا تھا جو آجکل ہندوستان کے ممتاز ویمنس کالجوں میں شمار ہوتا ہے
یونیورسٹی کے حدود میں ہی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر کی خوبصورت عمارت
ان جہاں منزل میں بھی ایک کتب خانہ ہے اس کانفرنس کی سرسید نے ۱۸۸۶ء میں
الی تھی ان ہی کے ایک ہم نوا اور ارادت مند صاحبزادے آفتاب احمد خاں کے
یہاں کی لائبریری کا نام "آفتاب لائبریری" رکھا گیا ہے اس میں تعلیمات سے
تی کتابیں اور نہایت قیمتی سرکاری وغیر سرکاری رپورٹیں جمع تھیں مگر اس لائبریری
ئر کا بہت بڑا حصہ یونیورسٹی کے ٹیچرس ٹریننگ کالج منتقل کر دیا گیا اور یہاں ایک مختصر ذخیرہ رکھا گیا۔
غرض یونیورسٹی میں کتب خانوں کا ایک شاندار مربوط اور علم افروز سلسلہ پھیلا ہوا
ب خانوں کے اس جھرمٹ میں "مولانا آزاد لائبریری" کی حیثیت ایک مرکزی کتب خانہ
اسے ان سب کا سرتاج اور رہنما کہنا چاہیئے چونکہ ان کتب خانوں کے زیادہ تر
ن اسی کے فیض یافتہ ہیں۔

مولانا آزاد لائبریری

یہ عظیم الشان لائبریری یونیورسٹی کے مرکزی علاقہ میں تعلیمی شعبوں کے جھرمٹ
میں بڑے پرشکوہ انداز کے ساتھ ایسے موزوں ومناسب مقام پر واقع ہے کہ اس سے
یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء وطالبات کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ استفادہ
کرسکتے ہیں اس کا نام تراسی برس تک لٹن لائبریری رہا اور اب مولانا آزاد لائبریری کے
نام سے موسوم ہے۔

اس لائبریری[1] میں مسلمانوں کے ماضی کی یادداشتیں، اسلام کے ابتدائی دور کے
لکھے ہوئے قرآن اور احادیث کے متبرک نسخے، مسلم اکابر اور مورخین کی سینکڑوں
پرانی کتابیں، مسلمانانِ ہند کی مذہبی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی تحریکات سے متعلق
نایاب اور بے بہا ذخیرے محفوظ ہیں اور اس تہذیبی ورثہ کی وہ اسی طرح امین ومحافظ
ہے جیسے برٹش میوزیم لنڈن، ببلیوتھک نیشنال پیرس اور امریکہ کی کانگریس لائبریری
یورپ اور امریکہ کے ثقافتی ورثہ کی محافظ ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد تو یہ لائبریری کتابوں کے لئے ایک پناہ گاہ بن گئی تھی اس پُر آشوب
دور میں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے بڑے بڑے نادر مخطوطات ومطبوعات
علم کے اس مخزن میں آکر ہر خطرے سے محفوظ ومامون ہوجاتے تھے۔

لائبریری کی افادیت اور جاذبیت یہ لائبریری اپنے قیام سے اب تک بڑی جاذبیت اور افادیت
کی حامل رہی ہے اس کی ابتداء سرسید اور ان کے صاحبزادے

[1] اس لائبریری سے متعلق راقم الحروف کا مضمون "مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ"
کے کتب خانہ نمبر (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا تھا اس کا نقش ثانی کافی اضافوں اور
ترمیمات کے ساتھ ان اوراق میں پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا آزاد لائبریری
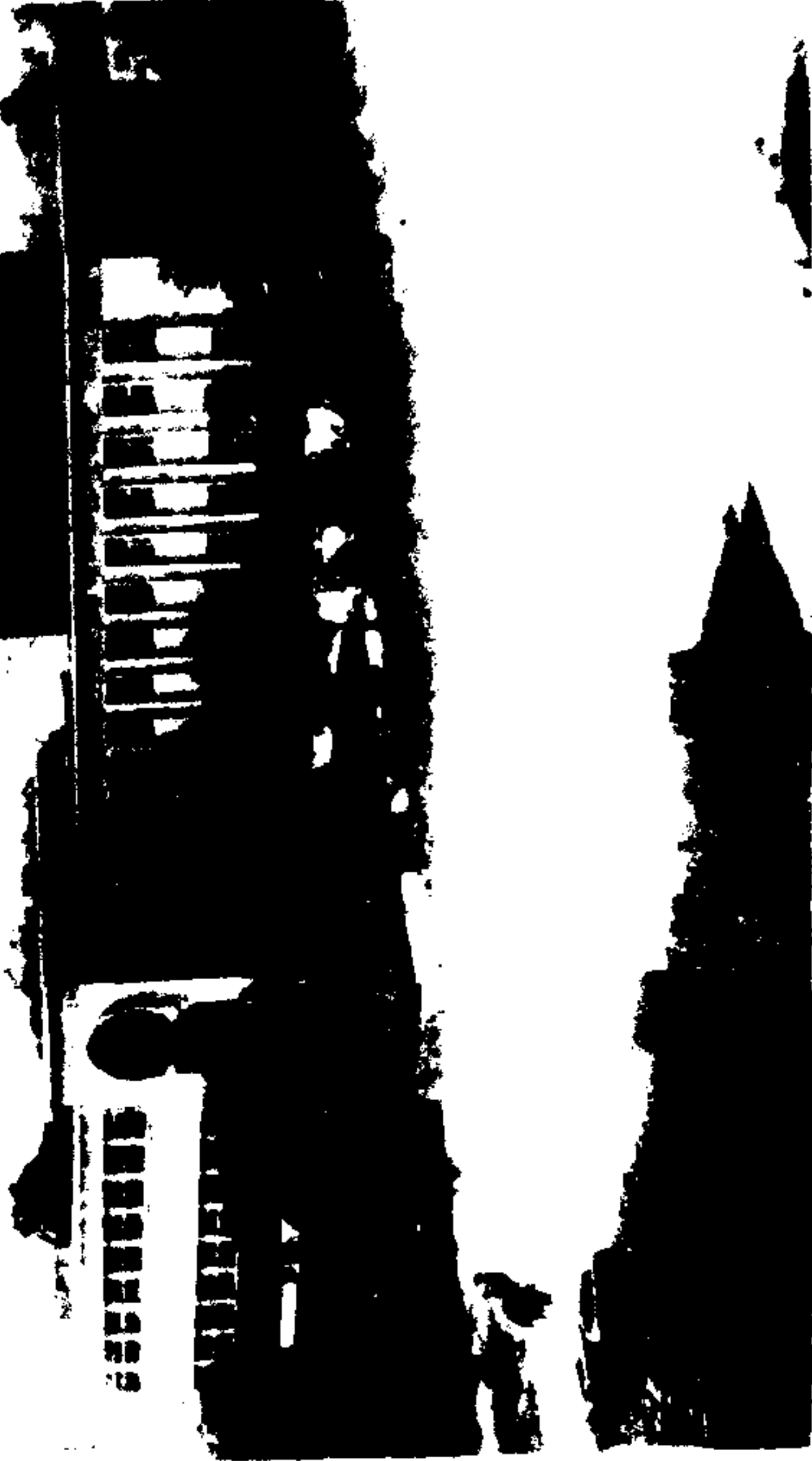
جسٹس محمود کی نفیس اور قیمتی کتابوں سے ہوئی تھی اس کے بعد یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہی چنانچہ یہ نادر قلمی کتابوں کے مُطلا و مذہب نسخوں نامور خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیوں، سلاطین کے فرامین، علماء اور مشاہیر کے مکتوبات اور جملہ علوم و فنون کی بہترین اور تازہ ترین مطبوعہ کتابوں سے معمور ہو گئی اور اب یہاں خطی اور مطبوعہ کتابوں کی تعداد چار لاکھ سے بھی آگے نکل گئی ہے بعض خطی کتابیں تو یہاں ایسی ہیں جو دنیا کے عظیم الشان کتب خانوں میں بھی نہیں ہیں۔

ان اعلیٰ ذخائر کی وجہ سے یہ لائبریری ارباب علم اور شائقین کتب کے لئے بڑی خاص کشش و جاذبیت رکھتی ہے اس سے استفادہ کرنے کے لئے ہند اور بیرون ہند سے علماء و فضلاء علی گڑھ آتے رہتے ہیں ایک بار مشہور مورخ جادو ناتھ سرکار بھی یہاں آئے تھے کئی دن تک لائبریری سے استفادہ کرتے رہے تھے اپریل ۱۹۶۱ء میں مشرقِ وسطیٰ کے مشہور و معروف علماء (الحاج شیخ عبدالحسین امینی نجفی' الحاج سید غلام رضا تبریزی اور نجف اشرف کی پبلک لائبریری "مکتبہ الامام امیر المومنین" کے لائبریرین الحاج محمد رضا نجفی بھی یہاں تشریف لائے اور اس لائبریری کی عظمت وافادیت سے اتنے متاثر ہوتے کہ انھوں نے اسے امم اسلامیہ اور ہندوستانیوں کے ارتباط کا مرکز قرار دیا۔ ان علمائے کرام کے بائیس دن لائبریری سے استفادہ کرنے کے بعد قائدِ وفد نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا۔

"میں ایک عرصہ دراز سے علی گڑھ یونیورسٹی اور اس کے عظیم الشان و گراں بہا کتب خانہ کے متعلق تعریفیں سنا کرتا تھا یہاں تک کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے مجھے یہاں پہنچا دیا میں نے یہاں بائیس یوم مسلسل قیام کیا اور مجھے اس گرانقدر و عظیم الشان کتب خانہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا یہاں میں نے ایسے گراں مایہ نفائس کتب کو محفوظ پایا جو انمول علمی خزینہ و روحانی سرمایہ ہے درحقیقت یہ کتب خانہ ایسا عدیم المثال اور گراں مایہ ہے کہ

برِصغیر ہندوستان اور یہاں کی عظیم الشان ہندوستانی قوم اس کے وجود
پر اقوامِ عالم کے مقابلہ میں فخر و مباہات کر سکتی ہے واقعی یہ کتب خانہ
ہندوستان اور اس کی قوم و ملت کیلئے عظمت و تقدم کی علامت و نشانی
ہے یہ کتب خانہ اُمم اسلامیہ و ہندوستانیوں کے ارتباط و اتحاد کا مرکز ہے"۔

عمارت یہ لائبریری تعمیر کے لحاظ سے بھی ایک عظیم الشان لائبریری ہے اس کی ع
کا ایک خصوصی پہلو یہ ہے کہ یونیورسٹی کی عمارات میں سب سے پہلے اسی
نصب کیا گیا ہے اسے گیارہ لاکھ ۶۰ ہزار کے صرفہ سے بھارت کی مرکزی سرکار نے تع
کرایا ہے یہ عمارت تین لاکھ ۳۰ ہزار ایک سو تریسٹھ مربع گز کے رقبہ پر تعمیر ہوئی ہے
کے علاوہ ایک وسیع رقبہ پر خوشنما لان پھیلے ہوئے ہیں جنہوں نے لائبریری کے ما
کو بڑا سر سبز اور خوش گوار بنا دیا ہے۔

عمارت کا نقشہ حیدر آباد دکن کے ایک نامور انجنیر فیاض الدین نے بنایا تھا
کے سنگِ بنیاد رکھنے اور افتتاح کی تقریبات بڑی شاندار تھیں سنگِ بنیاد پنڈت جوا
نہرو نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی عہد وائس چانسلری میں ۱۲ ر نومبر ۱۹۵۵ء کو رکھا اور تع
مکمل ہو جانے کے بعد پنڈت جی نے ہی اس کا افتتاح کرنل بشیر حسین زیدی کے دورِ و
چانسلری میں ۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو کیا تھا اسی سال اس کا نام مولانا ابوالکلام آزاد کے
پر "مولانا آزاد لائبریری" ہو گیا۔

اصل میں تو یہ دو منزلہ عمارت ہے مگر اسٹیکس یعنی کتابیں رکھنے کے کمرے آٹھ
ہیں جن سے عمارت کی شان دوبالا ہو گئی ہے اس کا بلند و بالا اور خوبصورت درو
خالص اسلامی طرز کا ہے جو عمارت کی عظمت و شان کی پوری نمائندگی کر رہا ہے۔ اس
عمارت میں دو نہایت وسیع دار المطالعے اور ۲۰ بیس کیبن ہیں جہاں ریسرچ اسکالرس
دیگر شائقین کتب صبح سے رات تک مطالعہ کتب میں غرق رہتے ہیں ذوقِ کتب
اُبھارنے والا یہ منظر بڑی دلکشی رکھتا ہے سہ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا
یہ عظیم الشان عمارت دیکھنے کے دوران اس کی قدیم عمارت کو بھی پیشِ نظر رکھ

صرف ایک وسیع اور خوب صورت کمرہ پر مشتمل تھی پھر رفتہ رفتہ چند اور کمرے اس میں شامل ہو گئے گو لائبریری کی قدیم اور جدید عمارتوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو ذرہ کو آفتاب سے ہوتی ہے مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی کی مقدس اور تاریخی عمارتوں (مسجد اور اسٹریچی ہال وغیرہ) کی صف میں اس علاقہ کے اندر واقع ہے جو کبھی ایم۔اے۔او کالج کا قلب کہلاتا تھا اور جسے اب "سرسید ہال" کہتے ہیں۔

لائبریری کا نام رکھا جانا

جب ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد رکھا تو اسی موقع پر لائبریری کو ان کے نام سے موسوم کئے جانے کی تجویز وائسرائے ہند کی خدمت میں یوں پیش کیگئی تھی۔

"جس احسان مندی کے ساتھ ہم اپنی عزت پر نظر کرتے ہیں جو آج حضور نے ہم کو اس مجلس کی رونق افزائی سے بخشی ہے اور جس کے واسطے ہندوستان کے تمام اطراف سے ہمارے ہموطن اس کثرت سے جمع ہوئے ہیں اس کو ہم مناسب الفاظ میں حضور کی خدمت میں ظاہر کرنا دشوار پاتے ہیں۔

پس ایک ایسے کام کی یادگار قائم رکھنے کی غرض سے جس سے حضور ملکہ معظمہ کی رعایائے ہند کی بہبودی کی وہ سچی فکر پائی جاتی ہے جو حضور کے نظام کا ایک خاصا ہے۔ ہم نے حضور کی عنایت آمیز اجازت سے یہ تجویز کی ہے کہ کالج کا کتب خانہ حضور کے نام سے موسوم کیا جائے اور ہم دل سے امید رکھتے ہیں کہ یہ مکان اس عزت کے ناقابل نہ ہو جو اس کو اسطرح پر حاصل ہوئی ہے۔"

اس کے جواب میں لارڈ لٹن نے فرمایا۔

میں نہایت خوشی کے ساتھ آپ کی اس مسرت بخش تجویز کو قبول کرتا ہوں کہ آپ میرے نام کی بھی ایسے بڑے اور مشہور مدبروں کے ناموں کے ساتھ جنکا میں اوپر تذکرہ کر چکا ہوں یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں (۱)۔

کتب خانہ جو آپ میرے نام سے منسوب کرنا چاہتے ہیں سب سے

(۱-۲) ملاحظہ ہو محمڈن کالج ہسٹری۔ ص ۱۳۷-۱۳۸۔

مناسب سوسائٹی ہے اگر اس میں کسی شخص کو دخل ملے یہ سوسائٹی دنیا کی معززین خیر خواہوں کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ تمام زمانہ کے عقل مند اور نیک لوگ یہاں رہتے ہیں اور اس جگہ وہ لوگ رہتے ہیں جو اس دنیا میں رہنے کے قابل ہیں"

ملکہ وکٹوریہ کا عطیہ لٹن لائبریری کی بنیاد ایسی نیک ساعت میں پڑی تھی کہ اس کے زمانۂ قیام سے لے کر آج تک بادشاہ، امراء، علماء اور عوام سب ہی اپنی محبوب کتابیں اس لائبریری کی نذر کرتے رہے ان معطیان کی فہرست میں ملکہ وکٹوریہ کا نام بھی آیا ہے ان کے عطیہ کی بابتہ محمڈن کالج ہسٹری میں لکھا ہے۔

"محمڈن کالج کے طلباء میں جنرل نالج پیدا کرنے کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی لائبریری ہے جس میں بہت سی کتابیں انڈیا آفس اور ٹرسٹیاں برٹش میوزیم اور کیمبرج یونیورسٹی نے نذر کالج کی ہیں لیکن سب سے زیادہ باعث افتخار وہ دو کتابیں ہیں جن کو حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند دام اقبالہا نے مرحمت فرمایا اور جس پر اپنے دستِ مبارک سے کچھ تحریر فرمایا ہے۔"

عطیات اسی طرح علم دوست اور مخیر حضرات نے لٹن لائبریری کو مخطوطات اور مطبوعات کے اعلیٰ ذخیرے وقتاً فوقتاً عنایت کئے جن میں مولوی سبحان اللہ خاں (گورکھپور) نواب عبدالسلام خاں (رامپور) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، جسٹس سر شاہ محمد سلیمان، سید علی احسن مارہروی[1]، شاہ منیر عالم (غازی پور) رام بابو سکسینہ (مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر) فرنگی محل (لکھنؤ) اور جواہر میوزیم (اٹاوہ) کے ذخیرے شامل ہیں۔

مصر کے صدر کرنل جمال عبدالناصر نے یونیورسٹی میں اپنی آمد یکم اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

---

[1] سید صاحب کا ذخیرۂ کتب مارہرہ سے علی گڑھ منتقل کرنے میں راقم نے بھی خصوصی خدمات انجام دی تھیں۔

کے موقع پر ۵۱۷ مطبوعہ کتابیں مرحمت فرمائیں ان میں قرآن شریف کے تین نسخے اپنی نفیس جلدوں کے باعث بڑے دیدہ زیب ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ہی مکہ معظمہ سے دو نہایت اعلیٰ کتابیں تحفتاً بھیجی گئیں جن سے لائبریری کی تقدیس میں اور اضافہ ہوگیا۔

قرآن السعدین یہ ایک بڑا نادر اتفاق ہے کہ ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی لائبریری مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے موسوم ہوکر "مولانا آزاد لائبریری" کہلائی اور اسی سال مولانا کے "صدیق مکرم" (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) کے علم دوست صاحب زادے مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے اپنے والد بزرگوار کا نادر ذخیرۂ کتب (کتب خانہ حبیب گنج) اپنے قبضہ و تصرف سے جدا کرکے مسلم یونیورسٹی کی ملکیت میں دیدیا اس طرح دو مقتدر ہستیوں کی یہ دونوں عظیم یادگاریں یک جا ہوگئیں اس یکجائی کو رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک خط (مکتوبہ ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء) میں "قرآن السعدین" لکھا ہے اور اس فیاض معطی کو مبارک باد پیش کی ہے۔

لائبریری کا ابتدائی دور عملہ اور کتابوں کی تعداد ۱۹۰۰ء تک

ایسے ایسے قیمتی ذخائر کی شمولیت سے لائبریری کے نوادر میں بڑا شاندار اضافہ ہوگیا مگر لائبریری کی ترقی یافتہ صورت دیکھنے سے پہلے اس کے ابتدائی دور کی صورت دیکھ لیجئے اس دور یعنی ۱۹۰۰ء تک کتابوں کی کل تعداد ۵۰۱۰ (انگریزی کی ۲۲۴۵ اور مشرقی علوم کی ۲۷۶۵) تھی اس دور کی کیفیت "محمڈن کالج ہسٹری" (ص ۱۳۹) میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

> "اس لٹن لائبریری میں انگریزی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بھاشا لیٹن، گریک زبانوں کی کتابیں خوبصورت شیشے کی الماریوں میں نہایت عمدگی کے ساتھ چنی ہوئی ہیں جس میں ایک لائبریرین اور ایک اسسٹنٹ لائبریرین اور ایک دفتری کام کرتا ہے اس کتب خانہ میں ہر ایک علم و فن کی کتابیں موجود ہیں کالج کا ہر طالب علم لائبریری میں بیٹھ کے کتابوں کی سیر کرتا ہے۔ لائبریری کے قواعد ایک علیحدہ کتاب میں مندرج ہیں جن کی رو سے ہر ایک

لڑکا اپنے کمرہ پر بھی ایک مرتبہ میں زیادہ سے زیادہ دو والیوم لے جاسکتا ہے جس کو چودہ دن سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اورنٹیل لائبریری کا عظیم ذخیرہ اسٹریچی ہال کی خوبصورت عمارت میں رکھا ہے۔ ہر ایک علم کی کتابوں کے جدا جدا رجسٹر ہیں ہر ایک کتاب پر باقاعدہ نمبر لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے کتابیں نکالنے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی۔"

لائبریری کی رفتارِ ترقی ۱۹۰۰ء میں کون سوچ سکتا تھا کہ ۱۰۵۰ کتابوں اور عملہ کے تین افراد پر مشتمل یہ چھوٹی سی لائبریری ساٹھ برس میں ایک رفیع الشان لائبریری کی صورت اختیار کرلے گی دراصل ۱۹۶۰ء لائبریری کی تاریخ میں ایک یادگاری سال ہے اس سال لائبریری پرانی عمارت سے نئی عمارت میں منتقل ہوئی اس کا ۸۳ برس پرانا نام تبدیل ہوا اب لائبریری کی رفتارِ ترقی بڑھنے لگی ذخائر کے بیش بہا عطیات کی شمولیت سے لائبریری کا علمی وقار بلند ہوا۔ عملہ اور کتابوں کی تعداد میں کافی اضافے ہوجانے سے لائبریری کی افادیت میں بھی اضافہ ہوگیا مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۱۷۳۰۳۲۔ اور قلمی نسخوں کی تعداد ۸۹۸۴ تک پہنچ گئی اس طرح کل تعداد ۱۸۲۰۱۶ ہو گئی۔

مطبوعات انگریزی ۱۱۵۰۳۹۔ اردو ۳۷۷۸۵۔ عربی ۸۲۸۴۔ فارسی ۵۵۰۵۔ ہندی وسنسکرت ۶۴۱۹۔

اس کے بعد جیسے جیسے یونیورسٹی کو فروغ ہوا لائبریری کی ترقی کے امکانات روشن ہوتے چلے گئے ۶۱-۱۹۶۰ء میں اکتالیس[۱] ملازمین کے عملہ میں لائبریرین کے علاوہ ایک اسسٹنٹ لائبریرین، ایک اورنٹیل اسسٹنٹ اور دو لائبریری اسسٹنٹ تھے اور بجٹ کی رقم ایک لاکھ پچانوے ہزار چھ سو چھیانوے (۱۹۵۶۹۶) تھی۔

پھر ۷۲-۱۹۷۱ء میں بجٹ کی رقم نو لاکھ ستاسی ہزار چار سو پچاس (۹۸۷۴۵۰) اسٹاف کی تعداد ایک سو ستائیس[۲] (۱۲۷) اور کتابوں کی تعداد چار لاکھ ترپن ہزار آٹھ سو بیس

(۱-۲) یہ اعداد و شمار مولانا عبدالشاہد شروانی (اسسٹنٹ لائبریرین شعبہ مخطوطات انچارج اورنٹیل ڈویژن مولانا آزاد لائبریری) کے مضمون "مولانا آزاد لائبریری" (بقیہ آئندہ صفحہ

(۳۸۲۰۵۴) تک پہونچ گئی۔ اسٹاف اور کتابوں کی تفصیل یہ ہے۔

اسٹاف ۔ لائبریرین۔ ۱۔ ڈپٹی لائبریرین۔ ۱۔ اسسٹنٹ لائبریرین۔ ۵
پروفیشنل اسسٹینٹ۔ ۱۶۔ سیمی پروفیشنل۔ ۲۲۔ دفتری عہدہ داران۔ ۵
فرسٹ گریڈ کلرک۔ ۴۔ سیکنڈ گریڈ کلرک۔ ۲۰ تھرڈ گریڈ کلرک۔ ۳۶
جلد ساز۔ ۱۳۔ خاکروب۔ ۴۔

کتابیں ۔ انگریزی۔ ۳۱۸۴۶۵۔ اردو۔ ۶۱۱۸۹ فارسی۔ ۱۳۱۲۸
عربی۔ ۲۱۱۸۳۔ ہندی۔ ۱۷۹۳۰۔ سنسکرت۔ ۴۲۸۰۔
ملیالم۔ ۱۹۰۵۔ تلگو۔ ۱۷۶۵۔ تامل۔ ۳۱۰۔
ترکی۔ ۲۶۱ (مع رومن) پشتو۔ ۳۷۔ مراٹھی۔ ۷۹۔
بھاشا۔ ۵۔ بنگالی۔ ۲

مخطوطات ۔ ۱۳۲۸۱۔

رسائل و اخبارات لائبریری میں رسائل بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں کچھ قدیم اخبارات کے فائل بھی محفوظ ہیں۔ یہاں ہر سال تقریباً ایک ہزار ملکی اور غیر ملکی رسائل آجاتے ہیں ان میں سے اکثر منگوائے جاتے ہیں اور کچھ تحفتاً بھیجے جاتے ہیں وقیع اور کارآمد رسائل کی جلد بندی کراکے درجہ بندی اور کیٹلاگ سازی کردی جاتی ہے اہم اخبارات بھی خریدے جاتے ہیں اوران کے فائل محفوظ کردئے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے محبوب ترین اخبارات مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے کامریڈ اور الہلال کے کچھ فائل محفوظ ہیں۔ ہندوستان کا مشہور اخبار اسٹیٹسمین نیز انگلستان کے اہم اخبارات سپیکٹیٹر اور ٹائمز لٹریری سپلیمینٹ کے فائل بھی موجود ہیں۔

اُن اہم رسائل کے فائل بھی یہاں ہیں جو مرحوم ہو جانے کے باعث اب بمشکل دستیاب

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) (مطبوعۃ العلم کراچی جولائی۔ ستمبر ۱۹۷۶ء) سے لئے گئے ہیں۔

خیال رہے کہ لائبریری میں یہ اضافے راقم الحروف کے یہاں سے ریٹائر ہو جانے کے بعد ہوئے ہیں۔

ہوتے ہیں مثلاً مخزن (لاہور) زمانہ (کانپور) اردوئے معلیٰ (علی گڑھ) الناظر اور نگار (لکھنؤ) ہمایوں اور نیرنگ خیال (لاہور) یاد رہے کہ ان کے مدیران شیخ عبدالقادر، دیا نرائن نگم، حسرت موہانی، ظفرالملک علوی، نیاز فتحپوری، بشیر احمد اور حکیم یوسف حسین ہندو پاک کی صحافت کے بلند پایہ ستون تھے۔

یہاں معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) اور اُن جیسے دیگر علمی رسائل بھی خریدے جاتے ہیں اور ان کی جلدیں محفوظ کر لی جاتی ہیں اس سلسلہ میں یہ بھی کہہ دینا ہے کہ لائبریری میں ہند اور بیرون ہند سے بہت سے رسائل اور کتابچے خود بخود آتے رہتے ہیں ان میں جو اہم ہوتے ہیں انھیں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

لائبریری میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کی وہ نایاب جلدیں بھی ہیں جو ہندو پاک کی بہت کم لائبریریوں میں مل سکینگی چونکہ ان دونوں کی عمریں سو برس سے زائد ہو چکی ہیں اس لئے ان کی جلد بندی اتنے اہتمام سے کرائی گئی ہے کہ انھیں نئی زندگی مل گئی ہے ان میں سرسید کی ساری سرگرمیوں کے متعلق مستند معلومات ملتی ہیں۔ ان دونوں کو علی گڑھ تحریک کا نقیب کہنا چاہیئے۔ گزٹ اور تہذیب الاخلاق خود سرسید نے ۱۸۶۶ء اور ۱۸۷۰ء میں جاری کئے تھے ان کی یہ اہمیت بھی پیش نظر رہے کہ ان میں سرسید اور ان کے رفقائے خاص محسن الملک، وقارالملک اور مولوی چراغ علی وغیرہ کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، سماجی اور دیگر موضوعات پر جو اعلیٰ مضامین عام فہم اور سادہ زبان میں شائع ہوتے تھے ان سے نہ صرف اردو کے سرمایہ میں اضافے ہوئے بلکہ سادہ نگاری کا ذوق بھی پھیل گیا۔

شعبۂ مخطوطات لائبریری کا یہ شعبہ لائق دید ہے بالائی منزل کے خوبصورت اور ایرکنڈیشن کمروں میں نایاب اور بیش قیمت مخطوطات وغیرہ اسٹیل کی مضبوط اور مقفل الماریوں میں بڑے قرینے سے آراستہ ہیں۔ انہیں خاک، کیڑوں، نمی اور کتاب چوروں سے محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے انکی صفائی و ستھرائی کا بھی بڑا خیال رکھا جاتا ہے اور ہر وہ تدبیر کیجاتی ہے جس سے ان صدہا برس پرانی کتابوں کی آب و تاب قائم رہے اور انکی عمر دراز ہو جائے۔

اس شعبہ میں لٹن لائبریری کی خطی اور دیگر نادر کتابوں کے علاوہ مولوی سبحان اللہ خاں، مولوی عبدالسلام خاں، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، سرشاہ سلیمان احسن مارہروی، منیر عالم، کتب خانہ حبیب گنج، فرنگی محل (لکھنؤ) اور جواہر میوزیم (اٹاوہ) وغیرہ کے وہ بیش بہا لوادر بھی موجود ہیں جو اس لائبریری کو عطا کیے گئے ہیں۔

ان نادر کتابوں کے علاوہ یہاں نامور خطاطوں کی نہایت خوش خط اور دیدہ زیب وصلیاں بھی ہیں ان میں مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی نوشتہ وصلیوں کے ساتھ شاہ عباس صفوی کے درباری خطاط میر عماد الحسینی، اس کے مشہور شاگرد عبدالرشید دیلمی اور عہد مغلیہ کے کئی ممتاز خطاطوں کی نہایت نفیس نستعلیق میں لکھی ہوئی وصلیاں لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہیں علاوہ ازیں عہد آصف الدولہ (نواب اودھ) کے نامور خطاط حافظ محمد نوراللہ کی مشقیں اور وصلیاں بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ حافظ صاحب کی معمولی مشق بھی اتنی قیمتی سمجھی جاتی تھی کہ اس زمانہ میں ایک روپیہ فی مشق کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔

مکتوبات کے ذخیرہ میں علماء، مشاہیر، شاعروں اور ادیبوں کے خطوط بھی جمع ہیں جن سے گذرے ہوئے زمانہ کے حالات معلوم ہوجاتے ہیں ان میں سرسید کا مکتوب بنام شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی (مکتوبہ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء) بھی ہے جو انھوں نے مسدس حالی کے متعلق تحریر کیا تھا چونکہ سرسید ہی اسے لکھنے کے محرک تھے اسلئے مسدس کی تکمیل ہوجانے پر بڑے جوش کے ساتھ خط میں یہ بھی لکھا کہ "مسجدوں کے امام اس مسدس کو خطبوں میں پڑھیں اور قوال اور طوائفیں محفلوں میں گائیں" دراصل ان کی یہ خواہش تھی کہ ہر طبقہ کے مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ سرسید اسکو اپنے اعمال حسنہ کا ایک اہم جزو قرار دیتے ہوئے اپنے اس خط میں لکھتے ہیں۔

"بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو دنیا سے کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔"

مکتوبات کے علاوہ سکّوں اور تصویروں کا بھی بڑا قابل قدر ذخیرہ جمع ہے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام بادشاہوں کے سکّے ایک خوبصورت الماری میں نہایت قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ تصاویر کے ذخیرے میں شاہ طہماسپ، نادرشاہ، شاہجہاں اورنگ زیب (عالم شباب اور عالم ضعیفی میں) محمد شاہ، نورجہاں، نوابان اودھ شجاع الدولہ وغیرہ اور غازی الدین حیدر وغیرہ کے فوٹو ہیں ان تصاویر میں ایک نہایت بلند پایہ صوفی و عالم حضرت شاہ فخر الدین دہلوی کی تصویر دیکھکر اُن کے مرید بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت ؛ شغلِ دل وردِ زباں فخر الدین

شعبۂ مخطوطات کے ایک کمرہ میں شوکیسوں کے اندر حد درجہ مرصّع و مُطلّا و مُذہب قرآن کریم کے نسخے اور نہایت نادر مخطوطات سجادئے گئے ہیں اور انکی خصوصیات کے پرچے ہر نسخہ کے ساتھ منسلک کر دیئے ہیں تاکہ انھیں ملاحظہ کرتے وقت انکی اصل کیفیت بھی معلوم ہو جائے ان بیش قیمت نوادرات کے ساتھ دو چاول اس طرح رکھے ہوئے ہیں جیسے کسی بحرِ ذخّار میں دو موتی۔ ایک پر قل ہو اللّٰہ احد لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کی نہایت عمدہ تصویر بنی ہوئی ہے۔

اسی شعبہ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم و مغفور کے قیمتی ذخیرۂ کتب کے لئے ایک وسیع کمرہ مخصوص کر دیا گیا ہے جس کے دروازہ پر جلی حروف میں ''حبیب الرحمٰن خاں شروانی کلیکشن'' لکھا ہوا ہے نواب صاحب کتابوں کے بڑے شائق تھے۔ انھوں نے اپنا کتب خانہ جس شوق اور کاوش کے ساتھ اپنے وطن حبیب گنج میں قائم کیا تھا اس کا حال وہ اپنے مضمون ''کتب خانہ حبیب گنج کیسے قائم ہوا'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''یہ مختصر کتب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔
الحمد للّٰہ اس میں ایک بھی نسخہ سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا

نہیں ہے بلکہ ایسا ہوا ہے کہ کتاب فروخت کرنے والے نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی اور میں نے زیادہ دام دیدئے۔"

نواب صاحب کو اپنے کتب خانے سے ایسی گہری دلچسپی تھی کہ انھوں نے فہرست کتب میں کتابوں کی خصوصیات کو اچھوتے اور دلکش عنوانات کے تحت نمایاں کیا ہے مثلاً
"الذھبیات" کے تحت وہ کتابیں درج ہیں جو طلائی کام کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔
"الخطاطیات" کے تحت نامور خطاطوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے بہترین نسخے ہیں۔
"المجلدات" میں ان کتابوں کے نام ہیں جن کی جلدیں جلد سازی کے نہایت نفیس نمونے ہیں۔
"الفتوحات" میں وہ کتابیں ہیں جو سلاطین کو فتوحات کے موقع پر مال غنیمت میں دستیاب ہوئی تھیں۔

فہرستیں شعبۂ مخطوطات کے ذخیرۂ سبحان اللہ کی غیر تشریحی فہرستوں کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں پہلی جلد مخطوطات کی ہے جو مولوی کامل حسین نے مرتب کی اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی وہ اس ذخیرہ کے ساتھ گورکھپور سے آئے تھے اور کچھ عرصہ تک شعبۂ مخطوطات کے انچارج رہے تھے دوسری جلد مطبوعات کی مولوی ابرار حسین فاروقی کی مرتبہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ فاروقی صاحب ہی نے جواہر میوزیم کے ۲۱۸ فارسی مخطوطات کی تفصیلی فہرست "تذکرۂ جواہر زواہر" کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۵۹ء میں شائع کرائی تھی جس کا حوالہ پچھلے اوراق میں دیا جا چکا ہے شیفتہ کلیکشن (ذخیرہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ) کی ایک جامع فہرست مرتبہ مولوی ابوبکر محمد شیث (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی ایک فہرست ڈاکٹر مختار الدین احمد نے مرتب کی تھی جو "فہرست نمائش گاہ مخطوطات و نوادر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی اس کا دلچسپ دیباچہ "علی گڑھ کے ذخیرۂ مخطوطات کی سیر" کے نام سے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا تھا جو "تربیر" کے کتب خانہ نمبر میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان مطبوعہ فہرستوں کے علاوہ قلمی فہرستیں بھی ہیں۔ یہ تمام فہرستیں شعبۂ مخطوطات کے ذخائر کی آئینہ داری کر رہی ہیں۔

چند نوادر کا تعارف لائبریری کی خوبصورت، مصوّر، منقّش، مُطلّا اور قدیم کتابوں کے بیش بہا ذخائر میں سے چند مخصوص نوادر[1] پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ اس نایاب سرمایہ کی خصوصیت و ندرت اور کتابوں کا حسن و جمال مجمل طور پر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

آیئے سب سے پہلے قرآن کریم کی اُن دو سورتوں (سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقر) کی زیارت کیجئے جو اب سے کوئی تیرہ سو پچاس برس پہلے ہرن کی کھال پر خطِ کوفی میں لکھی گئی تھیں کہا جاتا ہے کہ انھیں حضرت امام حسینؓ نے تحریر فرمایا تھا۔

قرآن مجید کے یہ تین نسخے بھی دیکھئے جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں ان میں ایک مُطلّا و منقّش نسخہ عبد الباقی حدّاد کا لکھا ہوا ہے جو خطِ نسخ لکھنے میں ماہر تھا اور نگ زیب نے فنِ خطاطی حدادہی سے سیکھا تھا دوسرا نسخہ وہ ہے جو ہرات سے عالمگیر کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا گیا تھا سنِ ارسال ۱۰۶۹ھ (۱۶۷۹ء) اس پر درج ہے۔ تیسرا نسخہ اس لئے قابل دید ہے کہ یہ ہندوستان کے شہنشاہ عالمگیر کے قلم کا لکھا ہوا ہے اسے نہایت خوب صورت خطِ نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔

یہاں قرآن کریم کے بڑے دیدہ زیب مُطلّا اور مذہّب خطی نسخے ہیں جن کی تعداد ۹۰ ہے یہ مختلف اعتبار سے بڑی خصوصیات کے حامل ہیں مثلاً قرآن کے ایک نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سی ورقی ہے یعنی ہر پارہ ایک ورق پر ہے۔ پاروں کے اختلافِ حجم کے باوجود ہر پارہ کو اس خوبی سے لکھا گیا ہے کہ قرآن کی تحریر میں شروع سے آخر تک کہیں کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔ یہ نسخہ بھی بڑا خوبصورت ہے اس کی ابتدائی دو سورتوں کے عنوانات مُطلّا و منقّش ہیں جدول طلائی ہے یہ بھی اورنگ زیب کو تحفۃً پیش کیا گیا تھا۔

اب ایک ایسے قرآن مجید کی زیارت کریں کہ اس جیسا دنیا میں کہیں نہیں ہوگا ایک صدری پر تمام قرآن خفی خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے پوری صدری مُرصّع ہے یہ سرسید کے

---

[1] لائبریری کی خطی اور مطبوعہ کتابوں کا تعارف کرانے میں فہرست مرتبہ مختار الدین احمد اور مولانا عبد الشاہد خاں شروانی کے مضمون سے مدد لی گئی ہے۔

پوتے سر راس مسعود کے عہد وائس چانسلری کی مقدس یادگار ہے۔ ان کے دورہ انگلستان وغیرہ کے موقع پر ان کے دوست لارڈ لوتھین کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں انہیں یہ متبرک تحفہ ملا تھا قیاس کہتا ہے کہ کسی بادشاہ یا فوج کے کسی امیر کی یہ صدری ہوگی جسے جنگ کے مواقع پر پہنا جاتا ہوگا تاکہ اس کی برکت سے فتح حاصل ہو سکے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانہ میں انگریزی فوج کا کوئی افسر سے انگلستان لے گیا تھا

قرآن شریف کی ایک اور نادر شکل دیکھئے کاغذ کی پگڑی پر مکمل قرآن بخطِ غبار لکھا ہوا ہے کاغذ کے نیچے کپڑا لگا کر اسے محفوظ کر دیا گیا ہے یہ پگڑی ۱۸ فٹ تین انچ لمبی اور تین انچ چوڑی ہے۔

اس لائبریری میں بعض ایسے نادر اور بیش قیمت قلمی کتابیں ہیں جن کے علاوہ اور کوئی نسخے کہیں دریافت نہیں ہوئے مثلاً عربی کتابوں میں "نہج البلاغہ" کا ایک اتنا قدیم نسخہ یہاں ہے کہ اس سے قدیم تر شاید دنیا میں کہیں نہیں ہوگا اسکی کتابت اب سے ۹۵۸ سال پہلے یعنی ۵۳۸ھ میں علی بن ابی القاسم ابن علی نے کی تھی یہاں وہ نادر کتابیں بھی ایسی نادر ہیں کہ ان کے علاوہ دیگر نسخوں کا کوئی علم نہیں۔ یہ ہیں "تاویل المتشابہات فی الاخبار والآیات" مصنفہ عبدالقاہر البغدادی (متوفی ۴۲۹ھ۔ ۱۰۳۰ء) اور "جمہورۃ اشعار العرب" مرتبہ ابوالخطاب القریشی۔ عربی شاعری کے اس مشہور مجموعہ کی کتابت ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں ہوئی ہے۔

ان نوادر کے ساتھ فارسی کی ایک نادر کتاب "حال نامہ بایزید انصاری" مرتبہ علی محمد بن ابوبکر قندھاری بھی ملاحظہ کر لیں جو اپنے موضوع پر ایک اہم اور نادر کتاب ہے۔ بایزید انصاری عہد اکبری کی مشہور شخصیت تھے جنہیں لوگ پیر روشن بھی کہتے تھے اس کتاب کو روشنیہ تحریک کی بہترین کتاب کہا جاتا ہے۔

یہاں کے مرصع اور منقش نسخوں میں "کریما" اور "ہفت بند کاشی"، بقول رشید احمد صدیقی "بس دیکھنے اور دیکھتے ہی رہنے کی چیز ہے" شیخ سعدی کی کریما (مکتوبہ ۱۲۷۷ھ۔ ۱۸۶۰ء) کا یہ زرافشاں نسخہ نہایت خوبصورت نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔

ہفت بند کاشی کا یہ نسخہ مرصع اور مطلّا ہے اس کی سنہری زمین نے اس کا حس
اور بڑھا دیا ہے اسے محمد حسن کاشمیری نے نہایت خوشخط لکھا ہے۔ ہفت بند کاشی
ایک اور خوبصورت نسخہ بڑا مرصع اور خوشخط ہے اس کی زمین بھی سنہری ہے۔ بمکتب
عطار درقم مرصعہ محمد علی ۱۲۸۰ھ - ۱۸۶۳ء۔

مصوّر نسخوں میں سے یہ چار خوبصورت نسخے دیکھیئے ان میں "خمسہ نظامی" (از نظ
گنجوی) ۴۲۵ برس پرانا ہے یہ متعدد حسین مرقعوں سے مزیّن ہے اس کی کتابت مصنف
کی وفات سے چھیاسٹھ برس بعد ۸۷۳ھ (۱۴۶۸ء) میں حسین عبداللہ نے کی تھی
(۲) دیوان حافظ (یعنی دیوان خواجہ شمس الدین حافظ) میں تین عمدہ مرقع ہیں۔ بڑے نفیس
نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اس نسخہ کی کتابت اب سے ۳۷۴ سال پہلے یعنی ۹۷۱ھ میں عبدالرحم
الکاتب نے کی تھی (۳) مثنوی مولوی معنوی (از مولانا جلال الدین رومیؒ) متع
تصاویر سے آراستہ ہے اب سے ۳۷۸ برس پہلے یعنی ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں اسے عبداللہ
قنبر سمرقندی نے لکھا تھا اس پر میر نور اللہ کے حواشی بھی ہیں (۴) مثنوی حسینی کا نس
نہایت قیمتی ہے پورا نسخہ مصور ہے اس میں ۲۹ تصاویر ہیں۔ سن تالیف ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء

ان کے علاوہ یہاں اور بہت سی کتابیں بڑی اہم خصوصیات کی حامل ہیں مثلاً صا
کے دیوان کا ۳۱۴ سال پرانا نسخہ (مکتوبہ ۱۰۸۳ھ) اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ و
خود صائب کا لکھا ہوا ہے۔

لائبریری کے اہم نوادر میں صحاح جوہری (ابو نصر اسمٰعیل بن حماد الجوہری" متو
۳۹۶ھ) کی مشہور لغت کا ۷۴۹ سال پرانا نسخہ (مکتوبہ ۶۴۸ھ) خاص طور پہ دیکھنے
کی چیز ہے کیونکہ یہ شیر خرما کی روشنائی سے لکھا گیا ہے قرون وسطی کے مسلمانوں نے روشن
تیار کرنے میں جس جدت، ذہانت اور تنوع سے کام لیا تھا اس کا بڑا عمدہ نمونہ یہ نسخہ ہے
اس پر محمود بن احمد بن مسعود القونوی (متوفی ۷۷۱ھ) کی ایک تحریر بھی ہے جسے اہم کہا گیا ہے

اس شعبہ کے ذخائر میں ایسی بھی نایاب کتابیں ہیں جن پر سلاطین، امراء اور مشا
کی تحریریں، دستخط یا مہریں ہیں ان میں "تاریخ گزیدہ" مصنفہ خواجہ حمد اللہ مستوفی قزو

رسالہ تصنیف ۱۰۳۰ھ) بھی ہے یہ نادر کتاب سرسید کے کتب خانہ میں رہ چکی ہے اس کے پہلے صفحہ پر عہد اکبری کے ملک الشعراء ابوالفضل فیضی کی تحریر اور مہر موجود ہے یہاں ایک ترکی دیوان کا سرورق بھی دیکھنے کے لائق ہے جس پر جہانگیر اور مختلف اُمرا کی تحریریں اور مُہریں ہیں جہانگیر کی یہ تحریر پچھلے اوراق میں آگئی ہے اس کے شروع میں اللہ اکبر ہے اور آخر میں شہنشاہ کا نام اسطرح لکھا ہوا ہے

" نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ ۱۰۱۴ھ " (۱۶۰۵ء)

چند نایاب مطبوعات یہاں اردو، فارسی اور عربی کی قدیم اور جدید مطبوعات کا بڑا نایاب ذخیرہ موجود ہے۔ قدیم ادبار اور شعرا کی تصانیف اور دواوین کے ایسے مختلف ایڈیشن بھی ہیں جن سے ریسیرچ اسکالرس کو اپنا مقالہ تیار کرنے میں بڑی مدد مل جاتی ہے یہاں کی قدیم ترین کتابوں میں ایک کی عمر تقریباً ۴۳۸ برس کی ہو چکی ہے یہ قانون شیخ الرئیس (بوعلی سینا) کا وہ نسخہ ہے جو ۱۵۹۳ء میں بمقام روم شائع ہوا تھا اور سید محمود کے کتب خانہ میں رہا تھا اس کے علاوہ اور بھی کئی سو برس پرانی قابل قدر مطبوعات ہیں ان کی قدامت کی ایک جھلک دکھانے کیلئے ذیل کی سطور میں کچھ کتابیں سن وار پیش کر دی گئی ہیں ۔

تاریخ مشرق HISTORIA ORIENTALIS مطبوعہ ۔ ۱۶۶۰ء

بائبل عربی ولاطینی (مطبوعہ روم) ۱۶۷۱ء

توزکات تیمور مترجمہ ابوطالب حسینی (مطبوعہ آکسفورڈ) ۱۷۰۳ء

تاریخ ابوالفدار ۔ ۱۷۲۳ء

ذکر النقود (مصنفہ مقریزی) ۱۷۴۶ء

الف لیلۃ ولیلۃ (لندن) ۱۷۹۸ء

اخلاق ہندی (مفتی تاج الدین) کلکتہ ۱۸۰۲ء

ہدایہ (مترجمہ غلام یحییٰ خاں) چار جلد ۔ ۲

ہندوستانی پریس کلکتہ ۔ ۱۸۰۷ء

آرائش محفل (شیر علی افسوس) کلکتہ ۔ ۱۸۰۸ء

شاہنامہ فردوسی (ہندوستانی پریس کلکتہ) ۱۸۱۱ء

بارہ ماسہ ۔ (کاظم علی) کلکتہ ۔ ۱۸۱۲ء

خرد افروز (مترجمہ حفیظ الدین (روبک ایڈیشن) کلکتہ ۔ ۱۸۱۵ء

منتخبات ہندی (از جان شیکسپیر) لندن ۱۸۲۵ء

انتخاب اخوان الصفا ۔ لندن ۔ ۱۸۲۹ء

سیر المتاخرین (غلام حسین طباطبائی) کلکتہ ۱۸۳۰ء

دیوان زخمی (رتن سنگھ زخمی) کلکتہ ۔ ۱۸۳۷ء

جامِ جم (سرسید احمد خاں) آگرہ۔	۱۸۴۰ء	ابجد العلوم (نواب صدیق حسن خاں) تین جلدیں۔ صدیقی پریس بھوپال	۱۸۷۸ء
دیوانِ رشک۔	۱۸۴۶ء		
انشائے مادھورام۔ لکھنؤ۔	۱۸۴۷ء	بزمِ سخن (علی حسن خاں) مفید عام پریس، آگرہ۔	۱۸۸۰ء
دیوان وقار (جوالا پرشاد)	۱۸۵۱ء		
مہر نیمروز (مرزا غالب) فخر المطابع دہلی۔	۱۸۵۴ء	تذکرۂ آثار الشعراء (ممتاز علی) شاہجہانی پریس بھوپال	۱۸۸۶ء
تضمین گلستان سعدی (ہرگوپال تفتہ) لکھنؤ	۱۸۵۷ء	منشور سخن (میر اعظم علی ربط) سکندری پریس، آگرہ	۱۸۸۸ء
مثنوی ابر گوہر بار (اکمل المطابع دہلی)	۱۸۶۳ء	صدق البیان (شاہ جہاں بیگم) آگرہ۔	۱۸۹۳ء
تزکِ جہانگیری (مترجمہ سید احمد علی) کانپور۔	۱۸۷۱ء	حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) کانپور۔	۱۹۰۱ء

لائبریری اور سرسید اس لائبریری کی خصوصیات میں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سرسید کی تمام تصانیف و تالیفات موجود ہیں نیز ان کے وہ متعدد ایڈیشن بھی ہیں جو مختلف سنین میں شائع ہوئے ہیں مثلاً ان کی تصنیف آثار الصنادید کے کئی ایسے ایڈیشن یہاں ہیں جو کسی اور لائبریری میں نہیں ملینگے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا پھر سرسید نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کی رنگین اور مقفیٰ عبارت کو سادہ اور سلیس زبان میں منتقل کر کے اسے ۱۸۵۶ء میں شائع کرا دیا مگر یہ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضائع ہو گیا۔ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کو منشی نولکشور نے لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۵ء میں شائع کرایا اور دوسرے ایڈیشن کو منشی رحمت اللہ نے کانپور سے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا آثار الصنادید کا ایک ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں دہلی سے اور ۱۹۶۶ء میں کراچی سے شائع ہوا ہے اور بڑی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس تاریخی و تحقیقی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا ترجمہ فرانس کے مشہور مستشرق گارسن دتاسی نے فرانسیسی زبان میں کیا اس ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو فیلو شپ کا خطاب عطا کیا تھا۔

سرسید کے اس تاریخی و علمی شاہکار کے ساتھ یہ ملحوظِ خاطر رکھئے کہ ان کی زندگی

کے متعدد خصوصی پہلو کتابوں کی شکل میں اس لائبریری کے اندر دیکھے جا سکتے ہیں ان کی سیاسی بصیرت اور جراءت وہمت کا ایک بے نظیر نمونہ "رسالہ اسباب بغاوت ہند" (مطبوعہ ۱۸۵۸ء) یہاں ہے جس میں انھوں نے حکومت سے مسلمانوں کی ناراضگی کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہراتے ہوئے اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو نہایت صفائی وبیباکی کے ساتھ واضح کر دیا ہے غور فرمایئے کہ اس زمانہ میں حکومت پر تنقید کرنا کتنے بڑے دل گردے کا کام تھا، خیال رہے کہ اس کتاب کے بھی کئی مختلف ایڈیشن یہاں موجود ہیں

لائبریری میں اسلامیات اور عربی کی کتابیں پڑھنے کے دوران سرسید کے وہ نظریات ذہن پر ابھر آتے ہیں جو ان کی تعلیمی پالیسی کے بنیادی ستون کہے جا سکتے ہیں۔ دراصل سرسید مسلمانوں کی ذہنی سطح بلند کرنے کے لئے انھیں مغربی علوم وفنون سے آراستہ کرنا نہایت ضروری سمجھتے تھے اس کے باوجود تعلیمی نصاب میں مذہبی تعلیم کی شمولیت اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر بھی بڑا زور دیتے تھے چنانچہ انہوں نے امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مسلمانوں کو یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت وبلاغت میں سیمیٹک زبانوں میں لاثانی ہے" اور لکھنؤ میں تقریر کے دوران یہ فرمایا تھا "اے دوستو! مجھکو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے میری خواہش قوم کو قوم بنانے کی ہے۔"

سرسید نے ۱۸۷۲ء میں بمقام لاہور اپنی تقریر میں یہ صاف طور پر کہدیا تھا کہ "مسلمانوں کی تعلیم کا حال اور قوموں کی تعلیم سے جو ہندوستان میں آباد ہیں بالکل مختلف ہے ان کا مذہب ان کی مذہبی تعلیم، عام تعلیم میں ایسی ملی ہوئی ہے جیسے جسم وجان، جب اس کو علیحدہ کیا جائیگا تو جسم بے جان رہجائیگا اور کبھی اس قسم کی بے جان تعلیم سے ہماری اغراض پوری نہ ہونگی"

جب لائبریری میں سرسید کی خطبات احمدیہ پر نظر پڑتی ہے تو ان کی شخصیت کا وہ پہلو بھی سامنے آجاتا ہے جو حمایت اسلام اور حبِّ رسول ﷺ کے جذبات سے لبریز تھا چنانچہ سر ولیم میور

---

[1] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "سرسید اور عشق رسول" اردو کالج کراچی کے برگ گل کا سرسید نمبر، نقش ثانی، ص ۲۰۴ تا ۲۱۰

کی کتاب "لائف آف محمد" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ناروا اور متعصبانہ حملے دیکھ کر انھیں سخت ملال ہوا جسکا اظہار انھوں نے اپنے اس خط (مکتوبہ ۲۰ راگست ۱۸۶۹ء) میں کیا تھا جو لندن سے نواب محسن الملک کو بھیجا تھا اسمیں وہ لکھتے ہیں

"ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔

مارا ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است"

یہ اس شخص کی تحریر ہے جس کے خلاف خود اس کی قوم کے بعض علماء و فضلاء صف آرا ہو گئے تھے مگر مخالفت کے اس طوفان میں بھی وہ بڑے عزم واستقلال کے ساتھ سرگرم عمل رہے اور مخالفتوں کی اس گرما گرمی میں ان کا اخلاق اور پختہ ہو گیا چنانچہ ایک بار انھوں نے یہ فرمایا تھا۔

"میں یقین دلاتا ہوں کہ جوں جوں مجھ پر تہمتیں لگائی گئیں، گالیاں دی گئیں مکہ سے کفر کے فتوے منگائے گئے، میری محبت اپنے مخالفوں کی طرف بڑھتی گئی۔"

بالآخر سرسید کے حسن اخلاق اور ان کی بے لوث خدمات نے مخالفین کا جوش ٹھنڈا کر دیا اور ان کے ایک زبردست مخالف اکبر الہ آبادی سے یہ اعتراف کروا دیا ؎

ناسزا سنتا رہا اور مرحبا کہتا رہا ٭ کفر کے فتووں میں کام اسلام کا کرتا رہا۔

اس لائبریری کے متعلق یہ خاص بات بھی کہدینا ہے کہ سرسید کی برسی کے دن ان

کی تمام تصانیف، تالیفات اور ان کے دستِ خاص کی تحریروں یعنی مکتوبات وغیرہ کی نمائش یہاں بڑے اہتمام سے کیجاتی ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبار، طالبات اور دیگر اربابِ ذوق اپنے محبوب رہنما کی یادگاریں دیکھنے کے لئے جوق در جوق لائبریری آتے رہتے ہیں اس دن ہر طرف سرسید ہی کا ذکرِ خیر ہوتا رہتا ہے وہ دن یونیورسٹی میں "سرسید ڈے" کہلاتا ہے

اس قیمتی سرمایہ کے ساتھ سرسید کا عصا اور ان کا ڈیکس بھی ہوتا ہے جو وہ لکھنے پڑھنے کے وقت استعمال کیا کرتے تھے اور ان دونوں کے قریب سرسید کی ایک بہت بڑی اور جاندار تصویر بھی رکھدی جاتی ہے ان سب کو دیکھ کر واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ سرسید لائبریری میں تشریف فرما ہیں۔

استفادہ کی سہولتیں بنیادی طور پر یہ لائبریری یونیورسٹی کے اساتذہ طلبار اور طالبات کے لئے ہے مگر یونیورسٹی کے دیگر ملازمین بھی یہاں سے کتابیں حاصل کرسکتے ہیں ان کے علاوہ تمام اربابِ علم اور شائقین کتب بھی اسپیشل ممبر کی حیثیت سے کتابیں اجسرا کرا سکتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس استفادہ کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

لائبریری سے میرے ریٹائرمنٹ یعنی ۱۹۷۴ء تک یہ صورت تھی کہ طلبار اور طالبات کو بوقت داخلہ دس روپیہ فی کس بطور ضمانت ادا کرنے ہوتے تھے جو یونیورسٹی سے قطع تعلق کرتے وقت واپس کر دیے جاتے تھے۔ اسپیشل ممبر کیلئے ضمانت کی رقم پچیس روپیہ مقرر تھی جو وہ ممبرشپ سے دست بردار ہونے کے بعد واپس لے سکتے تھے ان سہولتوں کے اثر سے اجرائے کتب کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا اور لائبریری ریکارڈس کے مطابق کتابوں وغیرہ کے سالانہ اجرار کی تعداد ۳۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

دارالمطالعے لائبریری میں مطالعہ کتب اور علمی تحقیق و جستجو کے لئے نہایت معقول انتظام ہے۔ دارالمطالعوں کے علاوہ بیس کیبن ہیں۔ ہر کیبن ایک ریسرچ اسکالر کے لئے ہے جہاں وہ تنہائی میں سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے علمی کاموں میں مشغول رہتا ہے۔

دو دارالمطالعوں میں سے ایک میں ہر قسم کی سینکڑوں حوالجاتی کتابیں مہیا کردی

گئی ہیں جن کے استعمال پر کوئی خاص پابندی عائد نہیں ہے ہر ضرورت مند اپنے مطلب کی کتاب خود نکال سکتا ہے دوسرے دارالمطالعہ میں یونیورسٹی نصاب سے متعلقہ کتابیں گزشتہ امتحانات کے پرچے اور کچھ مخصوص اخبارات و رسائل موجود رہتے ہیں۔

یہ دونوں دارالمطالعہ اتوار اور دیگر تعطیلات میں بھی پانچ یا چھ گھنٹے کیلئے کھلتے ہیں ان کے علاوہ روزانہ صبح سے رات کو ۸ بجے تک کھلے رہتے ہیں امتحانات کے سلسلہ میں یہ اوقات اور بڑھا دئے جاتے ہیں پورے سال میں صرف چند خاص ایام میں بند رہتے ہیں مسلم اور ہندو تیوہاروں پر عملہ کے ہندو اور مسلم افراد کام کرتے ہیں۔

دونوں دارالمطالعوں میں پانچ سو سے کچھ زائد قارئین بہ یک وقت کتب بینی کر سکتے ہیں ان کے لئے آرام و سکون کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ بیت کی بنی ہوئی آرام دہ کرسیاں اور نفیس میزیں مہیا کی گئی ہیں اس پُر سکون ماحول میں روزانہ کئی ہزار طالبانِ علم کتابوں سے استفادہ کر لیتے ہیں۔

اِجرائی شعبہ لائبریری کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ اس کے نظم و نسق کو چلانے اور کتابوں کے استعمال میں سہولت پیدا کی جا سکے ان شعبوں میں شعبۂ اجراء اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ کتابوں وغیرہ کا اجراء اور ان کی واپسی یہیں ہوتی ہے۔ یہاں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ضرورتمندوں کو انکی مطلوبہ کتابیں حاصل کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہو وقت پر کتابیں مل جائیں اور جو نہ ہوں ان کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کب مل سکینگی؟ ان دونوں سوالوں کا جواب دینے کے لئے ڈمی استعمال کی جاتی ہے جو کتاب کے اجراء کے بعد اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھئے کہ جن لائبریریوں میں ڈمی استعمال ہوتی ہے وہاں ہر کتاب کے دو کتابی کارڈ بنائے جاتے ہیں۔ کتاب اِشو کرتے وقت ان دونوں کارڈوں پر مستعیر نمبر اور تاریخ اجراء یا واپسی درج کر کے ایک کو اِشو ٹرے میں اور دوسرے کو لکڑی کی ایک مخصوص تختی میں پیوست کر دیا جاتا ہے اور وہ تختی الماری میں کتاب کی جگہ رکھدی جاتی ہے کتاب کی واپسی پر یہ کتابی کارڈ ڈمی اور اشو ٹرے سے نکال کر کتاب کی پاکٹ میں رکھدیا

جاتا ہے اگر اس ڈمی کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو یہ متذکرہ بالا سوالوں کا فوراً جواب دے دیتی ہے۔

ڈمی کی یہ تشریح ضمنی طور پر کر دی گئی ہے اصل میں کہنا یہ ہے کہ یہاں اجرائے کتب کے لئے دو طریقے جاری ہیں یونیورسٹی اسٹاف کے لئے رجسٹر کا لیجر سسٹم استعمال کیا جاتا ہے اور طلبا و طالبات کو "براؤن چارجنگ سسٹم" کے مطابق مستعیر کارڈ جاری کئے جاتے ہیں چونکہ یہ کارڈ پاکٹ کی شکل کے ہوتے ہیں اس لئے یہ پاکٹ چارجنگ سسٹم[1] بھی کہلاتا ہے اس کے تحت ہر مستعیر کو مستعیر کارڈ اتنی تعداد میں دیئے جاتے ہیں جتنی کتابیں اجرا کرانے کا وہ مستحق ہوتا ہے۔

کتابوں کے یومیہ اجرا کا اوسط ڈھائی سو سے تین سو تک ہے اب اس تعداد میں اور اضافہ ہو گیا ہوگا۔ اجرائے کتب کے اعداد و شمار موضوعی نمبر کے لحاظ سے تاریخ وار ایک رجسٹر میں درج کئے جاتے ہیں جس سے بہ آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں موضوع کی کتنی کتابیں فلاں تاریخ کو اجرا ہوئیں اس ریکارڈ سے ماہانہ اور سالانہ اجراء کی تعداد معلوم کی جا سکتی ہے یہ ایک ایسا اجرائی روزنامچہ[2] ہے جس سے یونیورسٹی اسٹاف اور طلباً وغیرہ کے مذاقِ مطالعہ کا ایک اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس شعبہ میں مختلف زبانوں کی کتابوں کے کیٹلاگ رکھے ہوئے ہیں جن کو لائبریری سائنس کے سائنٹفک اصولوں کے مطابق کارڈوں پر مرتب کیا گیا ہے ان میں کتابیں مصنف۔ موضوع اور ٹائٹل وغیرہ کے لحاظ سے تلاش کی جا سکتی ہیں مگر طالبانِ کتب کو کیٹلاگ کا نام اور اس کے استعمال کی ترکیب دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر کیٹلاگ پر اس کا نام لکھا ہوا ہے اور ترکیبِ استعمال کا پرچہ بھی اس کے ساتھ رکھا رہتا ہے اس لئے ہر کیٹلاگ خود ہی بتا دیتا ہے کہ میں فلاں کیٹلاگ ہوں۔

یہ ہی کیٹلاگ طالبانِ کتب کو ان کی مطلوبہ کتابوں کے نمبر بتا دیتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں کتابیں فلاں اسٹیکس میں رکھی ہیں۔ مگر وہاں اساتذہ کے علاوہ

(۱-۲) انکی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "کیٹلاگ سازی"

کوئی اور شخص بلا اجازت داخل نہیں ہوسکتا چنانچہ طلباء اور طالبات وغیرہ اپنی اپنی کتابوں کے نمبر سرچیوں پر لکھ کر اسٹیکس میں بھجوا دیتے ہیں اور وہاں کے کارکن ہزاروں کتابوں کے ذخیروں میں سے یہ کتابیں اس طرح نکال لاتے ہیں جیسے غوّاص بحرِ ذخّار میں غوطہ زن ہوکر صدف و گوہر نکال لیتے ہیں۔

اسٹیکس — اسٹیکس (کتابیں رکھنے کے کمرے) کی آٹھ منزلہ عمارت میں جانے کے لئے سیڑھیوں کے علاوہ لفٹ بھی ہے جو دم بھر میں بالائی اسٹیکس پر پہنچا دیتی ہے ان اسٹیکس میں مختلف علوم و فنون کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ایک میں مختلف ممالک کے آرٹ۔ نقاشی، مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ کی نہایت قیمتی مطبوعہ کتابیں محفوظ ہیں اور ایک اسٹیکس نصابی کتابوں کے لئے ہے نصاب کی گراں قدر کتابیں جو عام طلباء کی دسترس سے باہر رہتی ہیں وہ انھیں یہاں دستیاب ہوجاتی ہیں نصاب کی ہر ایک کتاب کے متعدد نسخے فراہم کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یا دو نسخے لائبریری میں مطالعہ کے لئے دارالمطالعہ میں رہتے ہیں اور دیگر نسخے اجراء کیلئے اس اسٹیکس میں رکھدئے جاتے ہیں

یہ تمام ذخائر اسٹیل کی الماریوں میں فن وار آراستہ ہیں ان الماریوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے لچک دار خانے کتابوں کے سائز کے مطابق کم و بیش کئے جاسکتے ہیں ہر الماری پر موضوع کا نام اور موضوعی نمبر لکھا ہوا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ فلاں فن کی کتابیں فلاں الماری میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ موضوعی نمبر ڈیوی کی اعشاریائی درجہ بندی کے مطابق مقرر کئے گئے ہیں۔ مغربی علوم (انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور روسی وغیرہ) کی کتابوں کے موضوعی نمبروں کے ساتھ "مصنف نمبر" ڈکنسن آتھر س[۱] نمبرس کے ہیں۔ آسا۔ ڈان ڈکنسن[۲] کے وضع کئے ہوئے یہ نمبر لاہور سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہونے کے بعد یہاں رائج ہوئے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان مصنفی نمبروں نے مولانا آزاد لائبریری اور لاہور کے درمیان ایک مستقل رشتہ قائم کر دیا ہے۔

اسٹیکس میں روزانہ ہزاروں کتابوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ اجراء کی ہوئی کتابیں

(۱-۲) تفصیلات زیرِ نظر کتاب کے گزشتہ اوراق میں عنوان "لاہور" کے تحت دیکھئے۔

سینکڑوں کی تعداد میں ہر روز واپس آتی ہیں اور سینکڑوں روزانہ اجراء ہو کر باہر چلی جاتی ہیں لیکن جتنی اجراء کی جاتی ہیں اس سے کہیں زیادہ الماریوں سے نکالی جاتی ہیں۔
چونکہ اسٹیکس میں طلباء و طالبات کا داخلہ ممنوع ہے اس لئے ہر ایک ضرورتمند بیک وقت کئی کئی کتابیں طلب کرتا ہے اور ان میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کر کے بقیہ واپس کر دیتا ہے پھر آئے دن کتابوں کے جو اضافے ہوتے رہتے ہیں ان کو بھی الماریوں میں آراستہ کرنا ہوتا ہے اس طرح روزانہ سینکڑوں کتابیں الماریوں سے نکالی اور رکھی جاتی ہیں اور داد و ستد کا یہ سلسلہ صبح سے شام تک جاری رہتا ہے۔

جہاں تک اضافے کا تعلق ہے سال میں ہزاروں کتابوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۶۰ء میں ۱۵۰۰۰ کتابوں کا اضافہ ہوا تھا تو اس کے بعد یہ تعداد بڑھتی چلی گئی اضافہ شدہ کتابیں درجہ بندی، کیٹلاگ سازی اور دیگر مراحل سے گزر کر اسٹیکس میں داخل ہو جاتی ہیں یہ اسٹیکس ہمہ وقت کتابوں کے منتظر رہتے ہیں ان میں تقریباً دس لاکھ کتابوں کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے اتنی کثیر کتابیں جمع ہو جانے کے بعد یہ لائبریری اپنی افادیت کے لحاظ سے بامِ عروج پر پہونچ جائے گی۔

لائبریری سائنس کی تعلیم اس لائبریری کے زیرِ سایہ لائبریری سائنس کے دو کورس (سرٹیفکٹ اور ڈگری) جاری ہیں سرٹیفکٹ کورس کی ابتداء ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی یہ پاک و ہند میں وہ اولین کورس ہے جو یونیورسٹی کی طرف سے جاری ہوا ہے اس کی مدت تعلیم چار ماہ ہے اور ایک سال میں اس کے دو سیشن ہوتے ہیں داخلہ کے لئے انٹرمیڈیٹ پاس ہونے کی شرط ہے لیکن وہ ہائی اسکول پاس شدہ بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ جنھوں نے کم از کم دو سال تک کسی لائبریری میں کام کیا ہو ڈگری کورس کی ابتداء ۱۹۵۸ء میں ہوئی اس کی مدت نو ماہ ہے اور داخلہ کیلئے گریجویٹ ہونے کی شرط ہے یہ دونوں کورس ملک بھر میں اتنے مشہور و مقبول ہیں کہ ہر سال سینکڑوں درخواستیں داخلے کیلئے آجاتی ہیں۔
کعبۂ عشاق آخر میں وہ بات کہدینا بے جا نہ ہوگا جو ہند و مشاہیر میں سے کسی[1] نے

[1] نام یاد نہیں رہا۔ مگر ان کے الفاظ میرے پاس محفوظ رہ گئے۔

ایک تعلیمی جلسہ میں کہی تھی کہ ایسے ادارے ملک میں ہوں جو انفرادی طور پر کسی ایک تہذیب کا مرکز ہوں تاکہ اس طرح ملک کی ہر تہذیب کو پھولنے پھلنے اور اپنے مخصوص جوہر کو پروان چڑھانے کا موقعہ ملے۔

ایسے ادارے کا ایک بہترین نمونہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جس کی لائبریری سو برس سے اُس مخصوص تہذیب و ثقافت کے جواہر پاروں کی امین ہے جو اسلامی تعلیمات کا حیات افزا ثمر ہیں اسی کے سایہ میں علم کی ترقی ہوئی ہے اور کتب خانوں نے فروغ پایا ہے۔ بقول ڈاکٹر سر پی۔ سی۔ رائے "ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی پیچ در پیچ لچھی میں رنگ برنگ کے جو بہت سے دھاگے نظر آتے ہیں وہ ذہانت اسلامی ہی کا نتیجہ ہیں"

مگر اس لائبریری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کے تہذیبی ورثہ کی محافظ نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف علوم و فنون کا ایسا بیش بہا اور پُر از معلومات سرمایہ جمع ہے جس کی بناء پر اس لائبریری کو عُشاقانِ کتب کا کعبہ کہدینا زیب دیتا ہے۔ عہد قدیم میں لائبریریوں کے دروازوں پر "ڈسپنسری آف دی سول" (روحانی شفا خانہ) لکھدیا کرتے تھے لیکن پاک و ہند کے روحانی شفاخانوں (کتب خانوں) کی دلآویزی بڑھانے کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ ان کی پیشانیوں پر مندرجہ ذیل شعر ثبت کردیا جائے جو ان کے مقاصد کو بھی اور روشن کردیگا ۔

کعبۂ عُشّاق باشد ایں مقام ؎ ہر کہ ناقص آمد ایں جا شد تمام

زبیر صاحب
کتابوں کے آئینے میں

اس کتاب میں الحاج محمد زبیر صاحب کی تمام کتابوں کی کیفیت ان کے بارے میں اصحاب علم وفضل کے تاثرات، اخبارات کے تبصرے جمع کردیئے گئے ہیں ان کے ساتھ چند اکابر و مشاہیر کے مکتوبات بھی ہیں جو انہوں نے مصنف کے نام لکھے ہیں یہ سب تحریریں ہیں بتاتی ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا حفظ الرحمٰن، نواب چھتاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور دیگر ذی علم حضرات نے ان کتابوں کو نہ صرف پسند کیا بلکہ فاضل مصنف کی قلمی کاوشوں کی داد بھی دی ہے۔ لائق ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس میں ہر کتاب کے ساتھ اس کے متن اور دیباچہ وغیرہ کے کچھ اقتباسات بھی ہیں جن کے مطالعہ سے مندرجات اور انداز بیان پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں ایچ ایم سعید کمپنی کراچی نے شائع کی تھی اس کو حاصل کرنے کیلئے اس پتہ پر دس پیسے کے ٹکٹ بھیجئے۔

خالد ـ فرحت منزل اے ۴۵ / ۷، بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد کراچی

ناشر

ایچ ایم سعید کمپنی۔ ادب منزل،

پاکستان چوک۔ کراچی۔

اعمالِ قرآنی

اشرف المواعظ

اصلاح الرسوم